ہندستانی اکیڈمی کا تماہی رسالہ

سنہ ۱۹۳۴ع

ہندستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ، الہ آباد

سالانہ چندہ پانچ روپیہ

۹۸۵۶۶

۵۵ف

ہندستانی سنہ ۱۹۳۴ء

ایڈیٹر : اصغر حسین ، اصغر

مجلس مدیران

۱—ڈاکٹر تارا چند ، ایم - اے ، ڈی - فل - (صدر) -

۲—پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ایم - اے ، پی - ایچ - ڈی ، صدر شعبۂ عربی و فارسی ، الہ آباد یونیورسٹی -

۳—مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب ، ایم - اے ، - صدر شعبۂ فارسی و اُردو ، لکھنؤ یونیورسٹی -

۴—منشی دیا نراین نگم بی - اے ، -

۵—مولوی اصغر حسین ، اصغر (سکریٹری) -

۸۹۱۶ ۳۰-۶
بندستانی

فہرست مضامین

صفحہ

صفحه

هندستانی

هندستانی اکیڈیمي کا تماهي رساله

جلد ۴ } جنوري سنه ۱۹۳۴ع { حصه ۱

نظریۂ اضافیت[1]

(از پروفیسر منهاج الدین ایم اے)

واقعات اور قوانین قدرت

علمی تحقیقات کے دو مقصد هیں ' جو بادی النظر میں ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے هیں ایک طرف تو محقّقین کا یه مقصد هوتا هے که نئي نئي ایجادات کریں اور لاتعداد حقائق قدرت کي تلاش میں مصروف رهیں اور دوسري طرف یه کوشش هوتی هے که قدرت کے تمام حقائق کو کم سے کم قوانین یا کلّیات کے ماتحت لے آئیں -

یه قوانین مختلف مظاهر قدرت کی توجیه کے لئے وضع کئے جاتے هیں - ان میں سے بهترین قانون وه هوگا ' جو زیاده سے زیاده

---

1. Theory of Relativity.

مظاہر پر حاوي ہو اور آسانی سے اُن کی توجیہہ کر سکے - لیکن کوئی قانون یا نظام جو مظاہر کی توجیہہ کے لئے تجویز کیا جاتا ہے ' اٹل نہیں ہوتا ' بلکہ اگر کوئی ایسی بات دریافت ہو جائے ' جس کي توجیہہ اُس قانون یا نظام سے نہ ہو سکے ' تو ہمیں قانون کو خیرباد کہنا پڑتا ہے ' اور اُس کي بجائے اور کلّیہ تجویز کرنا پڑتا ہے جو واقعات کے زیادہ مطابق ہو -

اب سوال یہ ہے کہ آیا آئین‌ستائین کا نظریۂ اضافیت اور سب طبیعي قوانین کے مقابلہ میں واقعات عالم کی زیادہ واضح تصویر پیش کرتا ہے ؟ اگر نظریۂ اضافیت دیگر نظریات طبیعي سے سے زیادہ ہمہ‌گیر ہو تو یہ واقعی ہمارے علم میں قابل قدر اضافہ ہے - لیکن اگر یہ دقیق قانون حقائق کي توجیہہ سے قاصر رہے تو اسے محض تخّیل کي پرواز قرار دینا پڑے گا -

اصول اضافیت پر بحث کرنے سے پہلے میں مختصر طور پر بیان کروں گا ' کہ کائنات کے متعلق شروع شروع میں کیا کیا قیاس قائم ہوئے ' اور پھر اُن میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں ' تا کہ اس امر کا صحیح تصور قائم ہو سکے کہ نظریۂ اضافیت نے معمۂ کائنات کو کیسے حل کیا ہے -

نظام بطلیموس

فیثاغورس[1] سب سے پہلا فلسفي تھا ' جس نے تعلیم دي کہ زمین ایک کُرہ ہے ' جو فضا میں معلق ہے - یہ مسئلہ عام لوگوں کي سمجھہ میں نہ آتا تھا - وہ کہتے تھے کہ کرۂ ارض سہارے کے بغیر کس طرح قائم ہے - نیز اُنھیں

---

1. Pythagoras.

یہ اعتراض تھا کہ اگر زمین واقعی گول ہے تو نیچے کی طرف کے آدمی گر کیوں نہیں جاتے ؟ گویا گول زمین کا تصوّر اُس زمانے کے لوگوں کی عقل عام کے خلاف تھا - لیکن کچھ مدت کے بعد کوئی آدمی مغرب کی طرف روانہ ہوا اور اُسی سمت میں سفر کرتے کرتے وہیں پہنچ گیا ، جہاں سے چلا تھا - جس سے ثابت ہو گیا کہ زمین واقعی گول ہے -

نظام بطلیموس[1] کے مطابق کرۂ ارض عالم کا مرکز ہے - اور تمام اجرام سماوی اُس کے گرد گردش کرتے ہیں - بطلیموس کے عہد سے پہلے بھی بعض علما کا خیال تھا کہ آفتاب مرکز ہے اور زمین اور سیّارے اُس کے گرد گھومتے ہیں - لیکن یہ قیاس اُس زمانے کے علما کی عقل سے بالا تر تھا - اس لئے سولھویں صدی تک نظام بطلیموس کا دور دورہ رہا -

نظام کو پرنیکس[2] سنہ ۱۵۴۳ع میں کوپرنیکس نے یہ نظریہ پیش کیا ، کہ آفتاب قائم ہے اور زمین اور سیّارے اُس کے گرد دائروں میں گردش کرتے ہیں لیکن جب کیپلر[3] نے سیّاروں کے مدار تحقیق کئے تو معلوم ہوا کہ وہ دائروں کے بجائے بیضوی ہیں - چنانچہ کیپلر نے اپنی تحقیقات کی بنا پر سیّاروں کی حرکت کے متعلق تین قانون مرتّب کئے - جن میں سے ایک کلّیہ یہ ہے کہ ہر ایک سیارہ آفتاب کے گرد بیضوی مدار میں گردش کرتا ہے -

---

1. Ptolemy.
2. Copernicus.
3. Kepler.

اسی اثنا میں گلیلو[1] نے دوربین بنا کر اُس کے ذریعے مشتري
اور اُس کے اقمار کا مشاهده کیا - مشتري ایک ستّاره هے جو زمین
کي طرح آفتاب کے گرد گھومتا هے - اور جس طرح زمین کا ایک
چاند هے جو اُس کے گرد گردش کرتا هے ' اسی طرح مشتری کے
کئی چاند هیں ' جو اُس کے گرد گھومتے هیں - ان میں سے
چار چاند معمولي دوربین میں بھی نظر آجاتے هیں مشتری
اور اُس کے چاندوں کا نظام ' آفتاب کے نظام کے بالکل مشابه هے .
نظام شمسي کے اس چھوٹے نمونے کو دیکھہ کر گلیلیو کو کوپرنیکس
کی صداقت میں کوئي شبه نه رها - چنانچه اُس نے اپني
تحقیقات ایک رساله کی شکل میں پیش کي - یه رساله نه
صرف عام لوگوں کو عجیب نظر آیا ' بلکه پیشوایان مذهب بھی
اسے دیکھہ کر گلیلیو کے دشمن هو گئے - گلیلیو پر کفر اور الحاد
کے فتوے صادر هو گئے - اور اُسے مجبور کیا گیا که روما میں آکر
اپنے غلط اور گمراه کن اعتقادات سے توبه کرے -

تجاذب[2] مادّی

سنه ۱۶۸۵ع میں نیوٹن نے اپنا کلّیه تجاذب
وضع کیا جس کا مفهوم یه هے ' که هر مادّي جسم
دیگر اجسام کو اپني طرف کھینچتا هے - اور دو اجسام کا باهمي
تجاذب کمیتّوں[3] کے زیادہ هونے سے بڑھہ جاتا هے اور اُن کے درمیاني
فاصله کے بڑھنے سے گھٹتا هے -

---

1. Galileo.

2. Gravitation.

۳ - کمیّت مادہ کي مقدار کو کہتے هیں - مثلاً دو سیر کي کمیّت ایک
سیر سے دگني هے -

اس قانون کے مطابق اجسام کے زمین پر گرنے کي وجہ زمین کي قوت جاذبہ ھے ' جس کے ذریعے وہ اُنھیں اپني طرف کھینچ لیتي ھے ' اور آفتاب کے گرد سیّاروں کی گردش کی وجہ آفتاب کا تجاذب ھے - چاند بھي زمین کے جاذبہ کي وجہ سے اُسکے گرد گھومتا ھے - چاند زمین پر اس لئے نہیں گرتا کہ اُس حرکت کے علاوہ جو زمین کي کشش سے پیدا ھوتي ھے ' چاند کی ذاتی حرکت بھی ھے - زمین کی کشش سے چاند کی حرکت کی سمت بدلتي رھتي ھے - اگر ذاتی حرکت نہ ھوتی تو چاند زمین پر گر جاتا اور اگر زمین کي کشش نہ ھوتی تو چاند اُس کے گرد گھومنے کے بجائے خط مستقیم میں سیدھا چلا جاتا - سیّارے بھی ذاتي حرکات کي وجہ سے آفتاب پر نہیں گرتے بلکہ اُس کے گرد گھومتے ھیں -

نیوٹن کے کلیۂ تجاذب سے اجرامِ سماوي[1] کی حرکات بالکل واضح ھو گئیں - ایسا معلوم ھوتا تھا کہ کلیۂ تجاذب کی دریافت سے قدرت کا اصلی راز آشکارا ھو گیا ھے بایں ھمہ بعض مظاھر ایسے دریافت ھوئے جن کی توجیہ سے نیوٹن کا قانون قاصر رھا - آئن‌ستائین نے جو نظریہ پیش کیا ھے ' وہ قدرت کے تمام معلومہ مظاھر پر حاوی ھے اور اس لحاظ سے نیوٹن کے قانون سے بھي زیادہ عالمگیر ھے -

فضا - زمانہ اور مادّہ

کپلر کے مشاھدات کی مدد سے کلیّۂ تجاذب وضع کرنے میں نیوٹن نے چند اساسی اصول پیش نظر رکھے ' جو قوانین حرکت کے نام سے موسوم

---

1. Heavenly Bodies.

هیں - پہلا اصول یہ ہے کہ ہر مادّی جسم کی فطرت میں داخل ہے کہ ساکن ہو تو ساکن رہتا ہے ' اور متحرک ہو تو خط مستقیم میں حرکت کرتا چلا جاتا ہے - اور جب تک کوئی بیرونی قوت اُس پر عمل نہ کرے ' اپنی حالت نہیں بدلتا -

قوانین حرکت کی تشریح میں نیوٹن نے مطلق فضا ' مطلق زمانہ اور مطلق کمیّت کے متعلق پرانے اعتقادات کو مسلم قرار دیا تھا -

مطلق فضا

فضائے بسیط کے متعلق اعتقاد تھا ' کہ وہ ہر طرف لا انتہا فاصلے تک پھیلی ہوئی ہے ' اور سوائے اُن مقامات کے جہاں مادّی اجسام ہوتے ہیں ' خلائے محض ہے - اس عقیدہ کے مطابق فضا کی خاصیات اقلیدسی ہیں ' جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر فضا میں کوئی شکل کھینچی جائے - تو وہ اقلیدسی علم ہندسہ کے مطابق ہو گی - [جو اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے] مثلاً اگر کوئی دائرہ کھینچا جائے تو اُس کا محیط قطر سے $\frac{22}{7}$ گنا ہوگا اور دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ مختلف ناظروں کی پیمائش کے مطابق ہمیشہ برابر ہوگا - ناظروں کی حرکت وغیرہ پر منحصر نہ ہو گا -

مطلق زمانہ

زمانہ کے متعلق اعتقاد تھا کہ وہ یکساں رفتار کے ساتھ گذرتا چلا جاتا ہے - اور دیگر اجسام کی حرکت کا اُس کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا - اس عقیدہ کی رو سے دو واقعات کے درمیان وقت کا وقفہ مطلق ہوتا ہے - یعنی سب ناظروں کی پیمائش کے مطابق برابر ہوتا ہے - نیوٹن کا قول ہے کہ مطلق وقت اپنی فطرت کی وجہ سے بلالحاظ بیرونی

اسباب کے بہتا چلا جاتا ہے - گویا وقت ایک دریا کی مانند ہے، جو بلا لحاظ اس امر کے کہ اُس میں کوئي کشتی ہے یا نہیں، بہتا چلا جاتا ہے -

مطلق کمیّت

مادّہ کے متعلق قدیم تصور یہ تھا کہ عالم میں مادہ کی مقدار معیّن ہے، جس میں کسی ترکیب سے کمي بیشي نہیں ہو سکتی - مادہ کی مقدار کو کمیت کہتے ہیں، اور کسی جسم کي کمیّت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس پر قوت کا کیا اثر مترتب ہوتا ہے - مثلاً اگر ہمارے پاس ایک فٹ بال ہو اور اُسی حجم کا لوہے کا گولا ہو، تو ہم پاؤں سے ٹھکرا کر معاً دریافت کر لیں گے کہ فٹ بال کونسا ہے اور لوہے کا گولا کونسا - فٹ بال پاؤں کے زور سے بہت دور جا پڑے گا، لیکن اُتنے زور سے لوہے کے گولے میں خفیف سي حرکت پیدا ہو گی - اس کي وجہ یہ ہے کہ لوہے کے گولے کی کمیّت یا مقدارمادّہ فٹ بال کی کمیّت سے زیادہ ہے - اگر دو جسموں پر برابر قوت ایک معیّن وقت تک عمل کرے اور ایک جسم کی رفتار دوسرے جسم سے دگني ہو - تو پہلے جسم کی کمیّت دوسرے جسم سے آدھي ہو گي - چنانچہ چار سیر وزن کی کمّیت دو سیر سے دگنی ہوتی ہے اور ایک سیر سے چو گنی -

اس عقیدہ کي رو سے ہر جسم کي کمیّت ایک معین مستقل مقدار ہے، جو کسي وجہ سے گھٹ بڑھ نہیں سکتی -

نظریۂ اضافیہ میں عام دلچسپي

بالعموم سائنس کے قیاسات اور قوانین کی طرف ماہران فن کے سوا اور کسي آدمی کي توجہ مبذول

نہیں ہوتی - لیکن نظریہ اضافیت کے متعلق ہر طبقہ کے لوگوں نے دلبستگي کا اظہار کیا ھے - اس نظریہ کا سمجھنا مشکل ھے اور روزمرّہ کي زندگی میں بھي اس سے کوئی منفعت مقصود نہیں – تو پھر کیا وجہ ھے کہ عام لوگ اس کي طرف متوجہ ہوئے ھیں -

گو عوام‌الناس کو سائنس سے چنداں سروکار نہیں ھوتا ' لیکن ابتدائي تعلیم اور تجربہ سے سائنس کے بعض تصوّر اُن کے ذھن‌نشیں ھو جاتے ھیں ' جب تک کسي قیاس کی زد اُن خیالات پر نہ پڑے ' لوگوں کو نئے قیاس سے چندان سروکار نہیں ھوتا - لیکن نظریہ اضافیت نے فضا اور زمانہ کے متعلق پرانے اعتقادات کي بنیادیں متزلزل کردي ھیں - اور جو لوگ طبعاً لکیر کے فقیر ھوتے ھیں وہ خیالات میں تبدیلي گوارا نہیں کرتے - یہی وجہہ ھے کہ گو شروع شروع میں نظریۂاضافیت کے متعلق دلچسپي پیدا ھو گئی - مگر عام لوگ اس بنا پر اس نظریہ کے مخالف ھوگئے کہ وہ عقل کے خلاف ھے -

اب میں یہ واضح کروں گا ' کہ نظریۂ اضافیت کا کس طرح ارتقا ھوا اور اُس نے مادہ ' فضا اور وقت کے متعلق ھمارے اعتقادات میں کیا انقلاب پیدا کیا ھے -

اصول اضافیت

فرض کرو کہ دو ریل گاڑیاں ' ا ' اور ' ب ' پاس پاس ھیں - جن میں سے ' ا ' یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کر رھی ھے - اور ' ب ' ساکن ھے - ب کے ناظر کو ' ا ' حرکت کرتی نظر آئیگي ' لیکن ' ا ' کے ناظر کو ' ب ' مخالف سمت میں چلتي دکھائي دے گي - اگر ' ا ' کا ناظر اُس

کی کھڑکیاں بند کر لے تو وہ کسي تجربہ سے معلوم نہ کر سکے گا کہ گاڑي ساکن ہے یا متحرک - مثلاً جب وہ گیند گرائے گا ' تو وہ اُسی طرح گرے گي ' جس طرح زمین پر گرتي - اسی طرح گاڑي کي حرکت کا اور تجربوں پر بھی کوئي اثر نہ ہوگا -

پس بیروني اشیا کے مقابلے کے بغیر گاڑی کی حرکت کا علم نہیں ہو سکتا - ہماري زمین سورج کے گرد گردش کر رہي ہے ' مگر اُس کي حرکت کا ذي حس آلات پر بھي کوئی اثر نہیں ہوتا - ہم اجرام سماوي کو دیکھ کر سمجھتے ہیں ' کہ زمین حرکت کر رہي ہے - لیکن اگر ہمیں سورج اور ستارے نظر نہ آتے ' تو ہمیں زمین کي حرکت کا کبھي علم نہ ہوتا -

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حرکت اور سکون اضافي اصطلاحیں ہیں - کسي جسم کي حرکت سے مراد اُس کی اضافی حرکت ہے - حرکت مطلق کے کچھ معنی نہیں ہیں - کیونکہ ہمیں کسي قسم کے تجربے سے مطلق حرکت کا علم نہیں ہو سکتا - اگر دنیا میں ایک ہی جسم ہوتا تو ہمیں کبھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ ساکن ہے یا یکساں مستقیم حرکت کے ساتھ کسی خاص سمت میں چلا جا رہا ہے -

اس اصول کو علم الحیل Mechanics کا اصول اضافیت کہتے ہیں - اس اصول کا مفہوم یہ ہے کہ ہم کسی قسم کے حیلي تجربے سے کسي جسم کي مطلق حرکت[1] معلوم نہیں کر سکتے -

---

[1] - حرکت سے مراد یکساں مستقیم حرکت ہے -

سوال پیدا ہوتا ہے ' کہ آیا اصول اضافیت ایک ہمہ گیر اصول ہے ' جو حیلیِ تجربوں کے علاوہ تمام قسم کے مظاہر پر حاوي ہے ' یا ہم کسي خاص طریقے سے مطلق حرکت کا احساس کر سکتے ہیں -

مطلق حرکت معلوم کرنے کي کوشش

روشني یا نور کے متعلق ثابت ہوچکا ہے ' کہ اُس کي اشاعت امواج کے ذریعہ ہوتي ہے - ان امواج کے پیدا ہونے کے لئے کوئی واسطہ ہونا چاهئے - اس لئے فرض کیا گیا ہے ' کہ ایک واسطہ جس کا نام اثیر ہے جو فضاے بسیط میں پھیلا ہوا ہے - کوئی جگہہ اُس سے خالی نہیں - روشني کی امواج اور لاسلکی امواج اثیر Ether میں سے گذرتي ہیں - بعض مشاهدات سماوي سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اثیر ساکن ہے -

ہماري زمین آفتاب کے گرد ایک سال میں دورہ کرتي ہے اور اُس کی رفتار تقریباً ۱۹ میل فی ثانیہ ہے - چونکہ اس کا مدار بہت بڑا ہے ' اس لئے ہم اس کي حرکت کو یکساں مستقیم حرکت تصور کر سکتے ہیں - یہ بھي معلوم ہے کہ روشني کي امواج اثیر میں ۱۸۶۱۷۳ میل فی ثانیہ طے کرتي ہیں ' تو یہ ممکن ہونا چاهئے کہ ہم زمین پر سے مختلف سمتوں میں روشني کی رفتار ناپ کر زمین کی رفتار نکال لیں -

فرض کرو کہ روشني کی ایک شعاع زمین سے روانہ ہوتي ہے - وہ ایک ثانیہ میں ۱۸۶۱۷۳ میل طے کریگی - گویا جس مقام پر پیدا ہوئي تھی وہاں سے ۱۸۶۱۱۷۳ میل آگے نکل جائے گی - لیکن ایک ثانیہ میں زمین بھي ۱۹ میل چل چکي ہو گي - پس اگر روشني کي شعاع زمین کي حرکت کی سمت

میں جا رہي ہو' تو زمین کے ناظر سے ۱۸۶۱۷۳ — ۱۹ یعني ۱۸۶۱۵۴ میل دور ہو گي اور وہ اپنی پیمائش سے یہ قرار دے گا کہ روشني کی رفتار ۱۸۶۱۵۴ میل فی ثانیہ ہے - لیکن اگر دوسرے تجربے میں وہ شعاع' مقابل سمت میں روانہ کریگا' تو ایک ثانیہ میں روشني اور ناظر کے درمیاں ۱۸۶۱۹۲ میل فاصلہ ہو جائے گا اور وہ روشنی کي رفتار ۱۸۶۱۹۲ میل فی ثانیہ قرار دے گا - ظاہر ہے کہ اگر زمین پر سے روشني کي رفتار معلوم کی جائے اور وہ مختلف سمتوں میں مختلف نکلے تو اُس سے زمین کي حرکت کا علم ہو جائے گا -

کسي خاص سمت میں رفتار نور کی صحیح پیمائش ناممکن ہے - اس لئے کہ نور کی رفتار زمیں کي رفتار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے - لیکن اگر رفتار نور مختلف سمتوں میں مختلف ہو - تو اُن سمتوں میں نور کے جانے آنے کا وقت بھی برابر نہ ہو گا -

مچلسن اور مارلے کا تجربہ

اس بات کو مد نظر رکھ کر مچلسن اور مارلے نے زمین کی رفتار دریافت کرنے کي کوشش کي - تجربے کا اصول ذہن نشیں کرنے کے لئے فرض کرو کہ کوئی پیراک ۶ میل في گھنٹہ کي رفتار سے رَو کي سمت میں ۱۲ میل دور جاکر واپس آتا ہے - پانی ساکن ہو گا تو دو گھنٹے جانے کے لئے اور دو' آنے کے لئے درکار ہونگے - یعني کل سفر ۴ گھنٹوں میں ختم ہو گا - اب اگر رَو کی رفتار دو میل في گھنٹہ ہو - تو رَو کي سمت میں پیراک کی رفتار ۸ میل فی گھنٹہ ہو جائے گي اور ۱۲ میل طے کرنے کے لئے

تیزرہ گھنٹہ درکار ہو گا - رَو کی مخالف سمت میں اُسکی رفتار ۴ میل فی گھنٹہ ہو گی اور ۱۲ میل آنے میں تین گھنٹے لگ جائیں گے گویا کل سفر ساڑھے ۴ گھنٹوں میں ختم ہو گا - پس اگر پیراک ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ۱۲ میل جاکر واپس آئے تو کم وقت درکار ہو گا اور اگر وہ رَو کی سمت میں ۱۲ میل جاکر لوٹے تو زیادہ وقت لگ جائے گا -

مچلسن نے ایک ذی حس آلہ بنایا ' جس میں روشنی کی ایک شعاع زمین کی حرکت کی سمت میں ایک خاص فاصلے پر جاکر آئینے سے منعکس ہوتی تھی - اور ایک اور شعاع عمودی سمت میں اُتنے ہی فاصلے پر جاکر لوٹتی تھی - دونوں شعاعوں کے جانے آنے کے وقت میں فرق ناپنے کی کوشش کی گئی - اگر نور کی رفتار میں ایک میل فی ثانیہ کا فرق بھی ہوتا تو شعاعیں ایک ہی آن پر واپس نہ آتیں - اور زمیں کی رفتار کا اثر معلوم ہو جاتا - لیکن نور کی رفتار میں ذرّہ بھر فرق بھی محسوس نہ ہو سکا -

اگر توقع کے مطابق رفتار نور پر زمیں کی رفتار کا اثر محسوس ہو جاتا تو اس اثر سے ہم زمین کی رفتار نکال لیتے لیکن تجربے سے ثابت ہو گیا ' کہ اصول اضافیت علم‌المناظر کے مظاہر پر بھی صادق آتا ہے - یعنی نور کے متعلق کسی تجربے سے بھی ہم کسی جسم کی مطلق حرکت دریافت نہیں کر سکتے آئین ستائین کا خاص نظریۂ اضافیت یہ ہے ' کہ کسی جسم پر کوئی ایسا تجربہ نہیں ہو سکتا ' جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ جسم ساکن ہے یا یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کر رہا ہے -

نور کی اشاعت امواج کے ذریعے ہوتی ہے '

رفتار نور

اسلئے اُس کی رفتار مستقل ہوتی ہے - اُس پر مخزن نور یا ناظر کی رفتار کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا - اس اصول کو " اصول استقلال رفتار نور " کہتے ہیں - پس متحرک ناظر کو روشنی مختلف سمتوں میں مختلف رفتار کے ساتھہ چلتی نظر آنی چاہئے - لیکن فی‌الواقع ایسا نہیں ہوتا - تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اگر ناظر " ا " سے " ب " کی طرف جا رہا ہو - تو روشنی اُسے "ا" "ب" سمت میں بھی اپنی معین رفتار " ر " کے ساتھہ جاتی ہوئی معلوم ہوگی اور مخالف سمت میں بھی اُسی رفتار سے جاتی ہوئی نظر آئیگی - ناظر کی رفتار کا روشنی کی رفتار پر مطلق اثر نہ ہوگا خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو -

ا ———————— ب

شکل نمبر ۱

مثلاً اگر ناظر روشنی سے آدھی رفتار کے ساتھہ بھی سفر کر رہا ہو تو اُسے روشنی ہر طرف " ر " رفتار کے ساتھہ جاتی ہوئی معلوم ہوگی اور روشنی کی رفتار کو ناپ کر وہ یہی سمجھے گا کہ میں ساکن ہوں -

مچلس اور مارلے کے تجربوں کے نتائج حیرت انگیز ہیں - تعجب ہے ' کہ اگر ناظر ' روشنی کی شعاع کے پیچھے دوڑ رہا ہو ' تو بھی شعاع اُسے اپنی اصلی رفتار کے ساتھہ آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ شعاع کی مخالف سمت میں دوڑ رہا ہو تو بھی روشنی اُسے اپنی اصلی رفتار کے ساتھہ دور ہوتی

نظر آتی هے - یه بات عقل عامّ یا حسّ مشترک کے مخالف معلوم هوتی هے -

لیکن عقل عامّ همیشه راستی پر نهیں هوتي - قدیم زمانه میں یه اعتقاد تها که زمیں چپٹی هے ' پهر بعض وجوه کي بنا پر کسي آدمي نے کهه دیا که زمین گول هے - اس مسئله پر غور کرنے کی بجائے لوگ مضحکه اُڑانے لگے - اور کهنے لگے که زمین گول نهیں هو سکتی - اگر گول هوتی تو نیچے کی طرف کے آدمي گر جاتے - پس اُس کا گول هونا عقل کے خلاف هے - لیکن تجربے کا دائره وسیع هوتا گیا ' اور آخرکار زمین کے گرد چکّر لگا کر معلوم کرلیا گیا که زمین واقعي گول هے - اور عقل عامّ مغالطے میں هے -

جب اس قسم کی نئي باتیں دریافت هوتی هیں ' جن کي پرانے تصورات کے ساتهه تطبیق نهیں هو سکتي تو همیں اُن تصوّرات میں مناسب تبدیلی کرنی پڑتی هے - مختلف ناظروں کی پیمائش کے مطابق رفتار نور کا برابر هونا همیں عقل عامّ کے خلاف اس لئے معلوم هوتا هے که هم نے شروع سے فضا اور زمانے کے متعلق غلط تصور قائم کیا هے - ڈاکٹر اُئین‌ستائین اس مسئله کے متعلق فرماتے هیں که هم نے بلا کسي دلیل کے زمانے اور فضا کو مطلق مان لیا هے ' مگر یه تصوّر صحیح نهیں هے ؛ اب غور طلب امر یه هے ' که فضا اور زمانے کے تصور میں کیا تبدیلي کی جائے که مچلس اور مارلے کے تجربوں کي تشریح هو جائے -

وقت کا تصوّر

فرض کرو کہ 'ا' 'ب' ریل کي ایک لمبی اور سیدھي سڑک کا پشتہ ھے -- اور 'ن' ناظر 'ا' 'ب' کے عین وسط میں کھڑا ھے - یہ بھي فرض کرو کہ

شکل نمبر ۲

سڑک پر ایک طویل گاڑي گذر رھي ھے جو 'ا' سے 'ب' کي طرف جا رھي ھے - جس میں 'م' کوئي مسافر ھے -

اب یہ فرض کرو کہ 'ا' اور 'ب' پر بجلي کا شرارہ پیدا ھوتا ھے - جو 'ن' کو ایک ھي وقت پر نظر آتا ھے - 'ن' یہ قرار دے گا کہ جس وقت 'ا' پر شرارہ پیدا ھوا - عین اُسي وقت 'ب' پر شرارہ پیدا ھوا - یعني دونوں مقاموں پر شرارے کی پیدائش ھم وقت واقع ھوئی - سوال پیدا ھوتا ھے کہ آیا جو واقعات 'ن' کو ھم وقت معلوم ھوتے ھیں - وہ 'م' کو بھي ھم وقت معلوم ھوتے ھیں یا نہیں -

فرض کرو کہ 'م' ناظر 'ن' کے مقابل اُس وقت آتا ھے' جب کہ ناظر کے مشاھدہ کے مطابق 'ا' اور 'ب' پر شرارہ پیدا ھوا - لیکن مسافر 'ا' سے 'ب' کي طرف جا رھا ھے - یعني 'ا' کی شعاعوں سے دور ھو رھا ھے اور 'ب' کی شعاعوں کی طرف بڑھ رھا ھے - نور کي رفتار برابر ھے - اس لئے 'ب' کی روشني مسافر کے پاس 'ا' کی روشني سے پہلے پہنچتي ھے - اس لئے وہ یہ سمجھے گا کہ 'ب' پر شرارہ 'ا' سے پہلے

پیدا ہوا - پس جو واقعات 'ن' کو ہم وقت معلوم ہوتے ہیں 'م' کو ہم وقت معلوم نہیں ہوتے -

اب اگر کوئی اور ریل گاڑی مخالف سمت میں چل رہی ہو تو اُس کے مسافر کو یہ خیال ہو گا کہ 'ا' پر شرارہ پہلے پیدا ہوا اور 'ب' پر اُس کے بعد -

اگر شرارے 'ن' کے مشاہدہ کے مطابق ایک ہی وقت پر نہ پیدا ہوں' تو وہ دونوں واقعات کے درمیان وقت کا فرق نکالے گا - اسی طرح مسافر بھی دونوں واقعات میں وقت کا وقفہ نکالے گا' تو دونو کے حساب کے مطابق وقت کا فرق برابر نہ نکلے گا -

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسافر راستی پر ہے یا ناظر - اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں - کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ ریل گاڑی حرکت کر رہی ہے اور زمین ساکن ہے - نتیجہ یہہ نکلا' کہ وقت کا تصور اضافی ہے' اور ناظروں کی اضافی حرکت[1] پر منحصر ہوتا ہے -

طول کا تصوّر:

فرض کرو کہ ایک لمبی گاڑی گذر رہی ہے اور ایک ناظر 'ن' سڑک کے پاس کھڑا ہے - سوال یہ ہے کہ گاڑی کا طول ناظر کی پیمائش کے مطابق وہی ہو گا جو گاڑی کے مسافر کی پیمائش کے مطابق ہوتا ہے یا کم وبیش -

فرض کرو کہ 'ا' اور 'ب' دو بجلی کے لمپ ہیں - اور یہ انتظام ہے کہ جیسے ہی گاڑی کا اگلا سرا 'ا' پر پہنچے وہ

---

۱ - اضافی حرکت Relative Motion .

روشن ہوجائے اور جیسے ہي گاڑي کا پچھلا سرا 'ب' پر پہنچے 'ب' چمک اُٹھے - اگر ناظر کے مشاهدے کے مطابق 'ا' اور 'ب' پر لمپ ایک ساتھہ روشن ہونگے' تو وہ 'ا' 'ب' کو گاڑي کے طول کے برابر سمجھے گا اور ایک گز لیکر 'ا' سے 'ب' تک
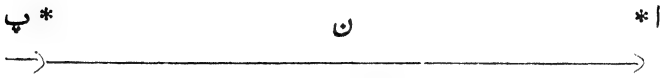
شکل نمبر ۳

فاصلہ ناپ لے گا - فرض کریں کہ 'ا' سے 'ب' تک' اُسے گز' ایک ہزار مرتبہ رکھنا پڑتا ہے' تو سڑک کے ناظر کي پیمائش کے مطابق گاڑی کا طول ایک ہزار گز ہو گا -

گاڑی کے مسافر 'م' کو لمپ ایک ساتھہ روشن ہوتے نظر نہ آئیں گے - اُس کے مشاهدے کے مطابق 'ا' 'ب' سے پہلے' روشن ہو گا - وہ سمجھے گا کہ ترین کا اگلا سرا 'ا' پر پہلے پہنچ گیا اور اُس کا پچھلا سرا 'ب' پر اُس کے بعد پہنچا - اُس کی پیمائش کے مطابق ریل گاڑی 'ا' 'ب' سے زیادہ لمبی ہوگي -

پس مسافر کے نزدیک سڑک کا 'ا' 'ب' فاصلہ گاڑي کے طول سے کم ہے' اور ناظر 'ن' کے نزدیک وہی فاصلہ گاڑي کے طول کے برابر ہے - متحرک ناظر کو ساکن چیزیں چھوٹی نظر آتی ہیں اور ساکن ناظر کو متحرک چیزیں حرکت کي سمت میں سُکڑي ہوئي دکھائي دیتی ہیں - معلوم ہوا کہ فاصلے کا تصور بھي اضافي ہے -

جن رفتاروں کے ساتھ ہمیں سابقہ پڑتا ہے وہ رفتار نور کے مقابلے میں نہایت قلیل ہیں، اس لئے اُن رفتاروں کا طول اور وقت پر اثر اتنا کم ہوتا ہے کہ اُس کی پیمائش نہیں ہو سکتی - مثلاً اگر آفتاب پر کوئی ناظر موجود ہو، تو اُسے زمین ۱۹ میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی نظر آئے گی، اور اس رفتار کا اثر یہ ہو گا کہ زمین کا قطر جو ۸۰۰۰ میل ہے، ڈھائی فُٹ کے قریب سُکڑ جائے گا - ۸۰۰۰ میل میں ڈھائی فٹ کی کمی حسّاس ترین آلہ سے بھی ناپی نہ جا سکے گی -

نظریۂ اضافیت کے حیرت انگیز نتائج کو ذہن نشین کرنے کے لئے اکثر مصنفوں نے فرضی مثالیں پیش کی ہیں - فرض کریں، کہ کوئی آدمی تیز رفتار سیّارے پر بیٹھا ہے جو ۱۶۱،۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے اور ہم اُسے دیکھ رہے ہیں - اس رفتار سے طول آدھا رہ جاتا ہے - اگر وہ آدمی حرکت کی سمت میں ہوگا تو اُس کا قد آدھا یعنی تین فٹ نظر آئے گا - مگر اُس کی چوڑائی میں کوئی فرق نہ ہوگا - پھر جب وہ آدمی کسی اور سمت میں ہوگا تو اُس کا قد پورا چھ فٹ ہو جائے گا اور چوڑائی آدھی رہ جائے گی لیکن اُسے خود اپنی ہئیت کذائی کا علم نہ ہو گا - البتہ اُسے اہل زمین عجیب الخلقت نظر آئیں گے -

اس قسم کا کوئی سیّارہ معلوم نہیں ہے لیکن بعض سحابیات[1] کی رفتار ۱۰۰۰ میل فی ثانیہ ہے - فرض کریں کہ ایسے سحابیہ میں کوئی آباد سیّارہ بھی موجود ہے - ۱۰۰۰ میل

---

1. Nebulœ.

فی ثانیہ کی رفتار سے جو انقباض ہوتا ہے وہ نئی حس
آلات کے ذریعے ناپا جا سکتا ہے - ہمیں اس سیّارے کے پیمانے
گھٹتے بڑھتے نظر آئیں گے - جب کوئی پیمانہ حرکت کی سمت
میں ہوگا تو سکڑا ہوا دکھائی دیگا ' اور جب کسی اور سمت
میں ہوگا تو اس کے طول میں کمی نہ ہوگی - شاید پیمانے کو
گھٹتے بڑھتے دیکھہ کر ہم کہہ اُٹھیں ' کہ سیّارے کے رہنے والے اُس
کی تیز حرکت کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا ہیں اسلئے کہ اُن کے
پیمانوں کے طول مستقل نہیں رہتے -

مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ہماری زمین کی حرکت
سُست ہے اور ہمارے پیمانوں کی لمبائی گھٹتی بڑھتی نہیں -
اگر سیّارے کے ہیئت داں اتنے فاصلے سے ہمیں دیکھہ سکیں ' تو
اُنہیں نظر آئیگا ' کہ زمین ایک ننھّی سی چیز ہے جو ایک ہزار
میل فی ثانیہ کی رفتار سے اُڑتی جا رہی ہے - ہمارے پیمانے اُنہیں
گھٹتے بڑھتے نظر آئیں گے اور وہ کہہ اُٹھیں گے ' کہ زمین کے رہنے
والے کیسے بدنصیب لوگ ہیں کہ اتنی تیزی کے ساتھہ حرکت کر
رہے ہیں ' اور اس حرکت کی وجہ سے اُن کے پیمانے مستقل
نہیں رہتے - اس لئے اُن کی تمام پیمائشیں غلط ہوتی ہیں -

سیّارے کے رہنے والے راستی پر ہیں یا ساکنان ارض ' اس
بات کا فیصلہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں - سیّارے اور زمین میں
اضافی حرکت ہے - اس لئے سیّارے سے زمین ۱۰۰۰ میل فی ثانیہ
کی رفتار سے چلتی نظر آتی ہے ' اور ہمیں سیّارہ ۱۰۰۰ میل
فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے - زمین کو
اجرام عالم میں کوئی خاص فوقیت حاصل نہیں ہے کہ ہم اسے
ساکن قرار دیکر حرکت سیّارہ کو منسوب کریں -

غالباً آپ یہ اعتراض کریں گے کہ اگر زمین پر پیمانہ تبدیل ہوتا تو ناپنے سے ہمیں اُس کی تبدیلی معلوم ہو جاتی - لیکن لطف تو یہی ہے کہ اس قسم کی تبدیلی کا پیمائش پر کوئی اثر نہیں ہوتا -

فرض کریں کہ زمین ۱۶۱۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے عالم بالا کی طرف پرواز کر رہی ہے - ممکن ہے کہ زمین اسی رفتار کے ساتھ اوپر کو جا رہی ہو - ہمارے پاس اس مفروضے کو غلط ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں - اس صورت میں جب کوئی آدمی لیٹے گا تو اُس کا قد پورا چھ فٹ ہوگا - مگر جب وہ کھڑا ہو گا تو تین فٹ رہ جایےگا - ہم فٹ کا پیمانہ لیکر اُس سے پہلے لیٹے ہوئے آدمی کو ناپتے ہیں تو وہ چھ فٹ ہوتا ہے - پھر اُسی پیمانے سے آدمی کو کھڑا کر کے ناپتے ہیں تو وہ چھ پیمانوں کے برابر ہوتا ہے - چونکہ پیمانہ اوپر کی سمت میں رکھنے سے سکڑ جاتا ہے - اور فٹ کی بجائے چھ انچ رہ جاتا ہے - اسلئے کھڑے ہوئے آدمی کا قد تین فٹ ہے -

لیکن ہماری آنکھیں بھی تو ہیں ' جن سے نہ پیمانہ سکڑتا نظر آتا ہے اور نہ آدمی - کیا ہمیں آنکھوں پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہئے ؟ ہرگز نہیں - اس لئے کہ آنکھ کا پردۂ اول ' اوپر کی سمت میں سکڑ کر آدھا رہ گیا ہے - اور اُس سمت کے فاصلوں کے احساس میں مبالغے سے کام لے رہا ہے - یعنی چھ انچ لمبے پیمانے کو ایک فٹ لمبا محسوس کر رہا ہے -

اگر ہم اپنے محسوسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہدیں کہ زمین ساکن ہے تو بالکل حق بجانب ہونگے - اسی طرح اگر

سیارہ کے رہنے والے اپنے محسوسات کے مطابق سیّارے کو ساکن قرار دیں تو وہ بھي حق بجانب ہونگے - ہمیں سیّارہ متحرک اور اُس کے پیمانے سکڑے ہوئے نظر آتے ہیں - اور سیّارے کے رہنے والوں کو زمین کے پیمانے حرکت کي سمت میں سکڑے ہوئے نظر آتے ہیں -

مطلق اور اضافی مقادیر[1]

نظریۂ اضافیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ تمام مقادیر اضافی ہوں - بلکہ یہ ہے کہ جن مقادیر کو ہم نے اب تک مطلق سمجھ رکھا تھا ' اُن میں سے بعض اضافی ہیں - مثلاً اگر ایک کمرے کے دروازوں کی تعداد ایک آدمی کے شمار کے مطابق چار ہو اور دوسرا آدمی کہے کہ دروازے پانچ ہیں تو ہم فوراً فتویٰ دیں گے کہ اُن میں سے ایک نے شمار میں غلطي کی ہے - اس لئے کہ تعداد مطلق مقدار ہے - لیکن اگر دونوں کي پیمائشوں کے مطابق دروازوں کے طول مختلف ہوں تو ضروري نہیں کہ ایک کي پیمائش غلط ہو - اس لئے کہ طول اضافی مقدار ہے -

خاص نظریۂ اضافیت کے نتائج اور اُن کي تصدیق

۱ — فرض کریں کہ ایک نلي پاني سے بھری ہے اور اُس میں سے شعاع نور گذر رہي ہے - ساکن پانی میں نور کی رفتار ۱۴۰۰۰۰ میل فی ثانیہ ہوتي ہے لیکن اگر پاني بہ رہا ہو اور شعاع اُس کے بہاؤ کي سمت میں گذرے تو نلی میں سے نکل کر ۱۱۲۰۰۰۰ میل سے زیادہ ہوگي - قدیم حساب کے مطابق یہ رفتار ' رفتار نور اور پانی کي رفتار کے مجموعے کے برابر ہونی چاہیے لیکن آئنس سٹائیں کے حساب کے مطابق مجموعے سے کم ہوني چاہئے -

---

1. Quantities.

فزو (Fizeau) نے متحرک مائعات میں نور کي رفتار پر تجربے کئے تو رفتار ' آئن سٹائین کے حساب کے مطابق نکلي -

۲ - نظریۂ اضافیت کا ایک اور نتیجہ یہ ھے کہ رفتار نور سے زیادہ رفتار ناممکن ھے - اگر کسی جسم کی رفتار ' نور کے برابر ھو جائے تو وہ روشنی کے ساتھہ ساتھہ جائے گا اور شعاعِ نور اُس سے الگ نہ ھوگی - لیکن تجربے سے ثابت ھوتا ھے کہ کوئي جسم روشني کے پیچھے دوڑ رھا ھو ' تو اُسے بھی شعاعِ نور اپني اصلي رفتار کے ساتھہ دور ھوتی نظر آتی ھے - یہ صرف اُسي صورت میں ممکن ھے جب کہ جسم کي رفتار ' نور کی رفتار سے کم ھو - پس اصول اضافیت کے مطابق رفتار نور ' تیز رفتار کی انتہا ھے - اور کسی جسم کی رفتار ' نور کي رفتار کو نہیں پہنچ سکتی -

مخلّي نلیوں Vacuum Tube میں برقي دباؤ پہنچانے سے چھوٹے چھوٹے منفي Negative برق پارے خارج ھوتے ھیں ' جن کو برقیے کہتے ھیں - ان برقیوں کی رفتار بہت تیز ھوتی ھے - لیکن رفتار نور کے برابر نہیں ھوتی - ان برقیوں سے بھي زیادہ تیز رفتار

ا — مخلّي نلي شیشے کی نلي ھوتی ھے ' جس کي ھوا خارج کي ھوئي ھوتی ھے - نلي کے اندر دونوں سروں کے قریب پلاٹینم کے پتّر ھوتے ھیں - جب ان پتّروں کو بیٹری کے ساتھہ جوڑتے ھیں ' تو بیٹري کے منفي قطب سے شعاعیں خارج ھوتي ھیں ' جنھیں منفی شعاعیں کہتے ھیں - ان شعاعوں کا رُخ برقي یا مقناطیسي اثر سے بدل جاتا ھے - ثابت ھوا ھے کہ یہ شعاعیں اصل میں چھوٹے چھوٹے برق کے ذرّے ھیں ' جن کا نام برقیے رکھا گیا ھے - برقی اور مقناطیسي اثر سے برقیوں کے رخ میں جو تبدیلي ھوتي ھے ' اُسے ناپ کر برقیے کي رفتار بھي معلوم ھو جاتي ھے اور اُس کي کمیّت بھي -

برقئے ریڈیم[1] کي سي چیزوں میں سے نکلتے ھیں - لیکن اُنکی رفتار بھي رفتار نور سے کسي قدر کم ھوتی ھے -

کمیت مادہ کا جدید تصور

اگر کسي ساکن جسم پر قوت کا عمل ھو تو اُس میں حرکت پیدا ھو جائے گي - اور اگر قوت کا عمل برابر جاري رھے ' تو جسم کی رفتار بڑھتی چلی جائے گی - پرانے عقیدے کے مطابق جسم کي کمیّت مستقل ھوتي ھے - اس میں کمي بیشي نہیں ھوتي - اس لئے قوت کے عمل سے رفتار کی جو زیادتي پہلے ثانیہ میں ھوگی ' وھی دوسرے ثانیے میں ھونی چاھئے اور وھی تیسرے ثانیے میں - غرض قوت کے متواتر عمل سے ھر ثانیہ میں رفتار کي زیادتی برابر ھوني چاھئے -

لیکن نظریۂ اضافیت کے مطابق رفتار نور سے زیادہ رفتار کسی چیز کي نہیں ھو سکتي - اب فرض کریں کہ جسم کی رفتار بڑھتے بڑھتے رفتار نور کے قریب ھو جاتي ھے - اگر قوت کا عمل اُس حالت میں بھي جاري رھے ' تو جسم کي رفتار میں چنداں زیادتي واقع نہ ھوگي اور جب ھم دیکھیں گے کہ قوت کا جسم پر بہت کم اثر مترتب ھوتا ھے تو قرار دیں گے کہ اُس کي

ا — ریڈیم ایک دھات ھے ' جس میں سے تین مختلف قسم کي شعاعیں خود بخود خارج ھوتي رھتي ھیں - اِن شعاعوں کو ' ا ' شعاعیں - ' ب ' شعاعیں اور ' ج ' شعاعیں کہتے ھیں - ب شعاعیں منفی شعاعوں کي مانند ھوتي ھیں - یعنی ننھے ننّھے برقیوں کا مجموعہ ھیں - ان برقیوں کي رفتار اور کمیّت بھی اُسي طریقے سے دریافت ھوسکتي ھے ' جس سے کہ مخلّی نلي کے برقیوں کي ھوتی ھے -

کمیت بہت بڑھ گئی ہے - آئنس ستائین کے حساب کے مطابق ہر جسم کی کمیّت اُس کی رفتار پر منحصر ہوتی ہے ' جب رفتار بڑھتی جاتی ہے تو کمیّت بھی ساتھ ساتھ بڑھتی ہے -

معمولی رفتار سے کمیت اتنی کم بڑھتی ہے کہ تجربے سے اُس کا علم نہیں ہو سکتا - لیکن ریڈیم سے خارج ہونے والے برقیوں کی رفتار ' رفتار نور کے لگ بھگ ہوتی ہے - تجربے سے برقئے کی رفتار اور کمیّت دونوں معلوم ہو جاتے ہیں - ثابت ہوا ہے کہ جن برقیوں کی رفتار زیادہ ہے اُنکی کمیّت بھی زیادہ ہے - اور رفتار سے کمیت کی زیادتی بعینہ اُتنی ہوتی ہے ' جتنی کہ اصول اضافیت کے مطابق ہونی چاہئے -

ضروری نہیں کہ برقئے کی جو کمیّت ہماری پیمائش کے مطابق ہے ' وہی کمیّت اور ناظروں کی پیمائش کے مطابق نکلے - اگر برقئے کو مخاطب کیا جائے کہ تمہاری تیز حرکت کی وجہ سے تمہاری کمیّت میں اضافہ ہو گیا ہے ' تو وہ جواب دیگا ' کہ ' بہت خوب - تیز حرکت کون کر رہا ہے ' میں تو ساکن ہوں - البتہ محو حیرت ہوں کہ تمہیں کیا جلدی پڑی ہے کہ جو ۱۰۰۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے اُڑتے چلے جا رہے ہو ''

مادّہ اور توانائی کی یگانگت

متحرک جسم میں توانائی یا زور ہوتا ہے - جس کی وجہ سے وہ کام کر سکتا ہے - اگر جسم کی رفتار بڑھ جائے ' تو اُس کی توانائی میں اضافہ ہو جاتا ہے -- اور رفتار کے گھٹنے سے توانائی میں کمی واقع ہو جاتی ہے - لیکن جسم کی کمیّت بھی رفتار کے بڑھنے سے بڑھ جاتی ہے اور رفتار کے گھٹنے سے گھٹ جاتی ہے - اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ جب کسی جسم کی توانائی بڑھتی ہے تو اُس کے ساتھہ کمیت بھی بڑھ جاتی ہے - اور چونکہ توانائی اور کمیت دونوں رفتار پر منحصر ہوتی ہیں - اس لئے کمیت کی زیادتی توانائی کی زیادتی کے مناسب ہونی چاہئے -

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہر ایک قسم کی توانائی میں کمیت ہوتی ہے - اور تمام کمیت یا مقدار مادّہ کا مبدأ توانائی ہے - بالفاظ دیگر مادّہ اور توانائی بعینہ ایک چیز ہے - کُل عالم ، توانائی [روح] کا کرشمہ ہے اور مختلف مادّی اشیا توانائی کی شکلیں ہیں -

جب ہم کسی جسم کو گرم کرتے ہیں ، تو اُس کی توانائی بڑھ جاتی ہے - لیکن اُس کے وزن اور کمیت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا - اس کی وجہ یہ ہے کہ گرم ہونے سے کمیت کی زیادتی نہایت قلیل ہوتی ہے - جس کی پیمائش نہیں ہو سکتی - توانائی کے مقادیر جن کے ساتھہ ہمیں سابقہ پڑتا ہے ، مادّے کے لاانتہا چھوٹے مقادیر کے مساوی ہوتے ہیں - اگر انسان کسی ترکیب سے مادّے کی اندرونی توانائی کے استعمال پر قادر ہوجائے ، یعنی مادّے کو اُس کی سادی توانائی میں تبدیل کر سکے ، تو معمولی وزن کی چیز سے اتنی توانائی نکل آئے کہ اُس کے مقابلے میں بڑے بڑے عظیم‌الشان انجنوں کی توانائی بھی ہیچ معلوم ہو -

کائنات - زمان و مکان کی ترکیب پرانے اعتقاد کے مطابق زمانہ اور فاصلہ مطلق تھے - لیکن نظریۂ اضافیت کے مطابق دو واقعات کے درمیان فاصلہ بھی مطلق نہیں ہوتا اور نہ وقفہ مطلق ہوتا ہے

هر آدمي کے پاس اپنا پیمانہ ھے اور اپني گھڑي ھے - وہ پیمانے سے فاصلہ ناپ لیتا ھے اور گھڑي میں وقت دیکھ لیتا ھے اور چونکہ وہ سمجھتا ھے کہ میں ساکن ھوں - اس لیے اپنے ناپے ھوئے فاصلے اور وقت کو مطلق قرار دیتا ھے - لیکن کسی اور ناظر کی پیمائش کے مطابق واقعات کے درمیان فاصلہ بھي مختلف ھوگا اور وقت کا فرق بھی -

سوال پیدا ھوتا ھے کہ اگر فاصلے اوو وقت کا فرق ' اضافي ھے تو کیا واقعات کے درمیان کوئی ایسی چیز بھي ھے جو تمام ناظروں کی پیمائش کے مطابق برابر نکلے - اس سوال کا جواب ھے کہ ھاں فاصلے اور زمانے کي ترکیب سے ایسي چیز حاصل ھوتي ھے ' جو سب ناظروں کے لئے برابر ھوتی ھے ' اس کا نام فصل کائنات ھے -

فرض کریں کہ کوئي طیّارہ تیز رفتار کے ساتھ اوپر سے گذرتا ھے ' اور ھواباز مختلف وقتوں پر دو اِشارے کرتا ھے - ھر اشارہ ایک واقع ھے ' جس کے مکمل علم کے لئے ھم دو باتیں دریافت کریں گے - ایک تو یہ کہ اُس نے اشارہ کس وقت ' بھیجا اور دوسرے یہ کہ طیّارہ اُس وقت کہاں تھا - وقت گھڑی کو دیکھ کر معلوم ھو جائے گا ' اور ھوائي جہاز کا مقام اُس کے طول بلد ' عرض بلد اور بلندي سے معین ھوگا - اسی طرح دوسرے اشارے کا وقت اور مقام دریافت کر لیے جائیں گے - اور جب معین ھو جائیں گے تو دونوں واقعوں کے درمیان فاصلہ بھی نکل آئے گا اور وقت کا فرق بھی -

اب اگر کوئي ناظر کسی اور طیّارے پر بیٹھ کر انھیں واقعات

کا مشاہدہ کر رہا ہو، اور اُس کا جہاز مستقل رفتار کے ساتھ پرواز کر رہا ہو، تو اُس کی پیمائش کے مطابق واقعات کے درمیان فاصلہ بھی مختلف ہوگا اور وقت کا فرق بھی، لیکن فاصلے اور وقت کی ترکیب سے جو فصل کائنات[۱] حاصل ہوگا وہ دونوں ناظروں کی پیمائش کے مطابق برابر ہوگا -

ہم فضا کی تین سمتوں کو جانتے ہیں -- یہ سمتیں آگے پیچھے، اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہیں - چونکہ فضا کی تین سمتیں ہیں - اس لئے اسے سلسلۂ ابعاد ثُلثہ کہتے ہیں - اس سلسلے میں کسی واقعہ کا محل وقوع تین خطوط سے معین ہو سکتا ہے - جیسا کہ ہوائی جہاز کا محل وقوع طول بلد، عرض بلد اور بلندی سے معین ہوتا ہے - آئنسٹائین نے واقعہ کی مکمل تعیین کے لیے چوتھا بُعد یعنی زمانہ بھی ان میں شامل کردیا ہے - اس لیے کائنات کو سلسلۂ ابعاد اربعہ کہتے ہیں -

اب فرض کریں کہ طیّارہ یکے بعد دیگرے مسلسل اشارے کرتا چلا جاتا ہے - جب وہ پہلا اشارہ کرتا ہے تو تین فضائی خطوط

فرض کریں کہ پہلے ناظر کے مشاہدے کے مطابق فاصلہ ۴، ر ہے [ر = رفتار نور] اور وقت کا فرق ۱۲ سیکنڈ - رفتار نور کو وقت میں تبدیل کرنے میں ایک ثانیہ کے برابر رکھتے ہیں -

فصل کائنات = $۱۲^{۲} — ۴^{۲}$ = ۱۲۸

اگر دوسرے ناظر کے مشاہدہ کے مطابق فاصلہ ۱۴ ر ہو تو وقت کا فرق ۱۸ سیکنڈ ہو گا -

تاکہ فصل کائنات [$۱۸^{۲} — ۱۴^{۲}$ = ۱۲۸] وہی نکلے جو پہلے ناظر کے مشاہدہ سے نکلا تھا -

سے اشارے کا مقام متعیں ہو جاتا ہے - اُن خطوط میں ایک
اور خط وقت کے مطابق کھینچ کر شامل کرنے سے جو نقطہ حاصل ہوتا
ہے اُسے نقطۂ کائنات کہتے ہیں - اسی طرح اور اشاروں کے نقطہ ہاے کائنات
معین ہو جاتے ہیں - اور ان نقاط کے باہم ملانے سے خط کائنات
بنتا ہے - اگر کوئی جسم یکساں مستقیم حرکت کے ساتھ متحرک ہو '
تو اُس کا خطّ ِ کائنات مستقیم ہوگا -

سلسلۂابعاد اربعہ کو ہم محسوس نہیں کر سکتے - اُس کي
وجہ یہ ہے کہ ہمارے احساسات ہماري حرکات پر منحصر ہوتے
ہیں - ہم صرف تین سمتوں میں حرکت کر سکتے ہیں ' اس
لیے تین بُعدوں کي فضا کا احساس کر سکتے ہیں - لیکن ہمارے
احساسات کے ناقص ہونے سے لازم نہیں آتا کہ سلسلۂابعاد اربعہ کا
وجود نہیں ہے -

فرض کریں کہ کوئي ایسی مخلوق ہے ' جس کے صرف دو
بُعد یعنی چوڑائی اور لمبائی ہیں - اس قسم کي مخلوق صرف
سطح پر حرکت کر سکے گي - اور صرف دو سمتوں کو محسوس
کر سکے گي اسے اوپر نیچے یعنی تیسرے بُعد کا مطلق کوئی احساس
نہ ہوگا - دو بُعدوں والی مخلوق تیسرے بُعد کا تصور قائم نہ
کر سکے تو یہ لازم نہیں آتا کہ تیسرے بعد کا وجود نہیں ہے -
ہماري حالت کائنات میں وہي ہے جو دو بُعدوں والی مخلوق
کي فضا میں ہے -

عام نظریۂ اضافیت

خاص نظریۂ اضافیت کو خاص اس لیے کہتے ہیں - کہ اس
میں ایک خاص قسم کي حرکت سے بحث ہوتي ہے یعنی یکساں

مستقیم حرکت سے - خاص اضافیت کا اصول یہ ھے کہ اگر کوئی جسم یکساں رفتار کے ساتھ خط مستقیم میں حرکت کر رھا ھو، تو دیگر اجسام کے حوالے کے بغیر اُسے اپنی حرکت کا احساس کسی قسم کے تجربے سے نہیں ھو سکتا - لیکن متغیّر حرکت کے لیے یہ اصول بادی النظر میں صحیح معلوم نہیں ہوتا - کیونکہ نا ھموار حرکت کا خارجی اجسام کے حوالے کے بغیر فوراً علم ھو جاتا ھے - مثلاً جب ریل گاڑی یک دم رُک جاتی ھے تو جمود کی وجہ سے آگے کو جھٹکا لگتا ھے - اور ھمیں کسی اور چیز کو دیکھے بغیر معلوم ھو جاتا ھے کہ گاڑی کی رفتار میں تبدیلی واقع ھوئی ھے - ریل گاڑیاں ٹکرا جائیں تو حرکت یک لخت رک جانے کی وجہ سے سیکڑوں جانیں ضائع ھو جاتی ھیں -

ان مظاھر کے سرسری مطالعہ سے گمان ھوتا ھے، کہ اسراع یعنی رفتار کی تبدیلی کا تصور مطلق ھے - لیکن اگر ھم اُسے مطلق قرار دیں تو مطلق زمانہ اور مطلق فضا کی طرف عود کرنا پڑتا ھے اور اصولی اضافیت کے مطابق، مطلق زمانہ اور مطلق فضا کا وجود نہیں ھے - یہ تو ھو نہیں سکتا کہ فضا اور زمانہ بعض مظاھر کے لیے اضافی ھوں اور بعض کے لیے مطلق - اس لیے اسراعی حرکت کا تصور بھی اضافی ھونا چاھیے، تاکہ فضا اور زمانے کے تصور میں تناقض نہ رھے -

اسراع کا تصور بھی اضافی ھے

نیوٹن کے اُصول حرکت کے مطابق جب تک کسی جسم پر قوت کا عمل نہ ھو وہ خط مستقیم میں یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رھتا ھے - اس لئے جب کوئی ناظر دیکھتا ھے کہ کسی جسم کی حرکت کی سمت بدل

گئی ھے ' یا اُس کی رفتار بڑھ گئی ھے ' تو وہ معاً کہہ اُٹھتا ھے کہ جسم پر قوت عمل کر رھی ھے - مثلاً جب ھم زمین پر چیزوں کو گرتا دیکھتے ھیں ' تو خیال کرتے ھیں کہ زمین اُنھیں کھینچ رھی ھے -

لیکن فرض کریں کہ کسی اور ناظر کو وھی جسم یکساں رفتار کے ساتھ سیدھا حرکت کرتا دکھائی دیتا ھے ' تو وہ یہ قرار دے گا کہ جسم پر کوئی قوت ' عمل نہیں کرتی ' اس صورت میں پھر سوال پیدا ھوگا ' کہ دونوں میں سے کون راستی پر ھے -

اب دیکھنا یہ ھے کہ دو ناظروں کی راے میں اس قسم کا اختلاف کیسے پیدا ھوسکتا ھے - فرض کریں کہ ایک بہت بڑا شفاف صندوق ھے اور اُس کے اندر ایک ناظر ' ا ' ھے - جس کے پاس تمام قسم کے طبیعی آلات موجود ھیں - یہ بھی فرض کریں کہ صندوق زمین کی سمت میں گر رھا ھے - اور اُس کی حرکت اسراعی ھے - یعنی اُن اجسام کی طرح جو ھمیں زمین پر گرتے نظر آتے ھیں - اُس کی رفتار ھر ثانیہ میں ۳۲ فٹ فی ثانیہ بڑھ جاتی ھے -

اب اگر کوئی اور ناظر ' ب ' زمین پر کھڑا ھو کر صندوق کا مشاھدہ کرے ' تو اُسے نظر آئے گا کہ صندوق اور اُس کے اندر کی تمام چیزیں یکساں اسراع کے ساتھ گر رھی ھیں - اس لئے وہ قرار دیگا کہ صندوق پر کوئی قوت جاذبہ عمل کر رھی ھے جو اُسے زمین کی طرف گرا رھی ھے -

لیکن صندوق کے ناظر کو اپنی حرکت کا احساس نہ ھوگا - وہ جس چیز کو جہاں رکھے گا - وھیں پڑی رھیگی - جب وہ کوئی

پتھر پھینکے گا تو اُسے سیدھا جاتا دکھائی دیگا - وہ اپنے تمام مشاہدات سے یہ قرار دیگا ' کہ خود بھی ساکن ہے اور صندوق بھی ساکن ہے - اور صندوق اور اُس کی کسی چیز پر کوئی قوت جاذبہ عمل نہیں کرتی -

اس اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ' ا ' اور ' ب ' کے درمیان اسراعی حرکت ہے - اگر ' ا ' زمین کو دیکھ سکے تو اُسے نظر آئے گا کہ زمین اور اُس کی تمام چیزیں صندوق کی طرف یکساں اسراع کے ساتھہ گر رہی ہیں - لیکن زمین کا ناظر زمین کو ساکن سمجھتا ہے -

پس ' ا ' کی رائے میں صندوق ساکن ہے اور ' ب ' کی رائے میں وہ کسی قوت جاذبہ کے زیر اثر یعنی میدان تجاذب میں اسراعی حرکت کر رہا ہے - دونو میں سے کون راستی پر ہے - ہم قدرتی طور پر کہہ اُٹھیں گے - کہ ' ب ' کا نقطۂ نظر صحیح ہے - لیکن اگر ہم صندوق میں بیٹھے ہوتے تو ' ا ' کے نقطۂ نظر کو درست قرار دیتے - حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے بیان اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق درست ہیں - اور اس بات کو ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ آیا صندوق میدان تجاذب میں اسراعی حرکت کر رہا ہے ' یا وہ کسی قوت جاذبہ کے زیر اثر نہیں اور ساکن ہے ' اس خیال کے مطابق قوت جاذبہ محض فریب نظر ہے یعنی ایک خاص نقطۂ نظر کا نام ہے -

اگر صندوق اور اُس کے ناظر میں اسراعی حرکت نہ ہوتی - تو ناظر اور چیزوں کو گرتے ہوئے دیکھہ کر کہتا کہ اُن پر کوئی قوت ' عمل کر رہی ہے - یعنی وہ میدان تجاذب میں ہیں - اُس حالت میں

اُس کا نقطۂ نظر وهي هوتا جو 'ب' کا هے - لیکن اپني اسراعي حرکت کي وجه سے وہ چیزوں کو ساکن دیکھتا هے اور سمجھتا هے که وہ ایسے میدان میں هیں ' جهاں کسی قوت جاذبه کا عمل نهیں - اس سے ثابت هوتا هے ' که میدان تجاذب ' تجاذب ' سے آزاد اسراعي حرکت کے مساوي هے - اور کوئی ایسا تجربه نهیں هو سکتا ' جس سے دونوں میں تمیز هو سکے -

دورِی حرکت کا تصور بهي اضافي هے

جب کوئي جسم دائرے میں گھومتا هے - تو اُس کي حرکت کي سمت بدلتي رهتی هے - جسم کا رجحان هوتا هے که خط مستقیم میں حرکت کرے اس وجه سے اُسے دائرے میں گھمانے کے لئے قوت صرف هوتی هے - اگر کوئی آدمی سائیکل پر سوار هو اور دائرے میں چکر لگا رها هو تو اُسے محسوس هوگا که مرکز کی مخالف سمت میں قوت ' عمل کر رهي هے اور گرنے سے بچنے کے لئے اُسے مرکز کي طرف متواتر زور لگانا پڑے گا -

فرض کریں که کوئي ناظر ' ا ' ایک ایسے قرص پر هے جو گھوم رها هے - ناظر بھی قرص کے ساتھ گردش کرے گا - اور اُسے محسوس هوگا - که مرکز کي مخالف سمت میں اُس پر کوئي قوت متواتر عمل کر رهی هے -

اب فرض کریں ' که کوئي اور ناظر ' ب ' نیچے سے قرص کو دیکھ رها هے - قرص کو گھومتے دیکھ کر یه وہ قرار دیگا ' که ' ا ' گردش کر رها هے - اور گردش کی وجه سے قوت کا عمل محسوس کرتا هے - فی الواقع اُس پر کوئی قوت عمل نهیں کرتي -

'ا' سمجھتا ہے کہ اُس پر قوت عمل کر رہی ہے' یعنی وہ میدان تجاذب میں ہے - لیکن 'ب' کے مشاہدے کے مطابق 'ا' دائرے میں گھوم رہا ہے - اور اپنی متغیر یعنی اسراعی حرکت کے اثر کو تجاذب کے نام سے موسوم کرتا ہے - ان باتوں کو پیش نظر رکھہ کر آئین سٹائین نے قیاس قائم کیا کہ قوت جاذبہ اسراعی حرکت سے پیدا ہوتی ہے اور کسی قسم کی قوت جاذبہ نہیں ہے -

انتہائے سطح

فرض کریں کہ سطح زمین پر ذی عقل مخلوقات آباد ہیں - جن کے دو بُعد یعنی سمتیں ہیں - یعنی اُن کی لمبائی چوڑائی تو ہے' مگر بلندی نہیں - وہ سمجھیں گے کہ زمین چپٹی ہے - اور سطح پر دو نقطوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے خط کو خط مستقیم قرار دیں گے - اُن کے لئے سطح زمین تمام عالم ہوگا جس کا انتہا اُن کے خیال میں ناممکن ہوگا - اس لئے کہ سطح کی کجی کے لئے تیسری سمت کی ضرورت ہے - جسے ہم اوپر نیچے کہتے ہیں - اور تیسری سمت دو بُعدوں والی مخلوق کے تصور سے بالاتر ہوگی -

جب وہ لوگ ایک محدود حلقے کے اندر دائرہ کھینچ کر اُس کے محیط اور قطر میں نسبت معلوم کریں گے تو نسبت ہمیشہ ۲۲/۷ نکلے گی - وہ اس پر ایک علم ہندسہ کی بنا رکھیں گے جسے غالباً اقلیدسی ہندسے کے نام سے موسوم کریں گے اور اپنی پیمائشوں سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ محدود حلقے کے اندر سطح اقلیدسی ہندسہ کے مطابق ہے -

اُس کے بعد وہ بڑے دائرے کھینچ کر محیط اور قطر کی نسبت نکالیں گے تو ۲۲/۷ سے کم ہوگی - اس لئے وہ قرار دیں گے

کہ وسیع حلقے میں سطح اقلیدسی ہندسے کے مطابق نہیں ہے -
پس اُن کی پیمائشوں کے مطابق وسیع حلقوں کی سطح محدود
حلقوں کی سطح سے مختلف ہوگي - لیکن یہ بات کبھی اُن کي
سمجھ میں نہ آئے گي کہ کیوں وسیع حلقوں کا علم ہندسہ محدود
حلقوں سے مختلف ہے -

چونکہ ہم تیسرے بُعد کو جانتے ہیں ' اس لئے ہمیں معلوم
ہے کہ وسیع حلقوں کے لئے ذُو بُعدین مخلوق کے علم ہندسہ کا
اقلیدسي ہندسہ سے احتلاف ' زمین کی کُرویت یا سطح کي کجی
کی وجہ سے ہے -

گھومنے والے قرص کا علم ہندسہ

فرض کریں کہ ناظر گھومنے والے قرص کے مرکز
پر کھڑا ہے - اور کسی اور آدمي کو اُس مرکز کے
گرد کسي دائرے کا محیط اور قطر ناپتے دیکھ
رہا ہے - جب وہ آدمي ناپنے کا پیمانہ یا گز محیط کے ساتھ
رکھے کا تو ناظر کو گز ' حرکت کي وجہ سے سکڑا ہوا دکھائی دیگا -
لیکن جب وہ گز قطر کی سمت میں ہوگا تو ناظر کو اُس کا
طول اصلي طول کے برابر نظر آئے گا - محیط کي سمت میں
گز کے سکڑنے کی وجہ سے محیط کا طول اصل سے زیادہ ہوگا -
مثلاً اگر قرص ساکن ہوتا اور اُس کا قطر ۱۰۰۰ گز ہوتا تو گھیر
کی لمبائي ۳۱۴۲ گز ہوتي - یعنی محیط اور قطر کی نسبت
$\frac{۲۲}{۷}$ ہوتی - قرص کے گھومنے سے محیط کي سمت میں گز چھوٹا
ہو جاتا ہے - اس لئے محیط کی لمبائی ۳۱۴۲ گز سے زیادہ
ہوگي - لیکن قطر وہی ۱۰۰۰ گز ہوگا - پس اس حالت میں
محیط اور قطر کی نسبت $\frac{۲۲}{۷}$ سے زیادہ ہوگی -

یه نسبت دائرے کے چھوتے بڑے ہونے پر بھي منحصر ہوگی - اگر دائرہ مرکز کے قریب ہوگا تو نسبت $\frac{22}{7}$ کے قریب ہوگي - لیکن اگر دائرہ بڑا ہوگا تو محیط اور قطر کی نسبت کا $\frac{22}{7}$ سے زیادہ اختلاف ہوگا - اس کی وجه یه ہے که جتنا کوئي مقام مرکز سے دور ہوتا ہے ' اُسي نسبت سے اُس کی حرکت تیز ہوتي ہے -

ان پیمائشوں کو دیکھ کر ناظر قرار دے گا ' که گھومنے والے قرص کا هندسه اقلیدسي نہیں - یعنی وہ اقلیدسی اصولوں کے مطابق نہیں - پس گھومنے والے قرص کي فضا منحنی غیر اقلیدسي ہوتي ہے -

میدان تجاذب میں فضا کا هندسه

یه بیان ہو چکا ہے ' که گھومنے والے قرص کی خاصیتیں میدان تجاذب کی سي ہوتی ہیں - جب قرص گھومتا ہے تو اُس کا علم هندسه غیر اقلیدسی ہوتا ہے - لیکن اگر قرص ساکن ہو جائے تو اُس کا هندسه اقلیدسی ہوگا - اس خاص مثال سے مندرجه ذیل باتیں اخذ ہوتی ہیں -

ا - ہر میدان تجاذب کا علم هندسه الگ ہوتا ہے ' جو اقلیدسی هندسه سے مختلف ہوتا ہے -

۲ - جس فضا میں تجاذب نہیں ہوتا ' اُس کا هندسه اقلیدسی ہوتا ہے -

پس میدان تجاذب میں فضا غیر اقلیدسي ہوتی ہے - اور چونکه ہر ایک مادّي جسم کا اپنا میدان تجاذب ہوتا ہے '

اس لئے مادہ اپنے گرد کی فضا میں تبدیلی پیدا کرتا ہے - یعنی اُس میں ایک طرح کی کجی پیدا کر دیتا ہے -

انحنائے کائنات

ہماری حالت کائنات میں وہی ہے جو ذو بُعدیں مخلوقات کی فضا میں - ہم فضا سے الگ نہیں ہو سکتے ' اس لئے چوتھے بعد کا نقشہ ہمارے تصور میں نہیں آسکتا - لیکن جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے - اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ کائنات کا وجود ہی نہیں ہے -

مسطح یا ہموار سطح کا علم ہندسہ اقلیدسی ہوتا ہے - لیکن منحنی سطح کا ہندسہ اقلیدسی ہندسہ سے مختلف ہوتا ہے - اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی فضا کا ہندسہ اقلیدسی ہو اور کسی کا غیر اقلیدسی - اگر فضا کا ہندسہ اقلیدسی ہو گا تو ہم کہیں گے کہ فضا میں کجی نہیں ہے اور اگر غیر اقلیدسی ہوگا تو منحنی سطح کی مثال کو پیش نظر رکھ کر ہم قرار دیں گے کہ فضا کسی چوتھی سمت میں منحنی ہو گئی ہے - پس فضا کے منحنی ہونے سے مراد یہی ہے کہ اُس کا ہندسہ اقلیدسی ہندسہ نہیں ہے -

آئن سٹائین کا عام نظریہ یہ ہے کہ جہاں کوئی جسم نہیں ہوتا ' وہاں فضا اقلیدسی ہوتی ہے لیکن جہاں کوئی جسم موجود ہوتا ہے - وہاں اُس کے اثر سے فضا غیر اقلیدسی ہو جاتی ہے - غیر اقلیدسی فضا میں خط مستقیم کا کھینچنا ایسا ہی ناممکن ہے ' جیسا کہ کروی سطح پر - گو ہم کو اپنے کھینچے ہوئے خطوں کی کجی نظر نہ آ سکے -

آئن سٹائین کا بیان ہے کہ میدان تجاذب میں اجسام کی اسراعی حرکت کسی قوت کی وجہ سے نہیں ہوتی' بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ اُس فضا میں انحنا یا کجی ہوتی ہے - ذیل کی تمثیل سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی -

فرض کریں کہ ایک کمرے میں صاف فرش ہے - اور فرش کی سطح ایسی ہے کہ اُس پر جہاں کہیں سنگ مرمر کی گیند رکھیں وہ لُڑھک کر ایک خاص مقام پر پہنچ جاتی ہے - پھر ٹینس کی گیند فرش پر رکھتے ہیں تو وہ بھی لُڑھک کر اُس مقام پر جا ٹھہرتی ہے - اُس کے بعد لوہے کی گولی پر تجربہ کرتے ہیں تو وہ بھی وہیں پہنچتی ہے - اگر کوئی دو بُعدوں والے لوگ گیندوں کو اس طرح لڑھک کر ایک معین مقام پر پہنچتے ہوئے دیکھیں گے تو وہ سمجھیں گے کہ اُس مقام پر کوئی پنہاں قوت ہے' جو گیند کو کھینچ لیتی ہے - لیکن ہم فرش کو ناہموار دیکھ کر گیند کے لُڑھکنے کی وجہ سطح کا ڈھالو ہونا قرار دیتے ہیں - اسی طرح جب ہمیں منحنی فضا میں اجسام اسراعی حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں' تو ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی پنہاں قوت اُن پر عمل کرتی ہے - اگر ہمیں کائنات کا احساس ہو سکتا تو قوتِ جاذبہ کی بجائے فضا کے انحنا کو اسراع کا سبب قرار دیتے -

ہر مادی جسم اپنے گرد کی فضا کو منحنی کر دیتا ہے - فضا کا انحنا جسم کی کمیت کے مطابق ہوتا ہے - اگر کمیت کم ہو تو اُس کے اثر سے فضا کی کجی کم ہوتی ہے اور کمیت زیادہ ہو تو اُس کی وجہ سے فضا زیادہ منحنی ہوتی ہے -

ہمیں فضا کی کجی نظر نہیں آتی ' لیکن دیگر اجسام پر اُس کا اثر نظر آتا ہے - جہاں فضا اقلیدسی ہوتی ہے وہاں ہر چیز یکساں رفتار کے ساتھ خط مستقیم میں حرکت کرتی ہے - لیکن جہاں فضا منحنی ہوتی ہے ' وہاں یا تو اجسام کی رفتار بدلتی جاتی ہے اور یا سمتِ حرکت -

عام نظریۂ اضافیت کی تجربی تصدیق

آئن ستائین کا دعویٰ فرضی نہیں ہے - بلکہ نظریہ کی مساوات سے مختلف اجرام سماوی کا اثر نکالا گیا ہے - اور اجرام کی حرکات کی توجیہ کی گئی ہے - گو آئن ستائین کا کُلیۂ تجاذب نیوٹن کے کُلیہ سے اصولاً مختلف ہے - لیکن اکثر قدرتی مظاہر کے متعلق اُن کے نتائج میں اتنا فرق نہیں ' کہ تجربہ سے معلوم ہو سکے - حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت سے قدرتی مظاہر کی ایسی ہی صحیح توجیہ ہو جاتی ہے ' جیسی کہ نیوٹن کے نظریئے سے - البتہ تین مظہروں کے متعلق آئین ستائین اور نیوٹن کے حساب میں اس قدر اختلاف ہے ' کہ مشاہدے سے معلوم ہو سکے - اور تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ آئین ستائین کے نتائج صحیح ہیں اور نیوٹن کے غلط - اب میں ان مظاہر کا مختصر ذکر کروں گا -

ا - "میدان تجاذب میں شعاعِ نور کا انحراف (Refraction)" - نیوٹن کے قانون تجاذب کی رو سے تمام مادّی اشیا دیگر مادّی اشیا کو اپنی طرف کھینچتی ہیں - لیکن تجاذب مادّی کا امواج پر کوئی اثر نہیں ہوتا - اس خیال کے مطابق اگر شعاع نور کسی جسم کے قریب سے گذرے تو وہ سیدھی جانی چاہئے ' اُس کا انحراف نہ ہونا چاہئے -

لیکن آئین سٹائین کے قیاس کے مطابق جسم کے گردونواح کی فضا منحنی ہوتی ہے ۔ اس لئے اس فضا میں سے گذرنے میں شعاعِ نور کو ضرور منحرف ہونا چاہئے ۔ شعاع کا انحراف جسم کی کمیت پر منحصر ہوگا ۔ جتنا بھاری کوئی جسم ہوگا ، اُسی نسبت سے اُس کے قریب کی فضا زیادہ منحنی ہوگی ، اور اُس میں سے گذر نے میں شعاع کا انحراف زیادہ ہوگا ۔ نیز جو شعاع جسم کے پاس سے گذرے گی وہ زیادہ منحرف ہوگی اور جو جسم سے ہٹ کر گذرے گی اُس کا انحراف کم ہوگا ۔ آئین سٹائین نے حساب لگایا کہ اگر کسی ستارے کی شعاعیں آفتاب کے پاس سے گذریں تو اُن کا انحراف ۱٫۷۵ ثانیہ ہونا چاہئے ۔

شکل نمبر ۲ میں ' س ' ستارے کا اصلی مقام ہے ۔ اور ' ن ' زمین پر کوئی ناظر کھڑا ہے ۔ ' ا ' آفتاب ہے ۔ ستارے کی جو شعاع
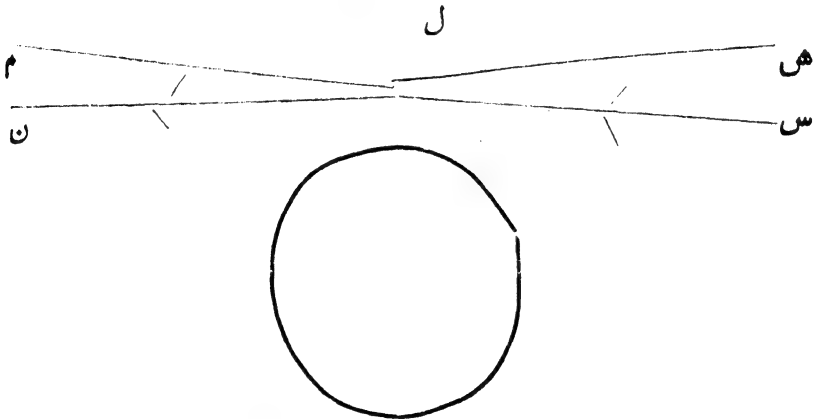
سیدھی ناظر کی سمت میں جائے گی وہ آفتاب سے رُک جائے گی لیکن شعاع "س ل" جو آفتاب کے کنارے کے ساتھ ہو کر گذرتی ہے، منحرف ہو جائے گی اور " ل م " سمت میں جانے کی بجائے " ل ن " سمت

میں جائے گی - ناظر کو ستارہ اسی سمت میں نظر آئے گا ' جس سے اُس کی شعاعیں ناظر کی آنکھ میں داخل ہوں گی - پس ستارہ ' ن ل ش ' سمت میں دکھائي دیگا - یعني اُس کا مقام ' س ' کي بجاے ش ہو جائے گا -

سنہ ۱۹۱۹ع کے کسوف کلی[1] (Total eclipse (Solar میں آفتاب کے قرب و جوار کے ستاروں کي عکسي تصویریں لي گئیں - ان تصویروں میں ستاروں کے جو مقام تھے ' اُن کا اصلي مقاموں کے ساتھ مقابلہ کیا گیا - تو معلوم ہوا کہ ستارے قرص آفتاب سے کسي قدر دور ہٹے ہوئے ہیں - ان تصویروں کا اصلي تصویروں کے ساتھ مقابلہ کرکے مختلف ستاروں کي شعاعوں کا انحراف ناپا گیا ' تو وہ آئین سٹائین کے حساب کے مطابق نکلا -

۲ - " طیف کے خطوط کا انتقال " - اگر کوئی عنصر گیس کی حالت میں ہو ' اور اُسے منور کیا جائے ' تو اُس کے ذرّے معیں رفتاروں کے ساتھ ارتعاشی حرکت کرتے ہیں - اس لیے اگر اس روشني کا طیف[2] مشاہدہ کیا جائے تو روشن خطوط نظر آتے

---

۱ - جب چاند سورج اور زمین کے درمیان حائل ہوتا ہے ' تو سورج گہن یا کسوف واقع ہوتا ہے - زمین کے تھوڑے سے حصّے سے سورج کي روشني بالکل منقطع ہو جاتي ہے ' وہاں کسوف کلّي (Total eclipse (Solar) ہوتا ہے - سنہ ۱۹۱۹ م میں عکسی تصویریں لینے کے لئے اُن مقامات کو جہاں کسوف کلي واقع ہوا ' رصاّد بھیجے گئے تھے -

۲ - اگر آفتاب کي روشني باریک شگاف میں سے گذر کر منشور (Prism) پر پڑے تو وہ سات رنگوں میں تقسیم ہو جاتي ہے - یہ روشني دیوار پر پڑے تو ایک رنگین دھاري بن جاتي ہے ' جسے آفتاب کا طیف (Spectrum) کہتے ہیں - طیف کي پیدائش

هیں - ہر روشن خط ایک خاص ارتعاشی حرکت سے وابستہ ہے ،
اور طیف میں اُس کا مقام تعدّد ارتعاش پر منحصر ہوتا ہے -
آئین سٹائین کے نظرے کے مطابق تیز میدان تجاذب میں ارتعاشی
حرکت سست ہوجانی چاهیے یعنی ذرّوں کے ارتعاش کا وقت
بڑھ جانا چاهیے -

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بہت سے ارضی عناصر آفتاب پر
بھی موجود هیں - اس لیے اگر ہم کسی عنصر کا روشن خط
طیف میں معین کریں اور پھر آفتاب کے طیف میں اسی عنصر
کا خط مشاهدہ کریں ، تو اُس کا مقام ارتعاشی حرکت کی سستی
کی وجہ سے سرخ حصہ کی طرف هٹا ہوا ہوگا - اور خط کا
انتقال آفتاب کے تجاذب پر منحصر ہوگا -

سنہ ۱۹۲۷ میں اپور شیڈ نے دریافت کیا کہ آفتاب کے طیف
کے خطوط کا انتقال آئین سٹائین کے حساب کے مطابق ہے - پھر
یہ تجربہ اور ستاروں کے خطوط پر کیا گیا تو آئین سٹائین کے
نظرے کی مزید تصدیق ہوگئی -

۳ - ” عطارد کی حرکت “ - نیوٹن اور آئین سٹائین کے
نظریوں میں عطارد کی حرکت کے متعلق بھی اختلاف ہے اور عطارد
کی حقیقی حرکت آئین سٹائین کے نظرے کے مطابق ہے -

اور امتحان کے لئے ایک آلہ استعمال کرتے هیں - جس کا نام طیف نما
(Spectrometer) ہے -

ہر رنگ کی روشنی ذروں کے معین ارتعاشات Vibration سے پیدا ہوتی ہے - سورج کی
روشنی میں سات رنگ پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے - کہ وہ روشنی ذرات کی مختلف قسم کی
حرکات پر مشتمل ہوتی ہے - ہر ارتعاشی حرکت سے اس حرکت کے متعلق رنگ ظاهر
ہوتا ہے - مثلاً نیلے رنگ کے ارتعاشات سرخ رنگ کے ارتعاشات سے تیز تر ہوتے هیں -

وسعتِ عالم

پرانے اعتقاد کے مطابق فضائے بسیط کی صرف یہی خاصیت تھی اور وہ چاروں طرف لا انتہا فاصلے تک پھیلی ہوئی ہے - لیکن ستاروں کے مشاہدے سے علمائے ہیئت نے بہت مدت پہلے دریافت کر لیا تھا کہ مرئی عالم لا منتہی تک پھیلا ہوا نہیں ہے - یعنی وہ فضا جس میں ستارے واقع ہیں ایک معیّن حلقے کے اندر ہے - اگر فضا لا متناہی ہو' تو اس بات کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی - کہ کیوں ستارے ایک معین علاقے سے' باہر نہیں جاتے - اُنہیں فضا میں ادھر اُدھر بکھر جانا چاہیے تھا - اس معمے کے حل کی ایک صورت ہے - کہ عالم کے حدود نہ ہوں' لیکن حجم معین ہو -

غور کیا جائے' تو عالم کے حدود نہ ہونے کے باوجود اُس کا منتہی ہونا نا ممکن نہیں - دائرے کی نہ ابتدا ہوتی ہے اور نہ انتہا - لیکن طول معین ہوتا ہے - کُروی سطح کے حدود نہیں ہوتے لیکن رقبہ معین ہوتا ہے - اگر فضا بھی دائرے یا کُروی سطح کی طرح منحنی ہو تو پھر محدود ہونے کے باوجود اُس کا حجم معین ہو سکتا ہے -

آئین‌ستائین کے حساب کے مطابق عالم کے تمام اجرام کی متحدہ قوت کے عمل سے فضا منحنی ہے - اور چونکہ فضا کا یہ انحنا کم ہے - اس لئے ستاروں کے درمیان وسیع علاقوں میں وہ تقریباً مستوی یعنی اقلیدسی هندسے کے مطابق ہوتی ہے - اسی طرح جس طرح کہ زمین کی سطح محدود علاقوں میں مستوی معلوم ہوتی ہے - اس انحنا کے علاوہ ہر ایک ستارے کی اپنی قوت جاذبہ سے فضا میں مقامی انحنا بھی پیدا ہوتا ہے - لئے اس آفتاب کے قریب کی فضا منحنی معلوم ہوتی ہے -

یہ سمجھیں کہ عالم ایک وسیع کُروي سطح کي مانند ہے - جس پر ستاروں کے گرداگرد چھوٹے چھوٹے تھلے ھیں -

جب زمین کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ وہ چپٹي ہے - تو لوگوں کا خیال تھا کہ وہ لامتناھی بھی ہے - لیکن جب ثابت ھو گیا کہ زمین کُروي ہے تو پھر لوگ سوچنے لگے کہ وہ متناھي ھوني چاھئے - گو اُس کے حدود نہ ھوں - اب ھمیں معلوم ہے کہ زمین متناھی ہے - اسی طرح فضا بھي متناھي ہے - گو اُس کے حدود نہیں ھیں -

ڈاکٹر آئین‌سٹائین نے عالم میں ستاروں کی تقسیم سے عالم کي وسعت کا اندازے لگایا ہے - اور اس اندازے کے مطابق کل عالم کا نصف قطر ۸۸۰۰ کروڑ سال نور ہے - یعني اتنا بڑا ہے کہ روشنی ۱۸۶۰۰۰ میل في ثانیہ کی رفتار سے اُسے ۸۸۰۰ کروڑ سال میں طے کر سکتي ہے - بعید تریں سحابیہ کا فاصلہ اس کا $\frac{1}{۹۰۰}$ حصہ ہے - پس ھمیں کُل عالم کا صرف $\frac{1}{۹۰۰}$ حصہ اعلیٰ سے اعلي دوربین میں نظر آتا ہے -

آئین‌سٹائین کے تصور کے مطابق فضا کُروي ہے - لیکن کائنات جو فضا اور زمانے کی ترکیب سے بنی ہے ' استوانہ نما ہے (Cylinderical) ہے - گویا زمانے کے کسي خاص لمحے پر کائنات کی تراش کُرہ کی مانند ہے اور زمانہ استوانہ کے محور (Axis) کی سمت ہے -

چونکہ چار بُعدوں کے سلسلے کا تصور مشکل ہے - اسلئے کائنات کا ایک نا مکمل سا نقشہ قائم کرنے کے لئے فضا کي بجائے ایک خط رکھ لیں - پرانے عقیدے کي رو سے یہ خط مستقیم ھوتا اور دونوں طرف لا انتہا فاصلے تک پھیلا ھوتا - اور کائنات ایک لا متناھی سطح ھوتی - آئین‌سٹائین کے نظرے کے مطابق خط ایک محدود دائرہ ہے اور کائنات جو دائروں کو قطار میں ساتھ ساتھ رکھنے سے حاصل ھوتي ہے - ایک استوانہ ہے -

انسان کے حواس نہایت محدود ھیں - لیکن اُس کے دماغ کی عظمت ملاحظہ ھو ' کہ ایک طرف تو وہ جوھر یعنی جزو لا یتجزي (Integral part) کا بھی تجزیہ کرکے برقئے تک جاپہنچا ھے - اور دوسري طرف مرئي عالم کے حدود سے گذر کر تمام عالم پر حاوي ھوگیا ھے - اور اُس پر یہ حقیقت آشکارا ھوگئی ھے ' کہ ننّھے برقئے سے لیکر وسیع عالم تک سب چیزیں ایک سادہ نظام کے ذریعے مربوط ھیں -

---

دو بے قبر کے مقبرے

(از مولوی سیّد مقبول احمد صمدني صاحبِ " حیاتِ جلیل ")

هندستاني کے صفحات پر مقبرۂ شاہ بیگم[1] اور مقبرۂ خسرو[2] کا ذکر آچکا ہے - اب خسرو باغ کی دو عمارتیں رہ جاتی ہیں ؛ جن میں قبر تو نہیں مگر مقبرے کہلاتي ہیں - ایک تو شروع ہی سے آباد نہیں ہوئی نہ کسی کے جسد خاکي نے اُس میں ٹھکانا پایا تھا - دوسری آباد ہوکر ویران ہوگئی - مدفن تھی - مسکن بنی - اِس وقت اِن کی تعمیری خوبیوں یا خامیوں اور کوتاہیوں سے بحث کرنا مقصود نہیں ؛ بلکہ صرف اُسي پہلو پر نگاہ ڈالنا مد نظر ہے ' جو علمي و ادبی یا کسی نہ کسی معنی میں تاریخی سمجھا جاتا ہے - (خدا کرے کوئی باکمال صاحب قلم اس طرف توجہ فرمائے اور صفحات کاغذ پر باقي رہ جانے کے لئے باقي اشعار کو بھي تحقیق کرکے پورا کردے) -

(۱) سلطان نثار بیگم کا گنبد -

ہر سمت اور ہر حساب سے یہ دوسرا مقبرہ ہوتا ہے ' اور اُن

---

۱ - ملاحظہ ہو - رسالہ ' حصہ ۴ ' جلد اول - اکتوبر سنہ ۱۹۳۱م ' صفحات ۵۴۸ - ۵۵۲ -

۲ - ملاحظہ ہو رسالہ حصہ اول جلد ۳ - جنوری سنہ ۱۹۳۳م - صفحات ۱۸ لغایت ۴۰ -

دونوں مقبروں کے درمیان واقع ہے - اس کے ایک جانب خسرو کا مقبرہ ہے اور دوسری طرف شاہ بیگم کا - اس کا فصل ہر ایک سے بقدر تیس (۳۰) قدم کے ہوگا - نخلبندان زیب و تزیین کے زر پاش و فیض بخش ہاتھوں کی بدولت یہ فصل (رقبۂ زمین) بھی خالی اور بیکار نہیں چھوٹنے پایا ' بلکہ اس میں دونوں طرف دو خوشنما سنگین حوض ' ہشت پہل بنادئے گئے ہیں - کبھی صاف شفاف پانی سے لبریز رہتے تھے - پاس کے کنویں آب رسانی کرتے تھے - فوارے چلتے تھے - آبشار اور نالیوں کا ظاہری سلسلہ و انتظام تو اب بھی باقی ہے ' مگر بے سود و بے مصرف - اپنی حالت اور کس مپرسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے - حوض خشک پڑے ہیں ؛ فوارے بند - البتہ ان میں کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو گلکار و منقوش رخام کی جگہ سادہ پتھر لگتا ہے یا صرف چونا - پیوند بدنما ہوتے ہیں اور نازیب -

یہ مقبرہ وسط باغ میں بڑے دروازے کے مقابل ہے - یہی کرنیل نیوبل کے حساب سے دوسرا ہوتا ہے[1] اور مسٹر بیل کی تحریر سے تیسرا[2] اوروں کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹا ہے - یہ جسمانی کسی ایک معنوی حیثیت یعنی اس کے بلند و سبق آموز اشعار و قطعات کی افراط و کثرت سے پوری کردی گئی تھی - زمانے کے جفاکار ہاتھ نے ان کو بھی برقرار و قائم نہ رہنے دیا -

پریاگ ہینڈ بک میں لکھا ہے کہ پورب والا مقبرہ خسرو کا

---

۱ - ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید ' صفحہ ۲۰۳ -

۲ - مفتاح التواریخ ' صفحہ ۳۳۵ -

هے اور تیسرا اس خاندان کے اور بچوں کا[1] مولف کتاب کی مراد کس تیسرے (مقبرے) سے ہے - ؟ وہ بچے کون تھے اور کس کس کے ؟ ان کی قبریں کہاں تھیں ؟ کیا ہوئیں ؟ اِن کا نہ لکھنا لکھنے والے کی عدم واقفیت اور کوتاہی تحقیق کو عالم آشکار کرتا ہے -

یہاں کے بعض خادمان بلا خدمت و بلا مخدوم اسکو خسرو کی بیوی کا مقبرہ بتاتے ہیں' اُس کا نام لیلیٰ بیگم دختر شاہ نواز خاں - تاریخ کی زبان اس بارے میں قطعاً خاموش ہے' اس کی تصدیق سے عاجز ہے -

انگریز مورخوں اور اُن کے خوشہ چین ہمارے اہل وطن کی روایت یہ ہے کہ یہ مقبرہ خسرو کی ایک بہن نے ۱۰۳۴ھ (سنہ ۱۶۲۵ ع) میں اپنے لئے تعمیر کرایا تھا' مگر اتفاق سے بیگم نے کسی اور جگہہ انتقال کیا' اور وہیں دفن ہوئی' اس لئے یہاں اُس کی جگہہ خالی رہی - بہت سے اشعار گنبد کے اندر اور باہر لکھے تھے جو گردش روزگار سے مٹ گئے ہیں[2] - ڈسٹرکٹ گزیٹیر والے بھی اس کی تائید' یا اسی کو نقل' کرتے ہیں - مسٹر اسٹیل اس کو جہانگیر کی راجپوت ملکہ کی بہتی کی قبر بتاتے ہیں[3] - کرنیل نیویل فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سے کتابے لگے ہیں لیکن اکثر اب شکستہ حالت میں ہیں[4] -

---

۱ - صفحہ ۵۳ -

۲ - مفتاح التواریخ مولفہ مسٹر بیل' صفحہ ۳۳۵ - ڈاکٹر ہوہرر' صفحہ ۱۳۰ - قاموس المشاہیر' صفحہ ۲۹۷ -

۳ - گزیٹیر ضلع الہ آباد - سنہ ۱۸۸۴ع' صفحات ۱۳۸ و ۱۶۹ -

۴ - گزیٹیر جدید' صفحہ ۲۰۳ -

اگر یہ قول اور ان فرزانگان فرنگ کا قیاس صحیح ہے تو یہ شاہزادی ، شاہ بیگم کی بیٹی تھی[1] اور خسرو کی ہمشیر[2] شاید انہیں تعلقات قلبی کے داعیے اور محبت و خون کے جذبے سے اُس نے الہ‌آباد میں پیوند خاک ہونے کی آرزو کی ہوگی - یا خاک پاک پریاگ کی کشش رہی ہو - شریف‌الملک معتمد خان محمد هادی تزک (کے دیباچے) میں[3] اُس کا نام سلطان نثار بیگم لکھتے اور خافی خان محمد هاشم منتخب‌اللباب میں صرف سلطان بیگم تحریر کرتے ہیں[4] - تزک جہانگیری اور تذکرۂ خسرو (مولفۂ راقم) سے پایا جاتا ہے کہ وہ جہانگیر کی پہلی بیوی سے تھی اور اُن کی اولاد میں سب سے بڑی یعنی پہلوٹھی[5] - مسٹر پرایس تاریخ جہانگیر میں ناقل ہیں کہ سلطان نثار بیگم خسرو سے سال بھر بڑی تھی - ایک سال پیشتر فوت ہوئی - اُس نے خسرو باغ الہ‌آباد میں اپنے لئے مقبرہ بنوایا تھا ، مگر وہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا - اُس نے ۴ شعبان سنہ ۱۰۵۶ ھ مطابق ۵ ستمبر سنہ ۱۶۴۶ ع کو وفات پائی اور اپنی خواہش و وصیت کے مطابق اپنے دادا کے مقبرے واقع سکندرہ

---

۱ - اویماق مغل ، صفحہ ۴۸۳ -

۲ - جہانگیر نامہ خواجہ ابوالحسن معتمد خاں بخشی ، صفحہ ۲۷۷ - قاموس‌المشاہیر ، صفحہ ۱۳۹ -

۳ - تزک جہانگیری ، صفحہ ۷ - دیباچہ تزک ، صفحہ ۷ - دیباچہ تزک انگریزی ، صفحہ ۹ -

۴ - جلد اول ، صفحہ ۲۴۵ -

۵ - ترجمہ از مسٹر بیوریج صفحہ ۱۵ -

میں سپرد خاک کی گئی[1] - بادشاہ نامہ سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے[2] - مسٹر بیل نے اوریئنٹل بیوگرفیکل ڈکشنری[3] میں ' مرزا امینا (مرزا امین) نے بادشاہ نامہ[4] میں اور مسٹر بیوریج نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے[5] میں اُس کے حالات بقدر ضرورت درج کئے ہیں - بیوریج صاحب اپنے نوٹ میں اضافہ فرماتے ہیں کہ اس کا اصلی نام سلطان النسا تھا - اکبر نامہ[6] میں اس کی ولادت کا ذکر ہے - ۶ اُردی بہشت سنہ ۹۹۴ مطابق ۲۶ اپریل سنہ ۱۵۸۶ ع کی شام کو پیدا ہوئی تھی - اُس کی ماں راجہ بھگوان داس کی بیٹی اور راجہ مان سنگھ کی بہن مانی اور سمجھی جاتی تھی - سلطان نثار باپ سے پہلے مری تھی - باپ سنہ ۱۰۳۴ ھ[7] یعنی سنہ ۱۶۲۷ ع میں

---

۱ - صفحہ ۲۰ -

۲ - یہ ہی نہیں - سلیمان شکوہ پسر شاہ عالم بھی یہاں سنہ ۱۸۳۸ع میں دفن ہوئے تھے - اُن کی دو بیگمیں بھی یہاں راحت گزین ہیں - ڈاکٹر فوہرر ' صفحہ ۷۷ -

۳ - صفحہ ۳۹۲ -

۴ - جلد دوم ' صفحات ۴۰۳ و ۴ - بادشاہ نامہ خود شاہجہاں نے نام رکھا تھا - مرزا صاحب درباری مورخ اور شاہجہاں کے منشی تھے -

۵ - بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء ' صفحہ ۶۰۷ -

۶ - جلد سوم ' صفحہ ۴۹۳ -

۷ - شاید کتابت کی غلطی ہے - جہانگیر کی وفات ۲۸ صفر سنہ ۱۰۳۷ روز یکشنبہ ہے - از جہانگیر نامہ ' صفحہ ۲۶۵ -

فوت ہوا ہے - تاریخ جہانگیر میں مسٹر گلیڈون اس کا نام سلطان النسا اور سال پیدایش ۱۵۸۶ع لکھتے ہیں[1] -

شاہزادی کی تاریخ وفات کے بارے میں جو اختلاف ہے اُس کو رفع کرنے یا صحت و تحقیق کا یہاں موقع نہیں، نہ ضرورت ہے - البتہ بہشت آباد (سکندرہ) میں اُس کے دفن ہونے کی روایت پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے - مولوی سعید احمد تاریخ آگرہ میں فرماتے ہیں "اس کمرے (مرقد اکبرِ اکبر) کے برابر والے دوسرے کمرے میں جو خوشنما جالیوں اور فرش اور تعویذ سے مُزین ہے ایک قبر ہے .... اس میں جہانگیر بادشاہ کی بڑی لڑکی سلطان النسا بیگم دفن ہیں جو شاہزادۂ خسرو کی بہن تھیں - ان کا انتقال ۴ شعبان سنہ ۱۰۵۶ھ کو بعہد شاہجہاں بادشاہ ہوا تھا[2] -"

پیٹر منڈے صاحب نے اس کو سنہ ۱۶۳۲ع میں دیکھا اور نامکمل پایا تھا - لکھتے ہیں کہ مقبرہ نیا بننا شروع ہوا ہے[3] - پروفیسر بینی پرشاد فرماتے ہیں "مگر یہ صحیح نہیں ہے - اس لئے کہ مادۂ تاریخ 'روضۂ پاک' سے جو مقبرہ پر تحریر ہے سال ہجری ۱۰۳۴ نکلتا ہے' جو سنہ ۱۶۲۵ع کے مطابق ہے[4] -" میرے خیال میں کسی توضیح کی ضرورت نہیں - ۱۰۳۴

---

۱ - صفحہ ۱۶۰ -

۲ - مرقع اکبرآباد' صفحہ ۱۵۸ -

۳ - سیاحت نامہ' جلد دوم' صفحہ ۱۰۰ -

۴ - تاریخ جہانگیر' صفحہ ۳۳۹ نوٹ -

سال بِنا یعنی عمارت کي بنیاد پڑنے یا شروع ہونے کا ہے - ختم تعمیر کا نہیں -

مفتاح التواریخ میں مرقوم ہے کہ گنبد کے اندر بہت سے اشعار خوشخط نستعلیق میں لکھے ہیں - لیکن بعض کہن سالی و گردش روزگار سے مٹ گئے ہیں[1] - سو برس گزرے مسٹر بیل کو اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ بھی بعض کو پڑھنے اور پڑھوانے سے قاصر رہے تھے - اس لئے اسیقدر لکھدینے پر اکتفا کیا تھا ''جہاں تک پڑھا جاتا ہے پہلا مصرع یہ معلوم ہوتا ہے - خرّم آنروز کہ ما رخت ازین خانہ بریم - اس گنبد کی تعمیر کا قطعۂ تاریخ تین شعروں کا تھا جو دروازے کی پیشانی پر کندہ تھا ' مگر پہلا شعر یا مطلع بالکل پڑھا نہیں جاتا - باقي دو شعر یہ ہیں'' جو اُبھرے ہوئے حروف میں لکھے ہیں - ان کے گرد موقع موقع سے سبز رنگ کي گلکاری ہے -

برو ملائکِ رحمت همیشه نور نثار	ز هے نمونۂ خلد برین بمرکز خاک
خرد ز سال بنایش بصفحۂ فکرت	نوشت با قلم اختراع روضۂ پاک

۱۰۳۴ = ۱۶۲۵ ع

کتبه فقیر سلطان سرهندی

پورے وثوق کے ساتھ تو شاید وہ خود بھی نہیں کہہ سکے کہ یہ مقبرہ کس کا ہے اور کس ضرورت سے تعمیر ہوا تھا ' لیکن مسٹر بیوریج کا خیال یہ ہے کہ اس قطعہ میں لفظ ' نثار ' سے سلطان نثار بیگم کے نام کي طرف اشارہ ہے[2] - اُس کي ماں

---

۱ - صفحہ ۳۳۶ -

۲ - جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹي ' جولائي سنہ ۱۹۰۷ م ' صفحہ ۶۰۷ ' نوٹ نمبر ایک -

راجه بهگوان داس کی بهتیجی تهی ، مان سنگهه کی بهن مانی اور سمجهی جاتی تهی - مسٹر ڈیوهرسٹ فرماتے هیں که اس کی بحر معمولی وزن کی 'مُجتَث' هے[1] - یه ادراک تو چنداں بڑی بات نهیں - لیکن ایک یوروپین ملکی عهدے دار کی فن عَروض پر ایسی گهری نظر اور اطلاع ضرور حیرت انگیز هے - میرے هم وطن ، فارسی اُردو کے ممتاز سخنور اِن شاعرانه نزاکتوں اور فن کی باریکیوں سے کتنے آگاه هیں - موصوف نے تیسرے یعنی پهلے شعر کی نسبت کچهه تحریر نهیں کیا - مذهبی خدمات کے سلسلے میں وه کچهه دن الهآباد میں قیام فرما رهے تهے - یهاں کی عمارات و مقابر اور اُن کے کتبوں کے متعلق سعی و تلاش کی تهی - افسوس هے که باقی مانده متے اور بگڑے هوئے شعروں کو وه بهی دریافت نه کرسکے -

مسٹر بهوریج نے اپنے قابل قدر مقالے میں لکها هے که خسرو کی همشیر سلطان‌النسا کی قبر پر به تفصیل ذیل کتبے هیں -

شمال کی طرف ، اوپر -

دو قطع تعلق بکن امروز که فردا
آسوده ز افلال و ایمن ز سلاسل
از خود گزر اے یار و بدو رس که کسے نیست
غیر از تو میان تو و مقصود تو حائل

دکهن ، دروازه پر -

گر همه مملکت و مال جهاں جمع کنیم
ما بجز پیرهنے هیچ ز دنیا نه بریم

---

۱ - جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ، جولائی سنه ۱۹۰۹ع ، صفحه ۷۳۸ -

بادشاها تو کریمي و رحیمی و غفور
دست ما گیر که در ماندهٔ و بےبال و پریم
در شارع دین کوہ صفت سلگی و کاهل
دوسـرا مصـرع غـائـب ہے
تن دہ برضا کانچه قضا بر تو نوشت است
از تو نشود دفع بہ تدوید و حمائل
حق را بشناس از نظر چشم و دل و گوش
کاین ها همه بر قدرت حق اند دلائل

مسٹر ڈیوهرسٹ کا ارشاد هے کہ پہلي بیت میں جو مصرع ' در شارع دین ' والا بیوریج صاحب نے نقل کیا ہے ' وہ دراصل مصرع دوم ہے یعنی شعر کا نصف اخیر - اس لئے کہ اس میں قافیہ اور حرف رَوِی موجود ہے - اسي طرح شعر کا پہلا مصرع بھي غلط تحریر ہوگیا ہے -

مسٹر ڈیوهرسٹ نے ان کتبوں اور اشعار پر کامل غور و مطالعہ کے بعد رائے زنی فرمائي ہے[۱] - اس لئے پوری تفصیل کے ساتھ اُس کو درج کردینا ضروري معلوم ہوتا ہے -

'' تیسري عمارت کے کتبے بدنصیبي سے نہایت نا مکمل اور بڑي ناقص حالت میں ہیں - عملي طور پر یہاں چار کتبے پائے جاتے ہیں - ایک تو چھوٹا سا جنوبی دروازے پر ' جس سے سنہ ۱۰۳۴ هجري تاریخ نکلتی ہے - [برو ملائک رحمت - تا - روضۂ پاک] عمارت کے مربع کے اندر دو لائنیں کتبوں کي ہیں جو گردا گرد یعني چاروں

---

۱ - جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹي ' جولائي سنہ ۱۹۰۹ صفحہ ۷۳۷ -

طرف دوڑتي چلی گئي هيں - اوپر والي قطار تقريباً بيس فت اور نيچے والی قريب نو فت کے فرش عمارت سے بلندي پر هوگی - اوپر والي دو ميں ايک هي نظم بحر ‥ ‥ ‥ هزج Catalectic ميں تهي - اس ميں زحافات بهی تهے جو حزب اور کف کہلاتے هيں .. ان کا حرف رَوِی ' ل ' تها - ابتداءً اُس ميں سوله بيتيں تهيں - اِن ميں سے اس وقت کلاً يا جزءاً صرف دس محفوظ هيں .. نيچے والي قطار ميں دو جـدا جدا نظميـں تهيں - پهلی بحر رَمَل ميں جس کا حرف روی ' ميم ' تها - دوسری معمولي ‥ ‥ ‥ Catalectic هزج ميں - اور اُس کا حرف روي '' الف '' تها - پهلي نظم ميں ابتداءً آتهه شعر تهے - ان ميں سے دو اس وقت پورے پورے موجود هيں - باقی دونوں ميں سے پهلا آدها اور ايک جز و نصف دوم کا رخصت هوچکا - دوسري نظم اس سے بهي زيادہ مت چکی هے - يعني ابتداءً دس شعر تهے ' ان ميں سے صرف ايک ثابت و برقرار رہ گيا هے - تين شعر اور تهے ' جن کا تقريباً نصف نصف موجود هے - ان دونوں ميں سے پهلی نظم کی سارهے چهه بيتوں کو ' غت ربود ' (خلط ملط) کرديا هے اور ايک دوسرے کے مختلف اجزاء اِدهر اُدهر لگادئے هيں -

دوسری نظم فارسي کے مشهور شاعر خاقانی کی غزل هے جو اُس کي کليات مطبوعۂ لکهنؤ کے صفحه ۱۳۹ ميں موجود هے -

پوري غزل يه هے -

۱ وقت آنست کزين دار فنا در گزريم

کاروان رفـتـۂ و ما بر سر راہ سفريم

۲ راد رہ هيچ نداريم چه تدبير کنيم

سـفـرِ دور دراز ست ولے بے خبريم

۳ پدر و مادر و فرزند و عزیزان رفتند
وہ چه ما غافل و مستیم چه کوته نظریم

۴ دم بدم می گزرند از نظر ما یاران
اینقدر دیدہ نداریم که بر خود نگریم

۵ خانهٔ و خانقهٔ و منزلِ ما زیر زمین
ما به تدبیر سرا ساختن و بام و دریم

۶ خانهٔ اصلي ما گوشهٔ خوابستان است
خُرّم آن روز که این رخت بدان خانه، بریم

۷ گرهمه مملکت و مال جہاں جمع کنیم
لیک جز پیرهن گور ز دنیا نبریم

۸ بادشاها تو کریمي و رحیمی و غفور
دست ما گیر که در ماندهٔ و بےبال و پریم

۹ یا رب از لطف و کرم عاقبت خاقاني
خیر گردان تو که ما در طلب خواب و خوریم

اس کا چھٹا اور ساتواں شعر اب تک کامل موجود ہے - البتہ چھٹے کا نصف دوم " ما بجز پیرهنے هیچ ز دنیا نه بریم " پڑھا جاتا ہے - چوتھے شعر میں " بر خود نگریم " آخر سے غائب ہے - کلیات کا پانچواں شعر غالباً کتبے میں شروع هی سے نہیں لکھا گیا تھا - چھٹے شعر کا نصف دوم جس کو غلطی سے بیل صاحب نے ان نظموں کا پہلا شعر سمجھا ہے ' اب بالکل نظر نہیں آتا - یہ امر قابل تحریر ہے که یه نظم اور دوسري اور جو اس کے اوپر ہے ' اور خسرو کي قبر کا کتبه ' سب کے سب عمارت کی پچھم سمت کے وسط سے شروع هوتي هیں - یعني کعبے (مکه) کا رخ ملحوظ رکھا گیا ہے -

۷۶۵ ع

تیسری نظم سے صرف ایک شعر پورا باقي رہ گیا ہے -

بگفتي حال شان بودی زبانِ سوسن ار گویا
چہ مي داند کسے حال گُل اندامان بزیر گلِ

تلاش کی جاے تو کسي نہ کسي مشہور شاعر کے دیوان میں اس عمارت کی باقی دونوں نظموں کا بھي پتہ چل جاے گا - ظاہر ہے کہ یہ کلام یا اس طرح کا معمولي شعرا کا نہیں ہوسکتا، جو محض تاریخیں نکالنے اور موزوں کرنے میں مشاق ہیں[1] " -

ان تینوں فاضل مستشرقین کی سعی و التفات قابل تشکر و اِمتنان ہے — مگر حقیقت یہ ہے کہ پوری کوشش کرنے سے اب بھی بعض مزید اشعار کا پتا چل سکتا ہے - اِسکے علاوہ کاتب وغیرہ کا نام بھی ملتا ہے — بہت سے شعر اور مصرعے بالکل محو و صحو ہورہے ہیں - بعض کے مصرعے اور الفاظ ادھر کٹے ہیں - نگاہ پر زور دینے اور فہم کی مدد سے ان بے نظم و ترتیب شعروں یا لفظوں کو جیسا کچھ میں پڑھ سکا ہوں، ذیل میں نقل کرتا ہوں شاید کوئي ذیعلم بزرگ توجہہ فرماکر بقیہ اشعار و مصرعوں کو بھی پورا کردے -

قدم نہِ بر سر ہستی کہ ہست مایۂ ادنا
* * * * * * *
... ... ہستی را و ترک خود فروشي کن
* * * کہ دربازار دیں خواہند
براق مکرر یک شب معراج حقیقت داں
* * * * بگوش سر جاں بشنو

---

۱ - جورنل رایل ایشیا ٹیک سوسائٹي، جولائی سنہ ۱۹۰۹ م صفحہ ۷۴۸

درخوردن و خفتن چه شوي همسر انعام

مـیکـن عملے تانشـوی کـم زهـواصـل

* * * * * * افسرد گر خود

زآهـن بـودت عرق و ز پولاد مفاصل

* * * * * * *

در شـارع] دین کوه صفت سنگی و کاهل

این طول امل چیست ندانی که زمانه

شد عمر ترا تابقهد .. .. معطل

ازنیست بہ هستی و بهستي بره نیست

تاشهر وجود است * * * *

(۲) مقبرہ تمبولن بیگم

باغ کے عین[۱] وسط میں مغرب جانب ایک چوتھا مقبرہ ' دروازۂ کلاں کے مقابل ' یا سڑک کے دوسری طرف ہے - بعض کہتے ہیں کہ یہ بھي خسرو کي کسی بہن کا ہے - اور عرف عام میں ' تمبولن ' یا بی‌بی تمبولن کا مقبرہ کہلاتا ہے - یورپین مورخین میں سے استیل ' فشر ' هیویت اور کین صاحبان کے نزدیک غالب قرینہ یہ ہے کہ یہ وهي شاهزادي ہے جو فتحپور سیکری میں استامبولی بیگم کے نام سے شهرت رکھتي ہے - اس کے اندر نہ قبر کا نشان ہے نہ اس پر کوئي کتابہ -

---

۱ - گزیٹیر سابق مطبوعہ سنہ ۱۸۸۴ع صفحہ ۱۶۵ - و گزیٹیر جدید سنہ ۱۹۱۱ع ' صفحہ ۲۰۳ -

کرنیل نہویل اس کے متعلق دو باتیں لکھتے ہیں[1] - (۱) روایتاً ایسا مشہور ہے کہ تمبولن کا مقبرہ ہے - ممکن ہے کہ یہ وہی فتحپور سیکری والی استانبولی بیگم ہو - (۲) دوسرا زباں زد قصّہ یہ ہے کہ یہ مقبرہ خسرو کی ایک اور بہن نے اپنے لئے بنوایا تھا - مگر اتفاق وقت سے وہ کہیں اور مری اور وہیں دفن ہوئی -

ڈاکٹر فوہرر مقبرہ نہیں ' بلکہ تمبولی بیگم کے مکان کے نام سے یاد فرماتے ہیں اور خسرو باغ کے خاص خاص حصوں میں اس کو شمار کرتے ہیں[2] -

ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی تاریخ جہانگیر میں رقم پرداز ہیں کہ ان تین روضوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا گیا ' اس باغ میں ایک چوتھی عمارت بھی ہے جو تمبولن کی قبر کہلاتی ہے - یہ اُنیسویں صدی میں مدت تک مسکن کا کام دیتی رہی - پھر لارڈ کرزن کے حکم سے اصلی صورت میں منتقل کر دی گئی[3] -

سو برس پہلے بھی مسٹر بیل کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ کس کا مدفن ہے - مشہور تھا کہ بی‌بی تمبولن کا روضہ ہے - بعض جودہ بائی کا بتاتے تھے[4] -

خادموں کی روایت یہ ہے کہ تنبولی بیگم ایک ایرانی عورت تھی - اُس کو جہانگیر ایران سے لے آیا تھا ' اور اسی کے ہاتھ کے پان کھاتا

---

۱ - گزیٹیر جدید سنہ ۱۹۱۱م ' صفحہ ۲۰۳ -

۲ - ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے صنادید قدیمہ اور اُن کے کتابے ' صفحہ ۱۳۰ -

۳ - صفحہ ۳۴۲ -

۴ - مفتاح التواریخ ' صفحہ ۳۳۵ -

تھا - عہد جہانگیری کا مورخ اس کے ماننے میں تامل کرے گا اور بداهتًہ لغو بتائے گا -

اس بارے میں کہ آیا اکبر کے حریم عشرت میں کوئی سلطانہ استامبولی بیگم تھی بھی ' یا نہیں ؛ شروع سے اِختلاف اور گُفتگو چلی آتی ہے - اہل فرنگ کی ایک جماعت اپنی دلبستگی اور جدّت طرازی کے لئے ہمیشہ مُصر اور مدعی رہتی ہے ' اور ہر محل پر اِستامبولی ملکہ اور اُسکے محل کا ذکر چھیڑ دیتی ہے - لفٹننٹ کرنیل ایچ اے نیویل " آگرہ میں تین دن ۱ " میں تحریر فرماتے ہیں ' کہ ترکش سلطانہ ' کا مکان نہایت مختصر مگر فتحپور بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے - مسٹر ہیویل نے بھی " آگرہ اور تاج کی ہینڈ بُک۲ " میں ترکش سلطانہ کے مکان کا احوال سپرد قلم فرمایا ہے " قرون وسطیٰ کی تاریخ " ۳ میں مسٹر سی ڈبلیو اسمتھ نے مغلیہ عہد کی تعمیرات کے ذیل میں " ترکش سلطانہ ' کے گھر کا نام لیا ہے -

مسٹر کین " آگرہ کی ہینڈ بک" میں فرماتے ہیں کہ فتحپور سیکری کے محلات میں عمارت کا ایک حصہ استا مبولی بیگم یعنی اکبر کی ترکن بیوی کے نام سے منسوب و مشہور ہے ۴— پھر ایک صفحہ آگے چل کر ایک نوٹ میں رقم پرداز ہیں کہ الہ آباد کے خسروباغ

---

۱ - صفحات ۹۶و۹۷ -

۲ - صفحہ ۱۱۳ -

۳ - صفحہ ۲۷۲ -

۴ - صفحہ ۶۹

میں جو مقبرہ ہے، اور تمبولی بیگم کا کہلاتا ہے، ممکن ہے کہ یہی بگاڑ کر استامبولی کر دیا گیا ہو[1] -

ڈاکٹر فوہرر فتح پور سیکری کے محلات و تعمیرات کے سلسلے میں کچھ زیادہ روشنی ڈالتے اور تحریر فرماتے ہیں[2] کہ " خاص محل کے مغربی زاویے پر ایک عمارت ہے جو 'جہانگیر کا مدرسہ' کہلاتی ہے - جہاں سے ایک منقّش پردہ دار دیوار کے باقیات و آثار شروع ہو جاتے ہیں، جو ٹھیک پورب کو زاویۂ مخالف کی سمت جاتے ہیں - یہاں پر اکبر کی ترکن بیوی کے کمرے تھے، جو رومی بیگم کا محل مشہور ہے - واضح رہے کہ زبانی روایات کو چھوڑکر کوئی سند اس بات کی نہیں ملتی ہے کہ اکبر کی کوئی عورت ترکن بھی تھی یا یہ کہ کوئی عیسائیہ رہی ہو - الہ‌آباد کے خسرو باغ میں ایک مقبرہ ہے، جو تمبولن بیگم کا کہلاتا ہے؛ اور بلا بگاڑکر 'استامبولی' کر لیا گیا ہے - اور اِس طرح اِس راز کا پتہ یہاں سے چل جاتا ہے[3] " -

مسٹر کین اور ڈاکٹر فوہرر نے اِستامبولی کو غلط اور تمبولی (بیگم) کو صحیح سمجھا، اور مانا تھا - مگر ہمارے شہر (الہ‌آباد) کے ایک ہمہ دان پروفیسر نے اِسیکو صحیح قراردیا اور تائید کی ہے اور اپنے ایک آرٹکل[4] کے ساتھ ایک عشوہ باز، فتنہ‌گر، عربدہ جو 'عصمت باختہ' حسن فروش تمبولن کی

---

۱ - صفحہ ٦٩ -

۲ - صفحہ ۷۲ -

۳ - صفحہ ۷۳ - کتاب مزکور -

۴ - مندرجہ لیڈر - یکشنبہ ' ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ ع

تصویر بھی دیدي ھے جسکو لکھنؤ کے عجائب خانے میں میں نے بھي دیکھا ھے-یہ تسلیم ھے کہ ممدوح نے صاف طور پر اُسکو فتحپور سیکری کے محل والي یا اپنے یہاں کي مقبرے والی نہیں لکھا مگر ایسے موقع پر اِس لکھنوی تمبولن کا ذکر اور تصویر کیا کچھہ اور معنی رکھتي ھے ؟

آج کون بتا سکتا ھے کہ یہ عمارت کبھي واقعي آباد بھی ھوئي تھي اور کسي اِنسان کے جسم بے جان نے اِس میں راحت پائي تھي یا نہیں - یہ تو تسلیم ھے کہ ھماری سر زمین پر مغرب (یورپ) والے بھي مُردوں اور مرے ھوؤں کی ھڈیوں کا آج کل ویساھي ادب و اِحترام فرماتے ھیں ' جیسا مشرق (اِیشیا) کے لوگ کرتے ھیں - مگر شائد ایک صدي پیشتر حالت اور تھي - اُس وقت کے فرنگ نژاد بہادر زندہ دلوں کو ھندوستان کے تیرہ و تاریک مُردہ خانوں سے خاصا لگاؤ تھا - خواہ اِقتضاے ضرورت سے رھا ھو یا محض جذب نظر سے - یعني اچھي اچھی کوتھیوں اور فردوس نما بنگلوں کی کمي اِسکا باعث رھي ھو ' خواہ مقبروں کي عظیم اُلشان اور نفیس و خوشنما مر مریں عمارتیں انکو اپني طرف کھنچتی ھوں - یا اِنھیں کے دلوں اور آنکھوں میں کوئي کشش خود بخود پیدا ھو جاتي ھو - بہرصورت اوراق تاریخ اسکے گواہ ھیں کہ آنریبل ایست اِنڈیا کمپني کے بعض ملکي اور جنگي عہدہ دار باد شاھي وقت کے مقبروں کا بیکار پڑا رھنا دیکھہ نہ سکتے تھے - بعض کو اپنے رھنے سہنے کے لئے اِنتخاب فرمالیا تھا - یاد ھوگا کہ سرولیم سلمي مین اپني خوش ذوق و خوش فکر رفیقۂ حیات کو ساتھہ لے کر ممتاز محل (تاج) کے روضہ کی سیر کو گئے تھے - اپنے " سیاحت نامہ و تذکرہ " میں لکھتے ھیں کہ ,, میم صاحبہ جب خوب گھوم پھر کر سب کچھہ دیکھہ چُکیں ؟ تو میں نے پوچھا , کہو اِس عمارت کی نسبت تمھارا خیال کیا ھے ؟

بولیں - کیا بتاؤں کیا خیال ہے - میں تو یہ جانتی ہی نہیں کہ ایسی عمارت پر نکتہ چینی کیسے ہو سکتی ہے - البتہ آپکو یہ بتا سکتی ہوں کہ میرا احساس کیا ہے - ایسی عمارت میرے لئے بنے تو میں کل ہی مر جانے کے لئے تیار ہوں[۱] " -

دیکھہ کر سیر اُسکی دنیا سے گُزرنا سہل ہے -

مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

لیکن یہ تو محض ایک آرزو تھی ' ایک نیک دل ' نیک سیرت خاتون کا ارمان - دانشمندان فرنگ نقد کو نسیہ پر کیوں اُٹھا رکھتے - جہاں جگہہ پائی - گنجائش دیکھی پڑ رہے ' دخیل و قابض ہوگئے -

سر ولیم سلی مین دہلی و آگرہ کی متعدد عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں ' جو گذشتہ دَور حکومت یا کمپنی کی معمولی نا مآل اندیشانہ پالیسی کی نذر ہوئی تھیں - وہ اس قسم کی دراز دستیوں اور نیم وحشی حرکتوں کی دو فاحش مثالیں تو تنہا دہلی کی بتاتے ہیں - ایک امام مشہدی کی نہایت خوبصورت سنگ مرمر کی قبر یا درگاہ - یہ بزرگ اکبر بادشاہ کے پیر و مرشد تھے - دوسری - اکبر کے چاروں برادران رضاعی کا رفیع‌الشان و سنگین مقبرہ - فرماتے ہیں کہ " اس پر مدت تک مسٹر بلیک متعلقہ بنگال سول سروس Mr. Blake, B. C. S., متصرف و قابض رہے - یہی صاحب ' حال

---

۱ - ریبلس ایلتری کلکشن آف اِین انڈین آفیشل - ازمیجر جنرل سر ڈبلیو ایچ سلیمین ' کے - سي - بي - صفحات ۳۷۷ ' ۳۷۸ و ۳۸۲ و جلد اول - ومسیر پرنس آف ویلس ' مرتبہ ولیم ہاور ترسل ' صفحہ ۴۴۲ ' باب ۱۱ ' مطبوعہ سنہ ۱۸۷۷ع —

میں[1] وحشیانہ طور پر چے پور میں مار ڈالے گئے ھیں - اپنے کھانے کی میزوں کے لئے جگہہ اس طور پر بنائی یا نکالی تھی کہ سنگ مرمر کا وہ تختہ دور کر دیا تھا جو مرنے والے ادھم خاں[2] کی لاش و استخوان کو چھپائے تھا اور عمارت کے وسط میں تھا - باشندگان شہر نے ہرچند فریاد و واویلا کی ' سماعت نہ ہوئی - طرفہ یہ کہ تختہ کو اکھاڑ لینے کے بعد دیوار کے مقابل ایک طرف کو بے احتیاطی سے ڈال دیا تھا - جہاں اب تک پڑا ہوا ھے - رعایا نے مسٹر فریزر[3] سے جو گورنر جنرل کے قائمقام تھے ' عرض معروض کیا - عبث تھا - رؤسانے بھی سمجھایا -

لَو دل کا داغ دے اُٹھے ایسا نہ کیجئے
ھے ڈر کی بات آگ سے کھیلا نہ کیجئے

---

۱ - سنہ ۱۸۳۴ء کا واقعہ ھے -

۲ - ادھم خاں ' اکبر کا دودھہ شریک بھائی ' بڑا بہادر ' نامور جنرل اور مقرب امیر تھا - مسٹر کین نے دھلی ھینڈ بک کے چھٹے ایڈیشن میں '' ادھم کے مقبرے '' کے زیر عنوان اس کا پورا حال لکھا ھے - نیز مسٹر بیل نے مفتاح‌التواریخ میں ' صفحہ ۲۵۱ -

۳ - مسٹر فرینچ کے سیاحت نامہ (صفحہ ۱۸) سے واضح ھے کہ فریزر صاحب قسمت دھلی کے کمشنر اور گورنر جنرل ھندوستان کے ایجنٹ تھے - باشندگان شہر سے نہایت بےتکلف ' اور بڑے ملنسار اور خلیق‌الانسان تھے - ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل ہوئے - کریم خاں سپاھی قاتل اور نواب شمس‌الدین احمد خاں والی فیروز پور کو ان کے قتل کی پاداش میں پھانسی دی گئی - مقدمہ کی سماعت و فیصلہ کے لئے اسی الہ‌آباد سے مسٹر کالون صدر عدالت یا ھائی کورٹ کے جج خاص طور پر دھلی بھیجے گئے تھے - (صفحہ ۲۱) لیکن ' ادبی دنیا ' کے رسالہ نمبر ۴ ' ج‌ِد ۸ ' ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں ان کی وارفتہ مزاجی ' ناھنجاری اور بد کرداری سے خوب پردہ اُٹھایا گیا ھے - ان کے قتل ہونے اور شمس‌الدین خاں سے ان کی ' اور کارکنان کمپنی کی کاوش ' اور بدلا لینے کے وجوہ اور پھانسی دینے کے حالات و واقعات مندرج ھیں

بھکار ثابت ہوا (اور جو ہونے والا تھا ' ہوکر رہا) - کچھ دن بعد یہ صاحب خود بھي قتل کرڈالے گئے "[1] - مرزا غالب نے اپنے اس سر پرست و مربي کا بڑا درد انگیز مرثیہ اپنے مخصوص انداز میں زور قلم کے ساتھ لکھا ھے - سر ولیم فرماتے ھیں " عام لوگوں کا اعتقاد یہ ھے کہ ان دونوں صاحبوں کي موت اسي بےادبي و گستاخی کي بدولت ہوئی جو انہوں نے اکبر کے کو کلتاش کے ساتھ کي تھی[2] " -

لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل کے مصاحب خاص اور رفیق سفر ' مسٹر فریلنچ لکھتے ھیں کہ اُن کو جب سنہ ۱۸۳۸ و ۳۹ میں دھلی جانے کا موقع ملا تو وہ اور ایک اور زیرک و ھنر مند ذي مرتبت انگریز جو دنیا بھر کی سیاحت کر چکا یا کر رہا تھا ' دھلی میں یکجا ہوئے اور دونوں نے تین دن قطب مینار میں گزارے - کسی عمارت کی ایک پرانی خلوت گاہ پر قبضہ کر لیا تھا - صبح و شام باہر نکل جاتے اور قرب و جوار میں جو آثار و باقیات تھے ' دن بھر چھانتے اور لطف اندوز ہوتے - تغلق آباد میں بھی قیام کي یہي صورت رہی[3] -

ڈنکن صاحب کو تسلیم ھے کہ لارڈ ھیسٹنگس اور لارڈ بینٹنگ نے آگرے کي بعض عمارتوں کے ساتھ بےدردي اور وحشیانہ پن کا برتاؤ کیا تھا[4] - سلیمین صاحب نے اس کا رونا خوب رویا ھے -

دھلی کے آثارالصنادید میں اس کي متعدد مثالیں ملتی ھیں ۔

---

۱ - ریمبلس اینڈ ري‌کلکشنس ' حصہ دوم ' صفحہ ۱۹۰ -

۲ - ایضاً

۳ - سیاحت نامہ صفحہ ۹۴ -

۴ - آگرہ ھینڈ بک ' صفحہ ۱۱۶ -

(۱) '' مسجد سر ہندي ' لاهوري دروازہ کے باہر بیگم کي بلوائی ' نہایت مرتفع سنگ سرخ کی تھي - ایک طرف سرا مہردہِ اکرام کي تھی جو بحکم سرکار کمپنی بہادر منہدم کردی گئي اور مسجد کی دیوار بھي منہدم کر دي گئی - سرا نہایت آباد اور بارونق و آرام دہ تھي[۱] '' -

(۲) '' بھول بُھلیّاں یعني مقبرہ ادھم خاں ' جو اکبر بادشاہ کا کوکہ تھا ' جس نے شمس محمد خاں غزنوي اکبر کے اتگہ کو مارڈالا تھا ' او اس کے قصاص میں اکبر نے ادھم کو قلعہ پر سے گراکر مروا ڈالا تھا اور یہ واقعہ ۱۲ رمضان سنہ ۹۶۹ ھ کا هے -- یہ گنبد بھي اس زمانے کے بعد بنا هے - گنبد چونہ اور پتھر سے بنا ہوا هے اور اُس کي دیوار میں اُوپر جانے کا رستہ هے - دیوار دیوار ' گرد پھر سکتے هیں اور اس میں ... ... بُھول بھلّیاں ... ... قطب صاحب کي عمارتوں میں یہ نامي عمارت هے - اکثر صاحبان عالی شان اس میں ' آن کر اترتے هیں اور اسی سبب سے اس کی قبر کا تعویذ برابر کردیا هے - باوجودیکہ مقبرہ اکبر کے وقت میں بنا هے مگر قطع اس کی پٹھانی عمارت سے ملتی هے[۲] '' -

(۳) '' قطب صاحب کي لاٹ کے قریب محمد قلی خاں کا مقبرہ تھا جو اکبر بادشاہ کا کوکہ تھا اور یہ عمارت بھی یا تو عہد اکبر شاہ کي رهی ہوئي ' ورنہ جہانگیر کي - لیکن جب اس کے نصیب کھلے اور اس عمارت کے دن اچھے آئے ' اسے صاحب والا مناقب عالي مناصب نے جن کے عدل و انصاف کے آگے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیٹا هے اور

---

۱ - آثارالصنادید ' مطبوعہ سنہ ۱۸۷۶ ع - صفحہ ۹۳ -

۲ - " " " - ۸۰ -

ظلم و ستم دنیا سے نیست و نابود ہوگیا ہے - آوازہ بلند ہمتی اور والا فطرتی کا ' آویزۂ گوش فلک ہے اور غلغلہ اون کی شوکت وحشمت کا زمین سے آسمان تک پہونچا ہے یعنی دریا نوال خدایگان ابرکف ' حاتم دوران فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی معظم الدولہ امین الملک اختصاص یارخاں سر طامس ٹھافلس مٹکف صاحب بارونٹ بہادر فیروز جنگ صاحب کلاں بہادر دارالخلافہ شاہ جہاں آباد دام اقبالہ نے کوٹھی تیار کرائی[1] '' -

یہ ارشادات انیسویں صدی کے سب سے بڑے رفارمر اور مصلح مسلمان سرسید احمد خاں بہادر کے ہیں - جنکی جُرات اخلاقی اور آزادہ روی ایک بڑی حد تک مسلم ہے - مٹکاف صاحب کی بلند اہلگی کے ساتھہ داد تحسین اِس صلے میں دی جاتی ہے کہ اُنہوں نے محمد قلی کے مقبرے کو کھودوا کر اُس جگہ اور اُس کے سامان سے اپنی شاندار کوٹھی تعمیر کرائی ہے - اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سنہ ۱۸۴۷ ع تک یا آج سے اسی نوے برس پہلے اِن باتوں کے حاکم و محکوم دونوں خوگر ہورہے تھے اور اسکو ظلم نہیں سمجھتے تھے یا اگر برا سمجھتے ہوں تو زبان پر لانے کی کسکو ہمت ہوتی تھی

۴ - سید صاحب یہ بھی فرماتے ہیں - کہ " مقبرہ خانخانان کا تمام سنگ مر مر اور پتھر کی نفیس جالیاں اور گل کاری کی چیزیں اوکھاڑ کر آصف الدولہ کے وقت میں لکھنو بھیج اور بیچ دیا گیا - حتے کہ مقبرہ کا تعویز بھی اوکھاڑ لیا[2] -

یہ وہی لکھہ لُٹ آصف الدولہ ہے جسکی سیر چشمی '

---

۱ - آثارالصنادید صفحہ ۶۷ -

۲ - آثارالصنادید صفحہ ۲۸ -

عالی حوصلگی، داد و دہش اور فیاضیوں کی داستانوں کا سلسلہ کبھي ختم نہیں ہوتا، اور حاتم طائی کے سوا کہیں اسکی نظیر نہیں ملتي - رحمت ہو ایسے کفن کھسوٹ پر -

سنہ ۱۸۵۷ع کے اِنقلاب اور سرکار برطانیہ کے عنان حکومت ہاتھہ میں لینے کے بعد بھی ، شروع شروع میں، کچھہ ایسي دست‌درازیاں ہوتي رہی ہیں - مسٹر فیرنیچ نے کبھی کسي اور وقت پیشتر دھلي میں سفید سنگ مرمر کا ایک بڑا وسیع ، طویل و عریض حمام دیکھا تھا - فرماتے ہیں کہ جب بادشاہ قید کر لیا گیا ، بغاوت میں شرکت ثابت ہوئی، تو یہ حمام اُسکي محلسراے سے نکال کر ملکہ باغ میں رکھہ دیا گیا - مقصد محض نمایش و آرایش تھی - عوام کے کام یا مصرف میں نہیں آتا تھا، یعنی فرش زمین پر ایک عجیب چیز کے طور پر ڈال دیا گیا تھا[۱] -

گارسان دي تاسي صاحب کی تحریر [۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۵۷ع] سے پایا جاتا ہے کہ بغاوت فرو ہونے پر جسوقت دھلي میں بشپ کا عہدہ قائم کرنے کا سوال زیر غور تھا، اُسوقت یہ تجویز بھی درپیش تھی کہ شاہجہانی جامع مسجد کو گرجا میں تبدیل کر دیا جاے[۲] -

دور کہیں جائیے ، اسی شہر الہ‌آباد میں شاہجہاں کے نامور گورنر نواب شایستہ خاں کي بنوائي ہوئی وسیع و رفیع مسجد قلعہ کے پاس تھی -

---

۱ - حالات سفر د مسٹر سي جے ' فرنچ ' مطبوعہ سنہ ۱۸۷۲ء ' صفحہ ۹۶ -

۲ - رسالہ اردو ، جنوری سنہ ۱۹۳۱ء ' صفحہ ۲۶ ' جلد ۱۱ ' حصہ ۴۱ -

سنه ۱۰۵۶ھ [سنه ۱۶۴۶ع] میں اُسکی تعمیر ختم ہوئی تھی - جب تک مسلمانوں کا آوج موج رہا - مسجد ' مسجد رہی - عبادت کے کام آتی تھی - مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ الہ آباد میں کمپنی انگریز کی عملداری کے اوائل یعنی سنه ۱۸۰۰ع میں کرنیل کیٹ صاحب نے اسکو تغیر و تبدیل کر کے اپنی بود و باش کا مکان بنا لیا تھا - دس سال بعد یعنی سنه ۱۸۱۱ع میں کمپنی کے حکم سے [و اگزار ہوکر] پھر اصلی صورت میں تبدیل کر دی گئی - آج (سنه ۱۸۴۸) تک موجود ہے ' اور مسلمان جمع ہو کر دونوں عیدوں کی نماز یہیں پڑھتے ہیں"[۱] - عرصه ہوا کہ یہ مسجد بھی گردش روزگار کے نذر ہو چکی - بشپ ہیبر صاحب نے بھی دیکھا تھا وہ اس کی بڑی تعریف کرتے اور اس کی خوبی موقع ' بلندی ' حسن منظر ' قرب دریا کی تحسین فرماتے ہیں - مدت تک جمعه و عیدین کی نماز و جماعت یہاں ہوتی رہی - آخر یہ حالت بھی انقلابات حکومت و مصالح فوجی اور قرب قلعه سے قائم نه رہی - موٹی موٹی دیواریں اور کچھ آثار باقی ہیں ' جنکا کچھ حصه خشکی میں ہے اور کچھ دریا کے اندر تک چلا گیا ہے - یا یوں کہئے کہ فوجی میدان میں اینٹ پتھر اور چونے کا ایک ڈھیر باقی رہ گیا ہے -[۲]

ان تغیرات کا ذکر کرنے سے کسی خاص جماعت ' گروہ یا ذات پر الزام دینا یا ان کے طریق عمل پر داغ لگانا مقصود نہیں - بلکہ

---

۱ - صفحه ۳۶۹ ' مطبوعه سنه ۱۸۴۹ع -

۲ - حیات جلیل ' حصهٔ دوم ' کا صفحه ۱۳۰ ' نوٹ نمبر ۱۰۲ -

صرف یہ بتانا ہے کہ زمانہ کی گردش اور حکومتوں کے لوٹ پوٹ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے - مسلمانوں نے اپنے زمانۂ اقتدار و سطوت میں جو کچھ کیا یا ہندؤں میں سے جاتوں اور سکھوں نے قدرت و قوت پاکر جو کچھ عمل کیا وہ تو پرانی باتیں اور بھولی بھٹکی داستانیں ہو گئی ہیں - اگر آپ گزشتہ صدی کے نصف اخیر کے واقعات یاد کریں گے جو روشنی و تمدن اور علم و تہذیب کا دور گزرا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جب بھی کم و بیش وہی ہوتا رہا ہے جس کو آج ہم قابل نفرت بتاتے ہیں -

اس گنبد کا لحد سے خالی ہونا خواہ اتفاقات زمانہ سے ہو یا کسی ضرورت مند زبردست کے دستبرد سے - بہر حال یہ مسلم ہے کہ اس میں باغ کے یوروپین منتظم افسر کی بود و باش مدت سے چلی آتی تھی[1] - بیسویں صدی کے شروع ہونے پر یعنی ہمارے وقت میں انقلاب و اصلاح کی ہوا چلی - زمانہ نے گردش کھائی - سنہ ۱۹۰۲ع میں لارڈ کرزن الہ‌آباد تشریف لائے - حسب معمول آثار قدیمہ کو، قلعہ کو، خسرو باغ کو ملاحظہ فرمایا - محتشم الیہ کو یہ انداز پسند نہ آیا کہ مُردوں کی جگہ زندے متصرف ہوں - فرمان قضا جریان نے چوبیس گھنٹہ کے اندر یہ عمارت سوپرنٹنڈینٹ صاحب سے خالی کرادی - ہاں، اُسی قدر نہیں ہوا بلکہ اتنے ہی وقت کے اندر سوپرنٹنڈینٹ صاحب کا آرامگاہ اپنی اصلی حالت میں منتقل کر دیا گیا - اور پھر تمبولن کا مکان بن گیا - صاحب اور اِن کے دفتر کے لئے بعد کو ایک قصر نفیس (کوٹھی) کمپنی باغ (الفریڈ پارک) میں تعمیر کرا دیا گیا -

---

۱ - تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۳۴۲ - گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۹۵ -

مسٹر ایچ۔ جے ڈیوس H. J. Davis آخری سوپرنٹنڈینٹ تھے جو اس عمارت میں مقیم و فروکش رہے - انھوں نے اور اُن کے پیش رووں نے اس ہر طرف سے کھلی ہوئی عمارت میں خوبصورت چوکھٹیں اور کواڑ لگائے تھے - ایک حصہ جو پہلے ہی سے گول بنا تھا ' گول کمرہ بنا - اسی کے ایک پہلو یعنی سامنے کے برآمدہ میں صاحب کا ' یا باغ کا سرکاری ' دفتر قرار پایا -

زیادہ دن کی بات نہیں ہے - اسوقت کے دیکھنے والے اور ملتزمان خدمت موجود ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک نیکدل شریف‌النفس انگریز جو سنی سنائی روایات پر عامل اور قدیمی معتقدات کا معترف و قائل تھا ' اسکا بھی احترام و اکرام کرتا تھا - اُسکی طرف سے ہر جمعرات کو لوبان سلگایا جاتا تھا - ایک نشان (بظاھر قبر کا) ایک گول مرمت‌شدہ پیوند کی طرح گرد و پیش کے فرش سے اب بھی نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے - حسن سلیقہ اور بزم آرائی کی بدولت اس پر میز بھی گول بچھائی گئی تھی - قالینوں کا فرش تھا - بااینہمہ اس حصہ پر جانے اور پامال کرنے سے احتیاط و احتراز کیا جاتا تھا -

یہ اطلاع کہ اسکو حتےالامکان اصلی صورت میں تبدیل کردیا ہے ' غالباً صحیح ہوگی - بحالت موجودہ مقبرہ کی دونوں منزلیں یا دونوں طبقے (بالائی و زیرین) خوب صاف اور کھلے ہوے ہیں - کواڑ اور کھڑکیاں سب دور کردی گئی ہیں - نہ کسی اور قسم کا لکڑی کا سامان چھوڑا ہے - دونوں حصوں پر سفیدی سے یکساں قلعی کر دی گئی ہے - داغ دھبے یا درمیانی تصرفات کی یاد دلانے والے نشانات سب چھیل دئے ہیں - کون جانتا ہے کہ زندوں کے تسلط سے پہلے اس پر کچھ نقش و نگار یا گلکاری و رنگ آمیزی تھی یا نہیں -

اب صرف ایک بات کہنا باقی ھے - مسٹر بہل کی اس تحریر کے سلسلہ میں کہ ایک چھوٹی قبر آوروں کے پچھم جانب ھے' بھوریج صاحب مسٹر ایسٹ وک کے حوالہ سے لکھتے ھیں کہ خسرو باغ میں نورجہاں کا ایک سی نوٹاف cenotaph تھا[۱] - سی نوٹاف جرمن زبان میں بے قبر کے مقبرے کو کہتے ھیں یعنی کوئی گنبد جو کسی ایسے کی یادگار کے لئے تعمیر ہوا ہو جو کسی اور جگہ دفن ہوا ہو -

اسکا بہتر فیصلہ قاریان کرام کرسکتے ھیں کہ ان دونوں میں سے کونسا گنبد نورجہاں کا ھوسکتا ھے -

---

۱ - جورنل رائل ایشیاٹیک سوسائٹی' جولائی سنہ ۱۹۰۷ 'صفحہ ۶۰۷' نوٹ نمبر ۲ -

ربندر ناتھ ٹیگور کی مصوّری

(از مسٹر رام چندر ٹنڈن' ایم - اے' ایل - ایل - بی)

۱۹۲۸ع میں ربندر ناتھ ٹیگور نے تمام دنیا کو غرقِ حیرت کردیا ' اُس وقت تک وہ صرف شاعر ہونے کی حیثیت سے اربابِ ذوق سے روشناس تھے ' لیکن یکایک وہ مصور کی حیثیت سے بھی دنیا کے سامنے نمودار ہوگئے -

سنہ ۱۹۱۳ع میں آپ کو اپنی ادبی خدمات کے صلہ میں مشہور نوبل پرائز ملا تھا ' اُس وقت سے آپ کی شہرت میں برابر اضافہ ہوتا رہا - اس اثناء میں آپ نے بہت سے ترجمے اور نیز طبعزاد چیزیں پیش کیں ' جس سے آپ کی غیر معمولی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے - آپ کی شہرت صرف ایک ادیب و شاعر ہی ہونے تک محدود نہیں رہی ' بلکہ رفتہ رفتہ آپ ہمارے زمانے کے ایک مفکّر اور صاحب بصیرت بھی تسلیم کئے جانے لگے - لیکن یہ کون جانتا تھا کہ یہ کُہنہ سال شاعر اپنے اندر ایک اور صلاحیت بھی پوشیدہ رکھتا ہے اور وہ رنگ و خطوط (یعنی مصوّری) کے ذریعہ ایک نئے عالم کی تخلیق کی استعداد و قابلیت - یہ امر لوگوں سے پوشیدہ تھا کہ شاعر اپنا بہت سا وقت تصاویر تیار کرنے میں صرف کر رہا ہے - اور جب تک یکایک اس کا اعلان نہیں ہو گیا کہ شاعر کی تیار کی ہوئی سیکڑوں تصویریں پیرس میں دکھائی جا رہی ہیں ' اس وقت تک اُسے پوری کامیابی کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھا گیا - ایک شُہرۂ آفاق شاعر کا فن‌کاری کے میدان میں آنا وہ بھی ۶۷ برس کی پختہ عمر میں ' ادب و فن کاری کی تاریخ میں ایک نیا اور عجیب
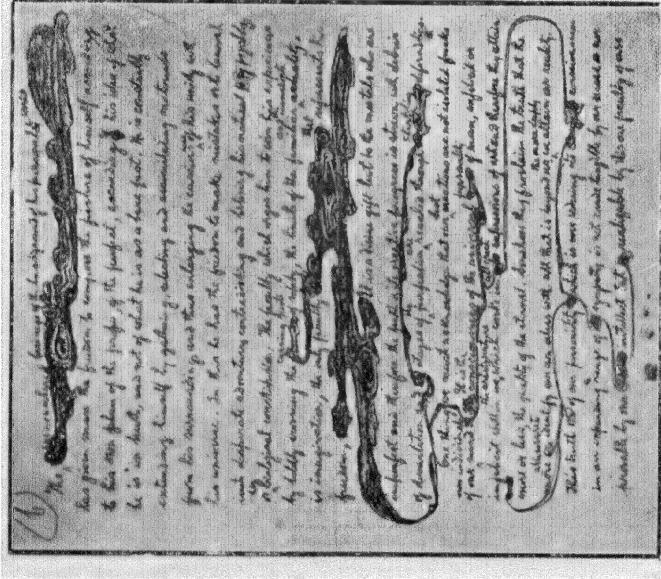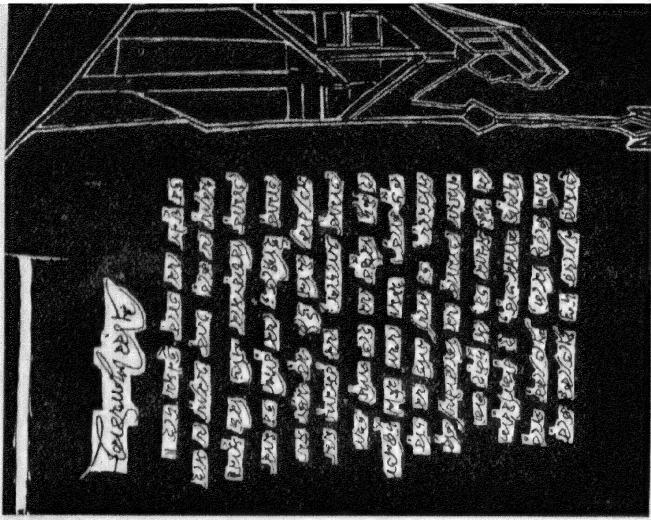
واقعہ ہے - یہ واقعہ آشنایان فن کي توجہ کو اپنی جانب مائل کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ' چنانچہ اُس نے مشرق و مغرب کے صاحبان فن کی توجہ کو مائل کر لیا - یہ واقعہ اس امر کی بھي ایک نئي مثال ہے کہ زمانے کی رفتار نے شاعر کے تخلیقي جوش کو مضمحل نہیں ہونے دیا اور اس پیرانہ سالی میں بھي اس میں جوانی کی تیزي و طرّاري باقي ہے - اب تو ربندر ناتھ کے فن مصوّري کے نمونے یورپ کی تقریباً تمام دارالسلطنتوں میں اور نیز کلکتے اور بمبئی میں منظر عام پر لائے جا چکے ہیں اور ہر جگہ نہ صرف ان کا تذکرہ رہا ہے بلکہ اکثر فن کاروں میں یہ بہت ھي شوق و توجہ کے مستحق بھي سمجھے گئے ہیں - سوال یہ ہے کہ ان تصویروں کے بارے میں ہم کیا سمجھیں ؟ کیا اُنھیں ہم صرف تفریح و تفنن کے مظاہر سمجھیں یا اُنھیں ہم وہ درمیانی ذریعہ سمجھیں جنکي وساطت سے یہ بلند پایہ شاعر دنیا کو اپنا پیغام پہونچانا چاھتا ہے ؟

شاعر کي مصوّري کا آغاز

ان سوالات کا جواب دینے سے قبل یہ دیکھنا ضروري ہے کہ اس مصوّري کا آغاز کیونکر ھوا - اِس کے بارے میں دو مختلف رائیں ہیں - ایک تو یہ کہ شاعر نے اس کے لئے پوري پوري تیاري کر لي تھي ' اس کے بعد اُس کی ابتدا کي - اس طرح کی رائے شاعر کے کچھ شاگردوں اور اُس کے مدّاحوں اور پرستاروں کي ہے - کلکتہ گورنمنٹ آرٹ اسکول کے پرنسپل مسٹر مکُل دے[1] کہتے ہیں کہ مصّوری و فن کاري کے متعلق شاعر کی دلچسپي بہت پرانی ہے - سنہ ۱۹۰۷ع سے تو یقیناً شاعر کو مصّوري سے خاص دلچسپي رھي ہے ' صرف یہي نہیں بلکہ سنہ ۱۹۱۳ع میں

---

۱ - د اگزر بیش آف ڈرائنگس بائي ربیندر ناتھ ٹیگور ' کا دیباچہ ' صفحہ ۴ -

کوھستاں رام‌گڑھ کی سیاحت کے موقع پر شاعر نے کچھ تصویریں بنائی تھیں جنو دے صاحب کے پاس محفوظ ھیں - اُس کے علاوہ دے صاحب نے اس امر پر بھی توجہ دلائی ھے کہ شاعر کے خاندان کو بھی فن‌کاری سے خاص دلچسپی رھی ھے - لکھنؤ کے گورنمنٹ اسکول اف آرٹ کے پرنسپل مسٹر استکمار ھلدار جو شاعر کے ایک دوسرے شاگرد ھیں ' شاعر کی تصویروں میں اُن تمام کمالات کا تصوّر کرتے ھیں جو شاعر کی شاعري میں نمایاں ھیں - وہ کہتے ھیں کہ " شاعر کا قلم جس طلسم و رعنائی کی تخلیق بہ آسانی کردیتا ھے ، اسکا اعادہ اُس وقت ھو جاتا ھے ' جب وہ مصوّري کا برش اپنے ھاتھ میں لیتا ھے[1] " - اس طرح ھم ان صاحبان فن کی رایوں کو اگر قبول کرلیں تو ھمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ربندرناتھ کا فن مصوّري نہ صرف اس نقطۂ نظر سے کامل ھے کہ وہ شاعر کے مطالعہ اور تیاری کا نتیجہ ھے بلکہ اس نگاہ سے بھي کہ شاعر کي تصلیفیں بھی در اصل بہت بلند پائہ واقع ھوئي ھیں -

اس کے خلاف دوسری راے (اور یہ راے ڈاکٹر آنند کمار سوامي[2] ایسے بڑے ناقد فن کی ھے) شاعر کي تیاری کو مطلقاً ناقابل توجہ سمجھتي ھے - شاعر کے فن کارانہ علم و مطالعہ سے بالکل ھی انکار کرتي ھے - شاعر کي مصوّري کے نمونوں کو یہ طفلانہ مشاغل پر محمول کرتي ھے اور انھیں شاعر کے تفنن‌آمیز تصوّرات کے نتائج سمجھتي ھے -

شاعر ' جیسا کہ ھم اسے جانتے ھیں ' اپني زندگي میں مسلسل نئے

---

۱ - ' روپ لیکھا ' - جلد ۳ نمبر ۱۱ - ۱۰ ' صفحہ ۷ -

۲ - ' روپم ' نمبر ۴۴ - ۴۳ - ۴۲ ' صفحہ ۳۱ -

ذرائع اظہار کي جستجو میں رہا ہے - ادب کے میدان میں اسلئے ، شاعری ' تمثیل نگاری ' افسانے ' ناول ' شعر منثور وغیرہ مختلف ذرائع اظہار میں مشق بہم پہونچائي ہے - کہا جاتا ہے کہ موسیقي اور رقص کے میدان میں بھي شاعر نے کچھ نئے راگوں اور نئے اندازوں کي تخلیق کي ہے ' ابھي گزشتہ سال ہي سلسلہ میں آیا تھا کہ شاعر بُت تراشي کي مشق کر رہا ہے ' اسلئے شاعر کی مصوري محض ایک نئے ذریعۂ اظہار کي سعي معلوم ہوتي ہے - وہ اِس کے ذریعہ سے اپني تخلیقي قوتوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے ' فرق صرف یہ ہے کہ عرصہ‌گاہ ادب میں تو وہ ایک مقصد لیکر اٹھتا ہے اور اس کي تکمیل میں کوشش کرتا ہے ' لیکن مصوّری میں وہ اپنے کو بہتا ہوا چھوڑ دیتا ہے ' یہاں اسکا کوئي مقصد نہیں ہے ' وہ اتفاقي تخلیق کے دامن میں پناہ لیتا ہے ' لیکن اس کے بارے میں ہم آگے کچھ زیادہ عرض کریں گے -

ہمیں خود ان تصویروں پر غور کرنا چاہئے ' شاعر نے اپني ابتدائي تصویریں بنگلہ زبان کے خوشخط مسودوں پر بنائي تھیں' ربندر ناتھ کا بنگلہ خط اپني خوبصورتي کے لئے خاص شہرت رکھتا ہے - یہ مسودے جب کاٹ چھانٹ کر درست کئے جاتے تو یقیناً اُن کي خوبصورتي میں فرق آجاتا - ان مسودوں پر حک و اصلاح کے نشانات شاعر کو بہت کھٹکتے اور وہ اُس کے نزدیک خوبصورتي کے لئے باعث ہلاکت معلوم ہوتے - شاعر کو ان بھدّے نشانات کو خوبصورت بنانے کي خواہش اور فکر دامنگیر ہوئي ' اور شاعر نے اس عمل کے لئےجو خطوط کھینچے انہیں کے ذریعہ شاعر کي ابتدائي تصویریں عالم وجود میں آئیں -

اپني اس خواهش کے بارے میں شاعر خود لکھتا هے :—

'' بچپن سے میري جو تعلیم هوئي وہ موزونیت کي هے' یہ موزونیت خواہ فکر میں هو یا صوت میں ' میں نے یہ سیکھا تھا کہ موزونیت اس شے میں جو منتشر اور حقیر هو ایک حقیقت اور اهمیت پیدا کر دیتی هے اسلئے جب میرے مسودوں میں حک و اصلاح کے نشانات اپني نجات کے لئے مجرموں کی طرح فریادی هوے اور میري نگاهوں کو اپني غیر موزونیت سے تکلیف پهونچانے لگے تو میں نے اپنے اصل کام سے هٹ کر ان کو خوبصورت بنانے میں اپنا بهت سا وقت صرف کر دیا '' ۔[1]

ان مسودوں میں جو نشانات تصحیح کے هوتے وہ اکثر ایک سے زائد متوازی لکیروں کی شکل میں هوتے ' ان سیاہ لکیروں کے بیچ میں سفید لکیریں چُھپتی هوئیں ۔ شاعر عام طور پر ان نشانات کو دوسري لکیروں سے گهیر دیتا اور اُس وقت کاٹ چھانٹ کے وہ نشانات ' کاغذ کے صفحوں پر مثل متعدد جزائر کے معلوم هوتے ۔ ان میں سے هر ایک وضع اور شکل میں مختلف هوتا ' اب اگر یہ جزیرے آپس میں ملا دئے جائیں تو اُن سے کئی طرح کی شکلوں کے تیار هونے کا امکان پیدا هو جاتا هے ۔ شاعر گویا کسی مخفی اور پُر اسرار هدایت کے مطابق اِن مختلف شکلوں میں سے صرف ایک ایسي شکل کا تصوّر کرتا جو ان سب میں زیادہ واضح هوتی ' یا یوں کہئے کہ وہ بجائے خود موجود هوتی اور صرف ایک اشارے کے ساتھ هي نمایاں هو جاتی ۔ شاعر کا کام دراصل اسي اشارے کو مهیّا کرنا هے ۔ اس عمل میں شاعر کا صرف یهی مقصود هوتا کہ صفحہ

---

١ - ' روپم ' - نمبر ۴۲-۴۳-۴۴ ' صفحہ ۲۷ -

پر پھیلے ہوئے تصحیم کے نشانات کا بھّداپن جاتا رہے اور یہ آپس میں اس طرح منسلک و متعلق ہو جائیں کہ اُن کے وجود میں کوئی نا موزونیت باقی نہ رہے ' بلکہ اُن میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو جائے - اس مقصد کو پیش نظر رکھکر اپنی موزونئي طبع کی صلاحیت کے ساتھ شاعر بڑی تیزي سے اپنا برش چلاتا ' اس عملِ تشکیل میں کبھي کبھي بہت ھی خوبصورت شکلیں پیدا ہو جاتیں جو قدرتی صورتوں کي نقل معلوم ہوتیں ' لیکن خود شاعر نقل دي غرض سے یہ تصویریں ہرگز نہ بناتا - ان متفرق اور اتّفاقي نشانات کے گروہ میں سے وہ اپنے حسن‌کارانہ خطوط کے ذریعہ ایسي ایسي تصویریں بنا چکا ہے جنکی آخري صورت کا اُسے پہلے کوئي تصوّر نہ تھا - اُس کے اس عمل سے اُن شکلوں اور صورتوں کي تخلیق ہوئي جو گویا پہلے سے اپني تخلیق کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے -

شاعر کی مصّوري کے تخلیقی عمل کی یہ ابتدائی صورت ہے ' اُسے اگر اُس کي مصوّري کا پہلا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا - یہ بات ظاہر ہو گئي ہوگی کہ شاعر کو خارجی دنیا کي کسي مخصوص چیز کی مصوّري مقصود نہیں ہے ' اُس کی فن‌کاري کا مقصود نقل و مصوری نہیں ہے ' بلکہ اپنی اس تخلیقی قوت کو وہ اتّفاق کے سپرد کر دیتا ہے ' اُس سے زیادہ کچھ نہیں - شاعر کے اندر ہم ایک ایسي خواہشِ اظہار پاتے ہیں جو متفرق اور منتشر نشانات کو باہم یکرنگ اور ہم‌آہنگ بنانا چاہتي ہے -

شاعر کا بیان اپنے فن کے متعلق

شاعر کے آئندہ ارتقاے فن پر توجہ کرنے سے قبل تھوڑي دیر کے لئے ہمیں چاہئے کہ اس پر غور کریں کہ خود شاعر کا بیان اپنے فن کے بارے میں کیا ہے ' وہ لکھتا ہے کہ :-

" اس نجات‌دهي کے عمل میں مصروف رهتے هوئے میں نے ایک کھري صداقت تلاش کر لي هے وہ یہ کہ عالم صورت میں خطوط کے طبعی اِنتخاب کا ایک مسلسل عمل جاري هے ' اِن خطوط میں جو اصلح هوتی هیں وهي زندہ رهتی هیں یعني جن میں خود صفات حسن موجود هوں ' اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ان بےخانماں متفرق قبائل کي بیکاري کے مسئلے کو حل کرنا اور اُن میں باهمي هم‌آهنگي پیدا کرنا خود ایک تخلیقي عمل هے[1] " -

اس طرح یہ ظاهر هے کہ شاعر اس عالم میں اتّفاقی ' منتشر و مختلف شکلوں کا وجود تسلیم کرتا هے اور اُن کي هم‌آهنگی و موزونیت کے امکان پر یقین رکھتا هے - اور اس تغیر میں استعانت کو خود ایک تخلیقي کام سمجھتا هے - اس نظر سے غور کرنے پر ربندر ناتھ کا کارنامہ ایک ایسی اهمیت حاصل کر لیتا هے جو کہ اُن کی اصل رسائي سے بھی کھیں زیادہ هے -

شاعر کي مصوّري اور اسکی شاعری کا باهمي تعلق

ایک امر اور هے جس پر تھوڑي دیر غور کر لینا زیادہ مناسب هوگا ' وہ یہ کہ شاعر کي مصوري اور اُس کي شاعري میں باهم کیا تعلق هے ؟ شاعر نے خود مشهور فرانسیسی نقادفن موشیر بیدو سے یہ تسلیم کیا تھا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نهیں هے - شاعر هونے کي حیثیت سے اُس کے سامنے کوئي خیال هوتا هے یا کوئي ذهني تصویر هوتي هے جس کو وہ بعینہ دکھا دیتا هے یا دکھا دینے کی کوشش کرتا هے - مثلاً اُس کے سامنے یا اُس کے خیال میں کوئی باغ' کوئی منظر یا

---

۱ - ' رویم ' نمبر ۴۴ - ۴۳ - ۴۲ ' صفحہ ۲۸ -
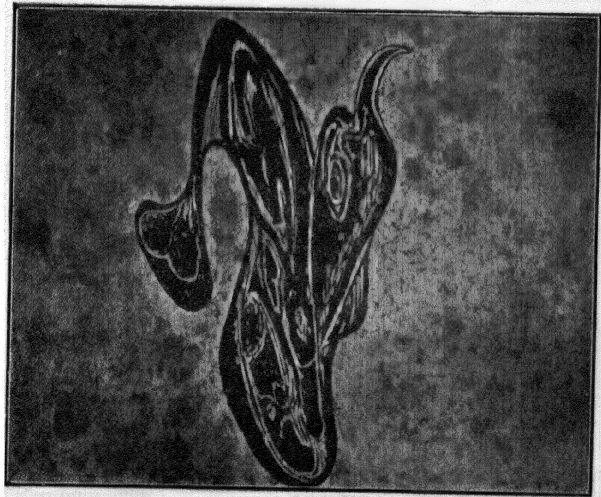
ربندر ناتھ ٹیگور کی مصوری - دوسرا دور
(بہ اجازت مصوّر)

کوئی انسانی چہرہ ھے ' شاعر انھیں اُسی طرح اُن کی اصلی صورت میں نمایاں کرنے کی کوشش کریگا جس طرح کہ مصوّر کیا کرتا ھے ' فرق صرف ذریعۂ اظہار کا ھے - لیکن ربلدر ناتھ اپنی مصوّری میں ایسا نہیں کرتے - جس وقت وہ مصوّر ھوتے ھیں اُس وقت وہ نقل کرنے کا کام چھوڑ دیتے ھیں - جیسا پہلے کہا جا چکا ھے ' اُن کی تصویریں اُن کے پہلے کے سوچے ھوئے تصوّرات کا اظہار و نمود نہیں ھوتیں - اپنی تصویروں کے موضوعات کو پہلے سے سوچنا تو درکنار جس وقت شاعر تصویر بنانے کے کام میں مصروف ھوتا ھے اُسے اس بات کی خبر نہیں ھوتی کہ فلاں تصویر کی انجام‌کار کیا صورت ھوگی - اس لئے موشیر بیدو کے لفظوں میں " شعر کی تصنیف کے وقت تو وہ (شاعر) مصوّر کی طرح کام کرتا ھے اور جب وہ مصوری کا کام کرنے بیٹھتا ھے تو اسے شاعر کی طرح انجام دیتا ھے - اُس کا یہ سارا کارنامہ اِن دو فنون یا علوم کے عین حدّ فاصل پر واقع ھوا ھے ۱ " -

مصوّری کا دوسرا تدریجی دور

اب دیکھنا یہ ھے کہ شاعر کی مصوّری کا ارتقا کس طرح ھوتا ھے - اس ترقی کا دوسرا زینہ کیا ھے ؟ ھم یہ دیکھتے ھیں کہ شاعر پہلے زینے سے دوسرے زینے پر نہایت تیزی سے پہونچ جاتا ھے - ایک مرتبہ جب اُس نے اِس حقیقت کو قبول کر لیا کہ عالم میں اتفاقی' منتشر' اور مختلف صوّر کا وجود ھے تو وہ اُنکی نجات دھی میں اپنے مسودوں ھی تک محدود نہیں رھتا' وہ اِس میدان سے باھر اپنے اسی عمل کے لئے کوشش کرتا ھے - شاعر نے مسودوں

---

۱ - روپم ' نمبر ۴۴ - ۴۳ - ۴۲ ' صفحہ ۸۲ -

کے اصلاحی نشانات کو تصویروں میں منتقل کرنے کا عمل بہت دن ہوئے چھوڑ دیا - یہ تو وہ مقام ہے جہاں سے اُس نے اپنا کام شروع کیا تھا - خوش قسمتی سے اب اُسے دوسرے سہارے مل گئے ہیں جن پر وہ عمل کرتا ہے ' لیکن اُس کے سب سے آخری عمل میں بھی اُس کے ابتدائی طرز کے آثار پائے جاتے ہیں ' یعنی ہر ایک تصویر کے تخم یا بنیاد میں اتفاقی اور منتشر وجود ضرور ہوں گے - مطلب یہ کہ کچھ بنیادی وجود ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے چاروں طرف یہ تخلیقی عمل انجام دیا جاتا ہے - شاعر کو اس اصل تخم اور بنیاد کی تلاش رہتی ہے ' اس کے مل جانے پر اس کا کام شروع ہوجاتا ہے ' کچھ نامعلوم قوانین کام کرنے لگتے ہیں ' وہ بڑی تیزی سے اپنا قلم یا برش چلانا شروع کرتا ہے اور اس طرح ایک نیا عالم' وجود میں آنے لگتا ہے ' ابتدا میں یہ شکلیں پہچانی نہیں جاتیں ' رفتہ رفتہ خواہ خود اپنی اندرونی ارتقا کے باعث یا اسوجہ سے کہ جو اثر انہیں وجود میں لا رہا ہے اس میں خود بھی اس بیرونی عالم کی یاد محفوظ ہے ' یہ شکلیں مناظر فطرت سے تشابہ پیدا کرلیتی ہیں - کبھی ان میں کوئی چہرہ نمایاں ہو جاتا ہے ' کبھی کوئی امکانی جانور کی صورت بن جاتی ہے ' کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ چہرے مبہم سے رہجاتے ہیں' یا یوں کہئے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ نہیں کر پاتے -

شاعر کی مصوّری کے اس دوسرے تدریجی دور میں ہم یہ پاتے ہیں کہ اُس کی تخلیقِ حسن کی صلاحیت ' مادی عالم سے متعلق ہوگئی ہے ' یہ ترقی ' تدریجی اور فطری ہے - پہلے دور کی تصویروں کی حیثیت نقش و نگار کی سی تھی - دوسرے دور میں ' تصویروں میں
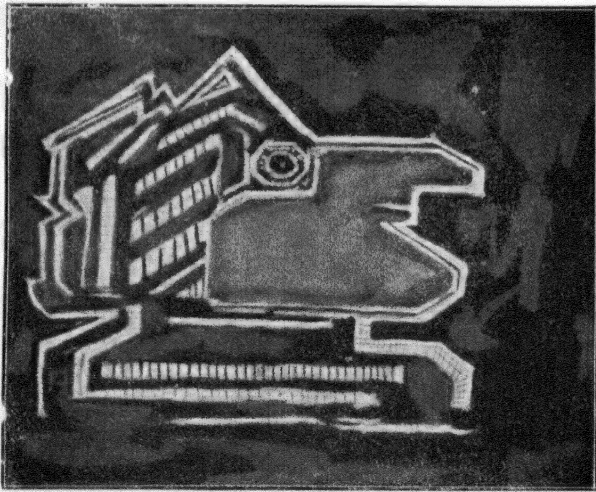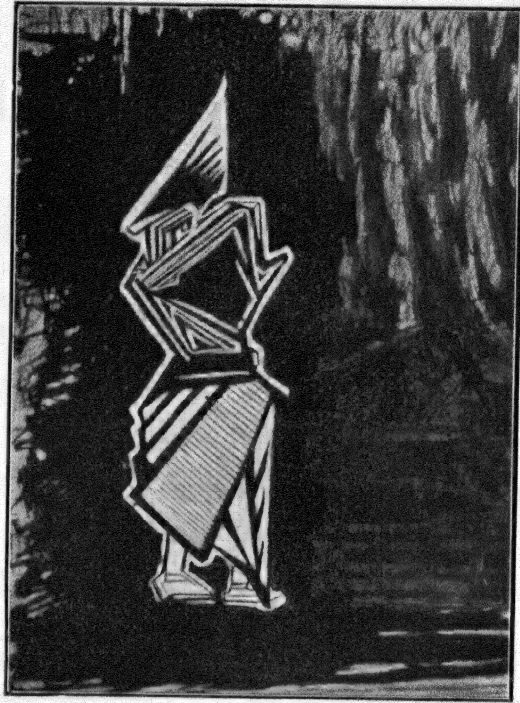
ربندر ناتھ ٹیگور کی مصوّری - دوسرا دور
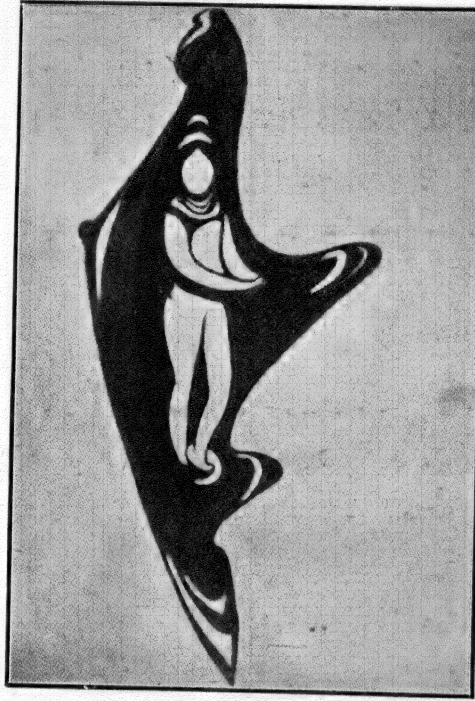
(بہ اجازت مصوّر)

ربندر ناتھ ٹیگور کی مصوّری - دوسرا دور
(بلا اجازت مصوّر)

قدرتي شکلوں خصوصاً جانوروں کی شکلوں کي کثرت ھے - دونوں دوروں میں شاعر کے تخیّل کا طریق کار یکساں ھے - اِس ترقی کے آثار اُن تصویروں میں پائے جاتے ھیں جن کی شاعر نے سنہ ۱۹۳۰ع میں برمنگھم کي سٹي آرٹ گیلري میں نمائش کی تھی ' اُس زمانے میں شاعر کے دور مِصوّري کا تیسرا سال ختم نہیں ھوا تھا - بعد کي تصویروں میں نسبتاً بیساختگی کم ھے اور ایسا معلوم ھوتا ھے کہ شاعر کے اس عمل میں صورت گري اصل مقصود رھي ھے - اس زمانے کے نمونوں میں ھمیں نامعلوم اور امکانی جانوروں کی کثرت ملتی ھے ' کچھہ انسانی صورتیں بھی نمایاں ھوتی ھیں اور یہ شکلیں حالانکہ خوبصورت خطوط کے ذریعہ نمایاں کی گئی ھیں تاھم ان کي قدر و قیمت کا اندازہ اُن کے طرز و نوعیت پر منحصر ھے ' ان کے قدرتی ھونے پر نہیں -

تیسرا دور

تیسرے یا آخری دَور میں ھم شاعر کو تقریباً قدرتی مناظر کا مصّور پاتے ھیں - اس کے کارناموں میں انسانی چھروں نے خصوصیت سے جگہہ حاصل کرلی ھے ' اس میں بہت کم استثنا ھے - چھرے کہیں منفرد اور کہیں مجموعي حیثیت میں نمایاں ھوئے ھیں ' کہیں کہیں بہت بڑے مجموعے نمایاں ھوتے ھیں - تصریروں میں پھیلاؤ اور تفصیل کا زیادہ دخل ھوگیا ھے - ھمارے اِس شاعر و مصوّر میں ' جس قدر فطرت کی نقل کا ارادہ ترقي کرتا گیا اُسی قدر اس کي بیساختگی کم ھوتی گئی - اُس نے کچھہ قدرتي مناظر کی تصویریں بھي بنائی ھیں ' ان تمام تصویروں میں نسبتاً خارجي عالم کا نقشہ دکھانے کي کوشش زیادہ نمایاں ھے - اس دَور کی ایک عجیب خصوصیت یہ بھی ھے کہ ھمیں ایسے نمونے ملتے ھیں جن میں قدرتي چیزوں کي شکلوں

کو بگاڑ کر اور انساني صورتوں میں عمداً بے ٹُکاپن پیدا کرنے کي کوشش کیگئي هے اس دَور کے نمونے بهت متنوع هیں اور ان کی نوعیتوں کي تقسیم آسان نہیں رهگئی هے -

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس آخري دَور میں اِس فن‌کار شاعر کے تخلیقي انداز میں زیادہ فرق نہیں آیا هے - تدریجی ترقّي ضرور هے ' لیکن فن‌کار همیشه ایک اتّفاقی وجود یا شکل کو تخم و بنیاد بناکر اُس کے اِرد گرد اپنا کام شروع کرتا هے ' اور مثل سابق تصویر بنانے کے دوران میں اُس کے انجام سے بالکل بےخبر رهتا هے - اس طرح ان تمام ادوار سه گانه میں شاعر اپنے اصول سے کهیں بهی انحراف نہیں کرتا -

تصویروں کے مطالب

اکثر یه سوال کیا جاتا هے که فلاں تصویر کے کیا معانی و مطالب هیں - اس کے بارے میں یه عرض کرنا هے که جهاں تک فن کار نمایاں طور پر کسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر تصویریں بناتا هے ' وهاں بهي تصویروں کو نام دینے میں دقّت هوتي هے - اس کي وجه یه هے که مصوّر کے برش سے کبهي کبهي اتفاقیه ایسي شکلیں تیّار هو جاتي هیں جنهیں وه بنانا نہیں چاهتا تها - اور اِس اتفاقي تخلیق پر اُسے قابو نہیں رہ جاتا - ربندر ناتھ کے یہاں یه دقّت کهیں زیادہ بڑھ جاتي هے ' کیوں که جیسا هم دیکھ چکے هیں ' اُن کی بنائی هوئی تصویریں کسي خاص مضمون یا موضوع پر نہیں هوتیں - اس طرح اُن کے کُل کار نامے کو اتفاقی سمجهنا چاهئے - کسی خیال یا مضمون کی تصویر بنانا شاعر کا مقصود هي نہیں ' اس لئے ان کے مطالب بهی نہیں - شاعر کي مصوّری اگر کوئی قدر و قیمت رکھتي هے تو وه اُس کے
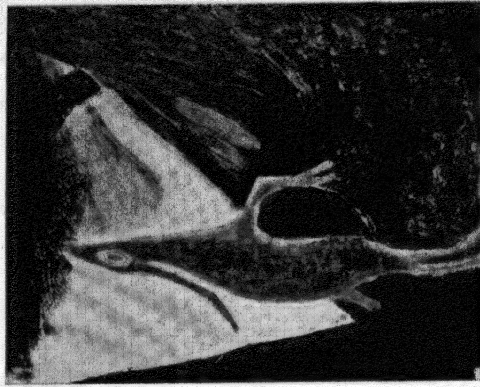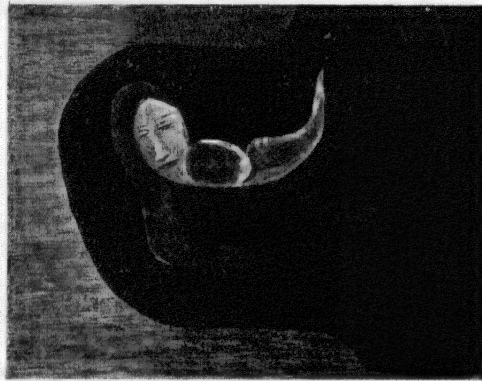
ربندر ناتھ ٹیگور کی مصوّری - تیسرا دور

(بہ اجازت مصوّر)

خطوں کی خوبصورتی میں ہے - شاعر خود یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کي بنائی ہوئي تصویریں خیالات کي تصویریں نہیں ہیں -

برمنگھم سٹی میوزیم آرٹ گیلري کي طرف سے شاعر کے ان کارناموں کی نمائش کے وقت ایک رسالہ شایع ہوا تھا ' اس کے دیباچے میں ربندر ناتھ نے لکھا ہے :—

" میری تصویریں ' خطوں اور لکیروں سے تیار کئے ہوئے میرے اشعار ہیں - یہ تصویریں اگر کسي وجہ سے پسند کی گئیں تو وہ وجہہ یہ ہونی چاهئے کہ اُن میں کوئي خصوصیت اور خوبصورتی ہے اور جو مستقل ہے' یہ نہیں کہ وہ کسي خیال یا اصلیت کا مظاہرہ کرتي ہیں [۱] - "

اسي لئے شاعر اپني تصویروں پر کوئی عنوان نہیں دیتا - ستمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں شاعر نے ماسکو میں اپني تصویروں کي نمائش کے موقع پر ایک بیان شایع کیا تھا ' وہ بھی بہت اهمیت رکھتا ہے - اُس میں شاعر نے لکھا تھا کہ :—

" لوگ اکثر مجھ سے میري تصویروں کے معاني دریافت کرتے ہیں ' اور میں اپني تصویروں کي طرح بالکل خاموش ہو جاتا ہوں - وہ اپنے مطالب خود هي ظاہر کرتی ہیں - توضیح و تشریح ان کے مقاصد میں داخل نہیں ہے - ان کی ظاهري حیثیت کے علاوہ اُن میں کسي طرح کے معاني پوشیدہ و پنہاں نہیں ہیں - اگر یہ ظاهری شکلیں کوئي مستقل خوبي رکھتی ہیں تو قبول کی جائینگي ' اور زندہ رهیں گي ورنہ چھوڑ دي جائینگی اور بُھلا دي جائینگی - خواہ اُن میں علمي مطالب ہوں یا اخلاقي [۲] - "

---

۱ - ' روپم ' نمبر ۴۴ - ۴۳ - ۴۲ ' صفحہ ۲۸ -

۲ - ' ماڈرن ریویو ' جنوری سنہ ۱۹۳۲ م ' صفحہ ۱۶ -

جس وقت کہ ربندر ناتھ سے ان کی تصویروں کا عنوان تجویز کرنے کے لئے کہا جا رہا تھا اُس وقت اُنھوں نے بنگلہ زبان میں ایک خط ماڈرن ریویو کے ایڈیٹر مسٹر راما نند چٹرجی کے پاس بھیجا تھا، جس کا آزاد ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :—

" تصویروں کے لئے عنوان تجویز کرنا قطعاً ناممکن ہے - میں وجہ بتاتا ہوں - وہ یہ کہ میں موضوع کو پیش نظر رکھ کر تصویریں نہیں بناتا - خود بخود کسی نا معلوم کُنبے کے کسی فرد کی صورت، میرے نوکِ قلم پر آ جاتی ہے، جس طرح راجہ جنک کے ہل کی نوک سے سیتا کا جنم ہوا تھا - لیکن اُس خودرو بچے کا نام رکھنا آسان تھا - اس لئے کہ یہ ایک شخص کا نام تھا، کسی مضمون یا موضوع کا نام نہ تھا - لیکن میری یہ ' تصویرزادیاں ' بیشمار ہیں، وہ بے بلائے آئی ہیں، ان کے ناموں کی فہرست، میں کیوں کر پیش کروں، یا اُن کی تبویب و تقسیم کس طرح کروں ؟ میں جانتا ہوں کہ جب تک کسی شکل کے ساتھ ایک نام نہ لگا ہو اُس وقت تک اُن سے متعارف ہوجانے کا اطمینان نہیں ہوتا اس لئے میری رائے یہ ہے کہ جو حضرات ان تصویروں کو لیں اُن کا نام خود ہی رکھ لیں اور اس طرح اِن کس مپرسوں کو نام کی پناہ مل جائے۱ - "

شاعر کے ان صاف اور متواتر بیانات کے ہوتے ہوئے بھی اس کے کچھ بنگالی۱ پرستار ہیں جو ان تصویروں میں عجیب و غریب معانی دیکھتے ہیں اور دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں - مثال میں مسٹر موکل دے کو لے لیجئے جو کلکتہ آرٹ اسکول کے

---

۱ - ' ماڈرن ریویو ' جنوری سنہ ۱۹۳۳ع، صفحہ ۱۱۶ -
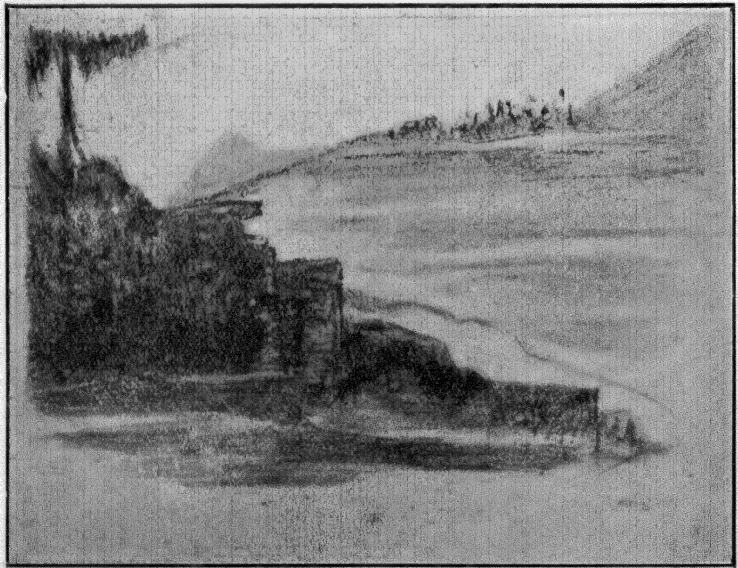
ربندر ناتھ ٹیگور کی مصوّری ۔ تیسرا دور

(بلا اجازت مصوّر)

پرنسپل ہیں - اور خود بھی مستند مصوّر ہیں - رابندرناتھ ٹیگور کی تصویروں کے ایک البم کے دیباچے میں لکھتے ہیں :—

" یہ سچ ہے کہ رابندرناتھ کی اکثر تصویروں پر ایک پُر اسرار حقیقت چھائی ہوئی ہے لیکن اگر ایک بار یہ پردہ اٹھا تو اسکا مطلب روز روشن کی طرح نمایاں ہو جاتا ہے[1] " -

یہ مثال تنہا نہیں ہے ' ہم نے اُن لوگوں کو جو شاعر کے پُر اسرار ادبی تصانیف سے واقف ہیں' ان تصویروں میں عجیب و غریب معانی پہناتے دیکھا ہے - جو لوگ شاعر کے بیانات سے بھی مطمئین نہ ہوں انکے بارے میں کیا کہا جائے - مشہور ناقدفن ڈاکٹر انند کمار سوامی کی رائے سے اس سلسلے میں مدد لینی پڑتی ہے ' وہ لکھتے ہیں :—

" رابندرناتھ ایک بڑے ذہین اور سلیقہ مند شاعر ہیں - اور وہ ایک طرح سے تمام عالم کے شہری ہیں ' ذاتی تجربے اور ایشیا و یورپ کی تاریخ دانی کے ذریعہ سے زندگی سے باخبر ہیں ' محض اس وجہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی تصویروں میں بھی خوبی اور عمق ہے صحیح نہ ہو گا - اُن میں پوشیدہ روحانی اشارات کی تلاش ایک فعل عبث ہے ' وہ اسلئے نہیں ہیں کہ پوشیدہ زبان یا پہیلی کی طرح بوجھی جائیں[2] " -

مسٹر ہلدار صداقت سے قریب تر ہیں ' وہ کہتے ہیں کہ -

" یہ تصویریں ہمیں معمّے کی طرح متحیّر بنادیتی ہیں ' لیکن

---

۱ - ' ایگزیبیشن آف ڈرائینگس بائی ربندر ناتھ ٹیگور ' دیباچہ ' صفحہ ۷ -

۲ - ' روپم ' نمبر ۴۴ - ۴۳ - ۴۲ ' صفحہ ۳۱ -

نہ اُن میں گہرے فلسفیانہ مطالب ہیں اور نہ وہ ہمیں فن مصوّری کے متعلق کسی خاص اصول کی تعلیم دیتی ہیں[1] "

تصویروں کے مطالب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ، غالباً وہ کافی ہوگا ' اصل یہ ہے کہ جس طرح ان تصویروں کے نام نہیں ہیں اسي طرح اُن کے مطالب بھي نہیں ہیں ' اُن کی اصلی خوبی جو کچھ ہے وہ ان کي شکلوں کي موزونیت اور خوبصورتي میں ہے ' اس امر میں نہیں ہے کہ وہ کسی خیال یا مطلب کو ظاہر کرتی ہیں -

فنّي قابلیت

ربندرناتھہ کي فنّی قابلیت کے بارے میں زیادہ لکھنے کي ضرورت نہیں ہے ' مسٹر ہلدار کے مذکورہ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویریں فنّی حیثیت سے کوئی نیا اصول نہیں پیش کرتیں - دراصل شاعر کي تصویروں میں فنّی حیثیت سے بہت سی خامیاں پائي جاتی ہیں لیکن مسٹر موکل‌دے شاعر کي فنّي قابلیت کي بھی بڑي ثناوصفت کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ نصف صدي سے زائد زمانے تک دنیا کے مشہور مصوّروں کي صحبت اور خود اپنے ذاتي غور و فکر کے ذریعہ ' فنّی اعتبار سے بھی ایک لطیف علم و ادراک شاعر نے حاصل کرلیا ہے -

ڈاکٹر آنند کمار سوامي کی رائے زیادہ تلخ ہے ' وہ کہتے ہیں :—

" یہ ظاہر ہے کہ شاعر نے اپنی طویل مدت حیات میں بہت سي تصویریں دیکھی ہونگي ' لیکن اس امرکا کوئي ثبوت نہیں ملتا کہ اُن کا انھوں نے غائر مطالعہ بھي کیا ہے [2] " -

---

۱ - ' روپ لیکھا ' جلد - ۳ نمبر ۱۱—۱۰ ' صفحہ ۱۱ -

۲ - ' روپم ' نمبر ۴۴ - ۴۳ - ۴۲ ' صفحہ ۳۰ -

بہرصورت اب یہ بات ظاہر ہوگئی ہوگی کہ ربندر ناتھہ ٹیگور کی تصویروں کا مقصد کوئی پیام پہونچانا نہیں ھے ' یہ تصویریں انکی تخلیقی بیچینیوں اور تفنّن طبع کے نتائج ہیں - یہ بھی ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ان کا تعلق مصوّری کے کسی اسکول یا روایات سے مطلق نہیں ھے - اِن کا تعلق شاعر کے ادبیات سے بھی نہیں ھے - یہ تصویریں بجائے خود ایک علحدہ چیز ہیں - نہ وہ مشرق کی چیزیں ہیں اور نہ مغرب کی - بنگالی اسکول کی مصوّری کے موجودہ طرز سے جسکے پیشرو شاعر کے بھتیجے ابنیندر اور گگنیندر ٹیگور ہیں اسکا تعلق قائم کرنا غلطی ہوگی -

آجکل یورپ کے فنکاروں کے بعض حلقوں میں دنیا کے وحشیانہ دَور کی تصویروں کی نقل کرنے اور انکے انداز پیدا کرنے کا رواج سا ہوگیا ھے ' مگر یہ تمام باتیں مصنوعی ہیں - لیکن ربندر ناتھہ کے یہاں ہمیں اسطرح کے حقیقی نمونے مل سکتے ہیں - ان تصویروں کی جدّت میں تو کوئی شبہ نہیں ھے - انکے مطالب نہیں ہیں ' اس لئے یہ ایک طرح سے پر اسرار بھی ہیں - بہر صورت یہ کہا جاسکتا ھے کہ ربندر ناتھہ کے تخلیقی کاموں میں اُنکی ایک حیثیت ضرور ھے -

فی الحال ان کارناموں کی قدر و قیمت ابھی مُتعّین نہیں ہوسکتی ' جب اسکے اندازے کا وقت آئیگا اُس وقت امید ھے کہ یہ امتحان میں کامیاب ہونگی ' نہ صرف اسلئے کہ اُن میں جدّت ھے ' بلکہ اسلئے بھی کہ رنگ اور خطوط کے ذریعہ سے وہ کسی حد تک اصلی خوبصورتی کے اظہار میں کامیاب بھی ہوئی ہیں - (ترجمہ)

کچھ اور بکھرے ورق

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ' ایم - اے - ' پی ایچ - ڈی -

اُردو نثر کی تاریخ میں " غالب " کے خطوں کو جو اہمیت حاصل ہے سب جانتے ہیں - جو خط چھپ چکے ہیں اُن کے متن کی تصحیح ' جو اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں اُن کی تلاش ' مکتوب اِلیہوں کے حالات کی تفتیش ' یہ سب کام اُردو ادب کی تاریخ کے مرحلے ہیں ' جن کا جلد سے جلد طے کرنا ضروری اور لابدی ہے - اِس سلسلے میں " ہندستانی " کی پچھلی اِشاعت[1] میں کچھ بکھرے ہوئے ورق ترتیب پا چکے ہیں -

اب اِس اِشاعت میں کچھ اور بکھرے ورق پیش ہیں - جن خطوں کے عکس اور نقلیں اِن میں شامل ہیں وہ اب تک شائع نہیں ہوئے تھے اور اُن کے اصل نسخے ' خود " غالب " کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ' میرے پیش نظر ہیں - یہ چند خط پچھلے چھ سات

---

۱ - بابت اکتوبر ۱۹۳۳ع ' جس میں کچھ چھاپے کی غلطیاں رہ گئی ہیں - اُن کی تصحیح یہاں کی جاتی ہے :- ص ۴۶۷ س ۱ " دونوں " کی جگہ " دنوں " ؛ ص ۴۶۸ س ۱۳ " پلدہ " کی جگہ " بندہ " ؛ ص ۴۶۹ س ۱۲ " کو - " کی جگہ " کو " ؛ ص ۴۷۱ س ۳ " وحیر کے - " کی جگہ " وحید کے " ؛ ص ۴۷۵ س ۱۰ " الھول " کی جگہ " الھی " ؛ ص ۴۷۶ س ۱۳ " لحط " کی جگہ " لحظہ " پڑھنا چاہیے ۔

برس کے عرصے میں تین مختلف جگہوں ' یعني کاکوری (اودھ) ' لکھنؤ اور دلی ' سے فراھم ھوئے ھیں - یہاں پہلے اِن کا تفصیلی بیان درج کیا جاتا ھے ؛ پھر اِسي سلسلے سے اصل خطوں کا متن دیا جائے گا :-

(الف) - کاکوري والا خط -

ایک دوورقا (ساڑھے ۵ × ساڑھے ۷ انچ ' سطر کي لمبائی : ساڑھے ۴ انچ) ' پہلا اور چوتھا صفحہ سادہ ' دوسرے پر خط کا آغاز ' تیسرے پر اختتام - کاغذ بہت کھردرا ھے چنانچہ قلم کی رکاوٹ کے آثار اصل میں نمایاں ھیں اور غالباً اِسي لیے خط کی شان کسی قدر بدلی ھوئی معلوم ھوتی ھے - عکس پورے خط کا دیا جاتا ھے - کتابت کي تاریخ سرنامے پر لکھی تھي ' جس میں دن کا ھندسہ اور مہینے کا پہلا حرف کیڑوں کے نذر ھو گیا ' سنہ لکھا ھي نہ تھا - اِس کے بعد ھي کی سطر اور پھر گیارھویں سطر اور اخیر سطر کرم‌خوردہ ھے ' مگر لفظ پڑھ سب لیے جاتے ھیں - پھر بھي جو حرف یا لفظ کٹ گئے ھیں اُن کو میں نے نقل میں پورا کر کے کھنی دار خطوں میں رکھا ھے -

مکتوب اِلیہ کا نام نہیں ھے ' مگر اِس فقرے سے کہ " تمہارے ابوالآبا کا . . . . غلام ھوں علیہ‌الصلوۃ و علیہ‌السلام " اِتنا معلوم ھوتا ھے کہ مکتوب اِلیہ " علوي " ھے - آگے چل کے یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ نواب مصطفی خاں " شیفتہ " کے ملنے والوں میں سے ھے - یہ خط مشکور علی صاحب علوي کاکوروی کی ملک ھے اور مکرمی مولوی ضیاءالحسن صاحب علوي کاکوروي ' رکن ھندستانی اکیڈیمي ' [۱] کے توسط سے مجھ تک پہنچا ھے - مشکور علي

---

۱ - میں اِن دونوں صاحبوں کا شکرگذار ھوں کہ اِنھیں کي مہرباني سے اِس جواھر کے ٹکڑے کی اِشاعت ممکن ھوئي -

صاحب کے والد حکیم محب علی مرحوم[۱] کے متعلق بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ "غالب" سے خط کتابت کے ذریعے اصلاح لیا کرتے تھے اور یہ پہلا خط ہے جو غالب نے اُن کے خط کے جواب میں بھیجا تھا - قیاس چاہتا ہے کہ اِس کے بعد اور خط بھی حکیم صاحب کے نام لکھے گئے ہوں گے ' مگر جہاں تک دریافت ہو سکا ' اور کوئی خط اِن کے گھرانے والوں کے قبضے میں نہیں ہے -

اِس خط کی تحریر کی ٹھیک تاریخ کا تعین ممکن نہیں ' مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کا زمانہ ۱۸۶۳ اور ۱۸۶۵ء کے درمیان ہوگا -

---

۱ - مولوی حافظ علی حیدر صاحب علوی کاکوروی کی تالیف "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" (لکھنؤ ۱۹۲۷ء) میں جو حالات اِن کے خاندان والوں کے ملتے ہیں اُن کے حساب سے یہ حضرت محمد ابن الحنفیہ کی بتیسویں پشت میں تھے - اِن کے آبا و اجداد میں بڑے بڑے صوفی اور عالم باعمل ہو گذرے ہیں اور اِن کے پردادا ' شیخ محبوب عالم ' اٹاوے کے چکلیدار تھے - اِس سلسلے سے اِن کے خاندان کے کچھ لوگ اُس نواح میں جا بسے - اِن کے دادا ' شیخ عاشق علی ' ملازمت کے سلسلے میں گلاؤٹھی (ضلع میرٹھ) میں بھی رہے تھے - اِن کے باپ ' حکیم مشتاق علی ' مین پوری میں مطب کرتے تھے اور اُس سے پہلے آوا (ضلع ایٹہ) میں تھے - خود حکیم محب علی بھی مین پوری میں رہے - مطب بھی کرتے تھے اور وکالت بھی - اِن کے اور رشتہ دار بھی اکثر اٹاوے اور مین پوری میں رہتے تھے - اِن سب باتوں پر نظر کیجیے تو یہ بات بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ "شیفتہ" کے احباب میں سے ہوں اور اِسی تعلق سے میرٹھ بھی گئے ہوں اور ہاں "غالب" سے ملاقات ہوئی ہو جس کا ذکر اِس خط کی اِبتدائی سطروں میں ہے -

(ب) ـ لکھنو والا خط ـ

"یہ خط غالب" کے اُردو دیوان کی تیسری[1] اِشاعت (مطبع احمدی، دهلي) کے ایک نسخے کے اخیر صفحے (یعني ص ۸۸) کے حاشیے پر ترچھا ترچھا لکھا ھے - اور پندرہ چھوٹي چھوٹي سطروں میں تمام ھوا ھے ـ

مطبع احمدي والا دیوان ۲۰محرم ۱۲۷۸ھ کو چھپا تھا اور اُس کي کاپیاں "غالب" نے خود دیکھي تھیں مگر پھر بھی غلطیاں رہ‌گئیں - چنانچہ لکھتے ھیں[2] :-

> "هر کاپي دیکھتا رھا ھوں . . . اب جو دیوان چھپ چکے، حق تصنیف ایک نسخہ کو ملا - غور کرتا ھوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ھیں یعني کاپی لگارنے نہ بنائے - ناچار غلطنامہ لکھا" ـ

غالباً یہی ناپسندیدگي سال ھي بھر کے اندر دیوان کی تازہ اِشاعت کی محرک ھوئی ـ اِس چوتھي اِشاعت کے لیے "غالب" نے تیسری اِشاعت کے ایک نسخے کی تصحیح کرکے اُسي کي پشت پر محمد حسین خاں کو رقعہ لکھ دیا کہ اب یہ بالکل صحیح ھے، اِسے چھپنے کے لیے بھیج دو ـ محمد حسین خاں نے اُسے مطبع نظامی، کان‌پور، بھیجا اور اُسي سال ذي‌الحج کے مھینے میں

---

۱ - اردو دیوان ۱۲۷۵ھ (م ۱۸۵۹ م) سے پہلے دو بار چھپ چکا تھا - چنانچہ "غالب" کہتے ھیں : "اُردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ھیں" (اردوے معلیٰ، ص ۲۷۷) - تیسري دفعہ مطبع احمدي دهلي میں چھپا - اِس چھاپے خانے کے مالک محمد حسین خاں اور مھتمم مرزا اموجان تھے (اردوے معلیٰ، ص ۱۱۵)-

۲- اردوے معلیٰ ص ۱۱۵ ـ

وهاں دیوان چھپا[1] جس میں مطبع نظامی ، کانپور کے مالک کی طرف سے یہ اطلاع درج ہے :-

" محمد حسین خاں صاحب دهلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا - میں نے بافضال ایزدی مطابق اُس نسخے کے شہر ذی‌حجہ سنہ ۱۲۷۸ھ میں مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا " -

یہ نسخہ جس کے اخیر صفحے پر " غالب " نے رقعہ لکھا تھا کوئی سات آٹھ برس ہوئے لکھنؤ کے نخاس میں پان سات پیسے کو بکا اور خریدار کی اجازت سے مکرمی سید عابد رضا صاحب (سب جج) نے مجھ پر کرم فرما کے اُس کے اخیر صفحے کا عکس کھنچوا کر مجھے بھیجا - صفحے کی بائیں جانب نیچے کے کونے میں " غالب " کی مہر ہے جس میں " نظام جنگ بہادر " صاف پڑھا جاتا ہے - نیچے کا حصہ اُٹھا نہیں ، اُس میں " نجم الدولہ دبیرالملک " ہوگا - اِس صفحے کے اوپر کے حصے پر فارسی خاتمے کا پچھلا حصہ آگیا ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں :-

" ازمن یادگارے و برائے دیگران تذکارے باد - "

اِس کے بعد دو تاریخی قطعے ہیں ، پہلا نواب ضیاء الدین خاں " نیر " کا ، دوسرا مرزا یوسف علی خاں " عزیز " کا لکھا ہوا:-

(۱) ہوا ہے حضرت " غالب " کا منطبع دیوان
صلائے فیض بہ گویندگان ریختہ ہے

۱- اِس چوتھی اشاعت کا ایک نسخہ حبیب گنج (علی گڑھ) کے کتب خانے میں موجود ہے- (دیکھو " کانفرنس گزٹ " علیگڑھ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۲م ، ص ۲)-

یہی کتاب ہے جس میں کہ اوستادانہ
بیان ریختہ ہے اور زبان ریختہ ہے
بنائے ریختہ اُستاد ہی نے ڈالی ہے
اُسی سے قائم اساس جہان ریختہ ہے
زمین شعر میں اُترا ہے لشکر ابیات
سو یہ رسالۂ نامی نشان ریختہ ہے
" بنای ریختہ "[۱] اک ' اور دوسری تاریخ
بہ ذہن " نیر " رخشاں " بیان ریختہ "[۱] ہے

---

(۲) سرو ریاض فضل محمد حسین خاں
ہیں رونق بہار گلستان ریختہ
کہتے ہیں شعر خوب سمجھتے ہیں شعر خوب
" تحسین " تخلص[۲] اور زباں‌دان ریختہ
چھاپا اُنھوں نے حضرت " غالب " کا کلیات
وہ کلیات جس سے بڑھی شان ریختہ
[غالب کا] میرزا اسداللہ خاں ہے نام
ہے واقعی وہ شیر نیستان ریختہ
لکھی " عزیز " خستہ نے تاریخ اِنطباع
حاسد کے سر کو کاٹ کے " دیوان ریختہ "[۳]

---

۱ ۔ ۱۲۷۸ ھ ۔

۲ ۔ نساخ ' سخن شعرا ' ص ۸۳ ۔

۳ ۔ " حاسد " کے سر حرف یعنی ۸ کے تخرجے سے مادہ نکلتا ہے ۔

اِس کے بعد اُردو خاتمے کی عبارت ھے : '' عبارت خاتمۂ دیوان - داد کا طالب غالب گزارش کرتا ھے ... . الخ[۱] '' اور اُس کے آگے چھاپےخانے والوں کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی تاریخ اور اشتہار وغیرہ - '' عبارت '' کے لفظ سے لے کر آخر تک جتنی سطریں ھیں سب پر غالب نے قلم پھیر دیا ھے -

(ج) - دلی والا خط -

ایک کاغذ کا بند (پونے ۶×۱۶ اِنچ ' سطر کی لمبائی : کما بیش ۵ اِنچ) - کل ۷۲ سطریں ھیں جن میں سے ۴۳ ورق کے رو پر اور باقی ۲۹ پشت پر - اخیر چار سطریں اور سطروں کی اُدھی ھیں - اِن کے سامنے بائیں جانب مہر ھے جس میں '' غالب ۱۲۷۸ '' صاف پڑھا جاتا ھے - کتابت کی تاریخ درج نہیں مگر مہر کے سنہ سے یہ نتیجہ نکلتا ھے کہ ۱۸۶۲ ع کے بعد یہ خط لکھا گیا - اِسی خط کے ساتھ ایک رقعہ بھی ملا ھے (جس کا تذکرہ ' د ' کے تحت میں آگے آتا ھے) -

مکتوب اِلیہ مولوی ضیاءالدین خاں '' ضیا '' دھلوی ' بستی دارا پور کے سابق رئیس کے پوتے تھے -

اِس طویل خط سے معلوم ھوتا ھے کہ فارسی زبان کی صرف نحو اور تاریخ پر '' غالب '' کی نظر کتنی گہری تھی - اِس بحث پر شائد یہ اُن کی سب سے زیادہ مفصل تحریر ھے -

(د) - دلی والا رقعہ -

کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا (۶×۴ انچ) جس پر چھے سطریں

---

۱ - '' حسرت '' کی شرح دیوان غالب کے آخر میں یہ پوری عبارت درج ھے -

بارے اس صورت میں کیا لکھوں گا اور کیا لکھوں گا۔ مکرّم و معظم نواب مصطفیٰ خاں کو دعا

کہ میں اب شعر نہیں کہتا۔ اللہ اللہ لا موجود الا اللہ ۱۲ غالب ۱۲

(پیمانہ : اصل کا ۵ بٹے ۶)

سوا تین تین اِنچ لمبی ہیں ' ساتویں سطر میں صرف تاریخ :
" ۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۶ " - یہ اور (ج) دونوں ایک ساتھ تھے' اِس لیے
خیال ہوتا ہے کہ یہ رقعہ بھی مولوی ضیاءالدین خاں کو لکھا گیا تھا -

اِن چاروں چیزوں کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے :--

(الف)

چہار شنبہ [۱۸ جنـ]ـوری ہنگام نیمروز

بندہ پرور ' آپ کی تحریر سے مستنبط ہوتا [ہے کہ آ]پ مجھ سے
میرٹھ میں [ملے تھے] مگ[ـر] میں ہرچند یاد کرتا ہوں ؛ مجھ
کو وہ صحبت اور آپ کی ملاقات کی صورت یاد نہیں آتی - بہر حال
اِرسال مسودات کی خواہش مقبول اور حک و اصلاح کی خدمت
بجا لانی بہ دل منظور - تمہارے ابوالآبا کا ' کہ وہ ابوالائمہ بھی ہے '
غلام ہوں ' علیہ الصلوۃ و علیہ السلام ۱؎ -

" ماہ نیم ماہ "۱ مانگتے ہو ؛ یہ نہیں جانتے ہو کہ وہ آسمان ہی
ٹوٹ پڑا جس پر ماہ نیم‌ماہ طلوع کرتا - بات یہ ہے کہ جس طرح

---

۱ - حبیب‌اللہ " ذکا " حیدرآبادی کو غالب ایک فارسی تحریر مورخۂ سہ شنبہ۱
یا زدہم ربیع‌الاول ۱۲۸۷ھ [م ۱۷ ستمبر ۱۸۶۱ء] میں لکھتے ہیں:-

"ماہ نیم‌ماہ " می خواہند - آن خود اِسمیست کہ مسمی ندارد - چون
از سرنوشت گردش نتوان پیچید سرگزشت بازگویم : ہرگاہ این‌نیمہ از " پرتوستان "
انجامید و "مہرنیمروز " نام یافت ' تانفس راست کردہ آید لختے درنگ ورزیدہ شد - ناگاہ
کارفرما را روز فیروزئ و روزگار سرآمد و دولت دیرینۂ ترکمانان قراچاریہ سپری گشت -
"ماہ نیم ماہ " ہم چون ماہ بست و ہشت‌شبہ ناپدیدار و نام وے بلہ عنوان بے نشانی در

مسافر سفر میں آدھی منزل طے کرکے دم لیتا ہے ' میں نے آدم سے ہمایوں تک کا حال لکھ کر دم لیا تھا ۔ قصد تھا کہ اب جلال‌الدین اکبر کی سلطنت کا حال لکھوں گا کہ ناگاہ یہ فتنۂ عظیم حادث ہوا اور اکبر و ہمایوں کے خاندان کا[؟] نام و نشان جاتا رہا ۔ عرفت ربی بفسخ[۱] العزائم ۱۲ ۔

" پنج آہنگ " ' " مہرنیمروز " ' " دستنبو " ' " قاطع‌برہان " ' " دیوان اُردو " ' یہ پانچ رسالے البتہ کتب میں شمار کیے جائیں ' " باد مخالف " کئی ورق کی ایک مثنوی ہے ' منجملہ اُن مثنویوں کے جو " کلیات نظم فارسی " میں مندرج ہیں ۔ بجائے خود کتاب نہیں ہے ۔ ہاں ' یہ تو فرمائیے کہ " قاطع بر[ہان] " آپ کے ہات کہاں سے آئی ؟ شاید نواب مصطفی خاں صاحب سے آپ نے لی ہوگی ۔ ماخذ " قاطع برہان " ضرور لکھیے ۱۲ ۔

" مہرنیمروز " آشکار ماند۔ ہستی ناپذیرفتہ را چون نرستم " (کلیات نثرغالب' نولکشوری ص ۲۲۶- نیزدیکھو " یادگارغالب " اِلہ‌آباد ۱۹۳۱ ع' ص ۳۱-۳۲م)- اِس کی حقیقت یوں ہے کہ دلی کے اخیر تاجدار نے " غالب " سے فرمائش کی کہ وہ ایک تاریخ آل تیمور کی فارسی میں مرتب کریں ۔ تالیف کی صورت یہ تھی کہ شاہی دفتر کے کارپرداز حالات کا خلاصہ اُردو میں لکھ کر مرزا غالب کے پاس بھیج دیتے تھے یہ اُس کی فارسی بنا کے حوالے کر دیتے تھے ("یادگار" ص ۵۶) - کل کتاب کا نام " پرتوستان ' تجویز کیا تھا ، پہلے حصے کا " مہرنیمروز " اور دوسرے کا " مہرنیم‌ماہ " (کلیات نثر ' ص ۲۸۳)- پہلا ہی حصہ مرتب ہونےپایا تھا کہ غدر ہوپڑا اور " ماہ‌نیم‌ماہ " کا نام‌ہی نام رہ گیا (اردوے معلی' ص ۲۷۲)-

۱ - اصل نسخے میں " بلافسخ " ہے - اِسی طرح (ج) کے آخرکی ایک سطر میں " بلاالوت " لکھا ہے - عربی عبارت میں " بفسخ " اور " بالوت " لکھنا چاہیے تھا -

(ب)

خط کی عبارت اِس جانب ہے

اِس جانب جو عبارت ہے وہ مطبوعہ دیوان کی چھپی ہوئی عبارت ہے
جس پر " غالب " نے قلم پھیر دیا ہے

گمان زیست بود بر ملت ز بےدردی
بد است مرگ ولے بدتر از گمان تو نہست[1]

ھے ھے ! تم اب تک یہ جانتے ھو کہ ''غالب'' شعر کہتا ھے یا کہہ سکتا ھے - ایک پانو رکاب میں ' ایک ھات باگ پر - اِس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا ؟ اخ مکرم و معظم نواب مصطفیٰ خاں گواہ ھیں کہ میں اب [شا]عر نہیں کہتا - اللہ اللہ ' لاموجود اِلا اللہ ۱۲ غالب ۱۲

(ب)

جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے - دو رات دن کي محنت میں میں نے اِس نسخہ کو صحیح کیا ھے - غلط نامہ بھي اِسي میں درج کر دیا ھے - گویا اب غلط‌نامہ بیکار محض ہوگیا ھے - خاتمہ کي عبارت ' کیا میرا بیان کیا میر قمرالدین[2] کا

---

۱ - اِس شعر کے لکھنے سے پہلے '' تم‌اب '' لکھ گئے تھے ' اُسے کاٹ‌کر شعر لکھا (دیکھو عکس) - یہي شعر مرزا تفتہ کے نام کے ایک خط میں لکھتے ھیں (اُردوے معلیٰ ' ص ۴۷)

۲ - اُردو دیوان کي تیسري اِشاعت کے خاتمے کي عبارت سے (جسے '' غالب '' نے قلمزد کر دیا ھے) معلوم ھوتا ھے کہ میر قمرالدین اور محمد حسین خاں دونوں دیوان کي چھپائی کے انتظام اهتمام میں شریک تھے : '' مخلص وداد‌آئین میر قمرالدین کي کار فرمائي اور خاں صاحب الطاف‌نشان محمد حسین خان کي دانائي مقتضي اِس کي ھوئي کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ھوا '' - غالباً یہ میر قمرالدین وھي ھیں جو اکمل‌المطابع دھلي کے مہتمم تھے اور '' درفش کاویاني '' اُس چھاپےخانے میں اِنھیں کے اهتمام سے ۱۲۸۲ ھ میں چھپي - محمد حسین خاں '' تحسین '' مطبع مصطفائي ' دھلي ' کے مالک تھے - معلوم ھوتا

اظہار ' اب کچھ ضرور نہیں - کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی - یہ مجلد گویا مسودہ ھے - اِسي کو بھیج دیجیے - غالب ۱۲ -

---

(ج)

بخدمت مولوي صاحب معظم ' مسلم علماے عرب و عجم ' مولوي ضیاءالدین خاں صاحب '' ضیاء '' دھلوي ' نبیرۂ نواب سابق بستی دارا پور -

جناب مولوي صاحب ' میں نے ایام دبستاں‌نشیني میں '' شرح مائۃ عامل '' تک پڑھا - بعد اُس کے لھو و لعب ' اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و طرب میں منہمک ھو گیا - فارسي زبان سے لگاو اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبیعی تھا - ناگاہ ایک شخص وارد ھوا[1] کہ ساسان پنجم[2] کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوي فضل حق مرحوم[3] کا نظیر اور مومن موحد و

ھے کلا یلا '' غالب '' کے خاص عقیدت مندوں میں نلا تھے ' ورنہ امین‌الدین '' امین '' کي '' قاطع القاطع '' اِن کے مطبع مصطفائي میں نلا چھپي ھوتي -

۱ - '' وارد ھوا '' یہاں زائد ھے - غالباً سہواً لکھا گیا تھا اور نظر ثاني میں قلمزد ھونے سے رہ گیا -

۲ - دیکھو '' درفش کاویاني '' ص ۷ اور '' یادگار غالب '' ص ۳۴۴ حاشیہ ۲ -

۳ - یعني فضل حق خیرآبادی جو اپنے زمانے میں علوم معقول کے بڑے ماھر بلکہ اِمام تھے - '' غالب '' کے خاص دوستوں میں تھے - ولادت ۱۲۱۲ھ ؛ وفات ۱۲۷۸ھ -

[illegible] حضرت مولوی صاحب [illegible]

جناب مولوی صاحب! میں نے ایام [illegible] عامل [illegible]

مجھ و عیش [illegible] ہو گیا فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری طبیعت تھا ناگاہ ایک

شخص وارد ہوا [illegible] ساسانی نجم کی نسل میں سے [illegible] منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن

موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحت اور غوامض فارسی آمیختہ بعربی

اس سے معلوم ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا ذہن معوج تھا زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ

جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی۔

اہل پارس جو قدم عالم کے قائل ہیں وہ مثل ہنود کے آفرینش عالم کا آغاز و انجام و سر و بن نہیں بتاتے

ہمارے مذہب کے موافق ہیں کیومرث وغیرہم کی سلطنت کو دو چار ہزار برس سے کم نہ گزری ہوگی تاآنکہ اور

خط کی ابتدائی سطریں

(پیمانہ : اصل کا تقریباً ۵ بٹہ ٦)

[illegible] السلام بہ الوف الاحترام

یہ ہمارا رقعہ بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے

استفتا کے کاغذ کے ساتھ مجھکو واپس

ملے [illegible] نجات کا طالب غالب ۱۲

خط کی اخیر سطریں

(پیمانہ : اصل کے مطابق)

صوفی صافی تھا ' میرے شہر میں وارد ہوا ؛ اور لطائف فارسیء بحت[1] اور فوامض فارسیء آمیختۂ بعربی اُس سے میرے حالی ہوئے - سونا کسوتی پر چڑھ گیا - ذہن معوج نہ تھا ' زبان دری[2] سے پیوند ازلی اور اُستاد بے مبالغہ جاماسپ[3] عہد و بزرجمہر[4] عصر تھا - حقیقت اِس زبان کی دلنشین و خاطرنشاں ہو گئی ۱۲ -

اہل پارس جو قدم عالم کے قائل ہیں وہ ' مثل ہنود کے ' آفرینش عالم کا آغاز و انجام و سر و بن نہیں بتاتے - ہمارے مذہب[5] کے موافق بھی کیومرث[6] وغیرہم کی سلطنت کو دو چار ہزار برس سے کم نہ گزرے ہوں گے - تالہٰ اور نجوم اور طب اور فقہ اور اِنشا اور اِنشاد کون سا علم اور کون سا فن ہو گا جو اُس گروہ میں نہ ہو گا - سکندر جب ایران پر مسلط ہوا تو ارسطو نے کتاب‌خانۂ

---

۱ - '' خالص '' ' '' بے میل '' -

۲ - '' دری '' اُس زبان کو کہتے تھے جو پارس کے اعلیٰ طبقوں کے لوگ بولتے تھے جیسے ہمارے ہاں دلی کی '' اُردوے معلیٰ '' - یہی زبان فارسی کی تحریری زبان قرار پائی جو آج تک قائم ہے -

۳ - یہاں شاہ جاماسپ ابن پیروز مراد نہیں بلکہ حکیم جاماسپ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ایک بڑا مدبر وزیر تھا -

۴ - بزرگمہر (ابن بختگان) قصے کہانیوں کی رو سے نوشیرواں کا رزیر اعظم اور بڑا باتدبیر وزیر تھا ' مگر تاریخی ماخذوں میں اِس کا نام نہیں آتا -

۵ - مسلمان مورخوں کی تصنیفات مراد ہیں -

۶ - کیومرث ' قدیم ایران کے عقیدے کے مطابق پہلا انسان تھا - یہ گویا '' آدم '' کا درسرا نام ہے - اِس کا تلفظ '' کیومرث '' اور '' کیو مرت '' بھی ہے -

دارا سے بہت سے علوم یونانی زبان میں نقل کیے - اللہ اللہ ، اُس گروہ کو دیکھیے جن کا کلام علم حکمت میں حکماے یونان کا ماخذ ہو - اگر ابو علی سینا ، قابوس وشمگیر[1] کے کتاب‌خانے سے کتب حکماے یونانیہ لےکر مطالب حکمی کو زبان عرب میں نقل نہ کرتا تو اکابر عرب میں سواے مسائل فقہیۂ شرعیہ علم معقول کا نشان نہ پایا جاتا ۱۲ -

دو تین ہزار برس قبل آج سے ، کہ عرب و عجم بیگانۂ ہمدگر تھے ، اہل پارس اپنے مطالب علم بلکہ علوم متنوعہ کو کس زبان میں شرح کیا کرتے تھے اور تعلیم و تعلّم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا ؟ بے شبہہ وہ الفاظ پارسی ہوں گے - جب خلیفۂ ثانی کے عہد میں یزدجرد مارا گیا[2] اور پارس پر اعراب مسلط ہوئے ، درفش کاویانی کا جواہرآمود چمڑا پارہ پارہ ہو کر غازیان اِسلام پر بٹ گیا - کتابخانے پارس کے ، کیا بادشاہی اور کیا امرا و رعایا کے ، چولھے میں جھونکے گئے ، یعنی اُن سے حمام گرم ہوئے ، جیسا کہ میں نے ایک جگہ اِسی واقعہ کو فارسی عبارت میں لکھا ہے - و ہی ہذا : کتابخانہاے پارسیان افروزیندۂ گلخن گرمابہ‌ہاے بغداد شد - ہمانا احکام آتش‌پرستی ہم بہ آتش باز گشت "[3] اگرچہ بلاغت

---

۱ - امیر شمس‌المعالی قابوس ابنِ وشمگیر ، طبرستان کا فرمانروا (۳۶۶-۴۰۳ھ) -

۲ - ساسانی خاندان کے آخری شہنشاہ یزدگرد نے آخری شکست ۲۳ ہجری (م ۶۴۴ع) میں کھائی اور اُسی سال حضرت عمر کی شہادت واقع ہوئی ، مگر یزدگر مارا ۳۱ ھ (م ۶۵۱ع) میں گیا - اِس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ " خلیفۂ ثانی کے عہد میں مارا گیا " - " یزدجرد " اِس نام کی معرب صورت ہے -

۳ - یہ سراسر شاعری ہے - بغداد اِس زمانے کے بہت بعد مسلمانوں کا مستقر

خاص اہل عرب کے حصے میں آئی ہے ' لیکن فصاحت میں اہل پارس بھی اعراب کے شریک ہیں - بالجملہ اعیان عجم و بلغاے عرب میں اِمتزاج و اِختلاط و مہر و محبت و قرب و قرابت پیدا ہوئی - اِختلاف مذھب اُٹھ گیا تھا ؛ امور ریاست و سیاست بصلاح و صوابدید فریقین ہونے لگے تھے - طبیعتیں تھیں دراک ؛ فارسي و عربي کو باھم ربط دے کر ایک اُردو پیدا کیا[1] - سبحان اللہ وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ مزا ' نہ نری عربي میں وہ ذوق - زبان فارسي کے قواعد کے کتب خاکستر ہو گئے تھے[2] - اُس پر طرہ یہ کہ عربی کے قواعد کے بڑے بڑے جلیل‌القدر رسالے مرتب ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے - بیچارہ فارسي زبان ' غریب الوطن بےسر و سامان ' نہ اِس کی کوئی فرھنگ ' نہ اِس کے قوانین کا کوئی رسالہ ' نہ علم پارسي کا کوئي عالم باقي - دو چار ہزار لغت و اسم وفعل زباں زد اہل عصر ہوں گے - فارسی کا صرف کہاں ' فارسی کا نحو کہاں ؟ فارسي زبان اعراب کی لونڈي ' جو چاھا نام رکھ دیا :

قرار پایا - اِسي طرح یہ بھي صحیح نہیں کہ یونانیوں نے علم حکمت ایران سے اخذ کیا - البتہ یونانیوں نے ایران کی تاریخ ' جغرافیا وغیرہ کے متعلق حالات دریافت کر کے اپني تصنیفوں میں درج کیے ' جن کے سوا ایران کے اُس دور کي تاریخ کا آج کوئي اور ماخذ نہیں -

۱- " اُردو " سے مطلب ھے وھی " فارسي آمیختہ بہ عربي " (یعني " اُردو " کو " ریختہ " کا ہم‌معني مان کر)-

۲- آج کل بعضے لوگ سمجھتے ھیں کہ مونث کی عربي جمع کو مذکر بولنا لکھنؤ کے ساتھ مخصوص ھے - مگر غالب کي تحریر سے پوري طرح ثابت ھوتا ھے کہ دلي کے فصیحوں کی زبان بھی یہي تھي -

" ضوء النهار " کہہ کر پکارا ' " شمس النہار " کہہ کر یاد کیا ' " او لونڈي ' اری چھوکری " کہہ کر بلا لیا - سو بھي جو اکابر فریقین موجد اُردو زبان ہوئے تھے وہ تسمیۂ قواعد فارسي کي طرف متوجہ نہیں ہوئے - سنہ ۸۰۰ یا سنہ ۹۰۰ ہجري میں ہوسناک لوگ فارسي کي فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے - نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں - یہاں تک کہ قتیل نومسلم لکھنوی ' اور ملا غیاث الدین ملاے مکتب‌دار رامپوری[1] ' اور کوئي روشن علي جونپوری[2] ' اور کہاں تک کہوں کون کون ؛ جس کے جي میں آئي وہ متصدی تحریر قواعد اِنشا ہو گیا - میں اُن سب کو یا اُن میں سے مختص فلاں و بہماں کو اپنا مطاع کیوں‌کر جانوں اور کس دلیل سے اُن کے تحکم کو مانوں ؟ ۱۲

پارسیان سابق ' جو جانتے نہ تھے کہ فاعل کس کو کہتے ہیں اور جمع کس مرض کا نام ہے ' امر کا صیغہ کون جانور ہے اور اِسم جامد کس قسم کے پتھر کو کہتے ہیں ' اُنہوں نے کبھی نہ کہا ہوگا کہ " دانا " و " بینا " صیغۂ اِسم فاعل اور " نالاں " و " گریاں " صیغۂ فاعل یا حالیہ ہے - ایک جماعت نے کہہ دیا کہ الف‌نون اِفادۂ معنیء فاعلیت کرتا ہے ' ایک صف پکار اُٹھي کہ الف‌نون حالیہ ہے - خدا جانے اہل پارس صیغۂ امر کو اپني زبان میں کیا کہتے ہوں گے اور الف فاعل کا اُن کي لسان میں کیا نام ہوگا - آخر یہ فن امور دیني میں سے تو نہیں ہے کہ : ' جو اِمام‌اعظم

۱- صاحب " غیاث اللغات " - (نیز دیکھو " اردوے معلی " ص ۲۲۶ : " عودھندي " ص ۱۵۷)

۲- قواعد فارسي پر اِن کي تصنیف اُس زمانے میں مدرسوں کے نصاب میں داخل تھي اور کئی بار چھپي -

کے قول کو نہ مانے وہ مرتد ہے ؛ قوت قیاس کا مادہ اوروں میں تھا ' ہم کو مبداء فیاض سے یہ قوت عطا نہیں ہوئی ' - اور پھر الف نون حالیہ کے وجود کے اعتراف میں میں ہی منفرد نہیں ہوں ؛ بقول تمھارے اور اشخاص بھی ہیں ۔ سوال اِسی قدر ہے کہ الف نون حالیہ موجود ہے یا نہیں - سائل کا جواب وہیں تمام ہوا جہاں[1] تم نے فرمایا کہ ' سابقین '' افتان '' و '' خیزان '' کے الف نون کو حالیہ لکھ گئے ' لاحقین نے کہا کہ یہ الف نون فاعل کا ہے ' -- خیر ایک تردد اگر پیدا ہوا ' تو تسمیہ میں پیدا ہوا ؛ متاخرین کا قول متقدمین کے کلام کا ناسخ اور الف نون حالیہ کے وجود کا مبطل تو نہیں ہوا - بہر حال یہی لکھ دو کہ بعض لوگ اِس الف نون کو فاعل کا الف نون بتاتے ہیں اور بعض الف نون حالیہ کہتے ہیں -- قصہ مختصر - کاغذ اِستفتا مع دستخط حضرات یا بے دستخط کل میرے پاس بھیج دیجیے ۱۲ -

تھوڑی سی تقریر ' اگرچہ خارج از مبحث ہے ' لیکن اِس واسطے وہ تقریر تحریر میں لاتا ہوں کہ پھر مجھے کچھ لکھنا نہ پڑے - اہل پارس کے[2] منطق میں '' روان '' و '' دوان '' مع نظائر ' کہ وہ بہت ہیں ' کسی اِسم کے ساتھ مختص نہیں[3] - اہل عرب نے بلکہ ' توبہ توبہ میں اُن کو کیوں متہم کروں ' فرہنگ

---

۱ - ورق کا پہلا صفحہ یہاں تمام ہوتا ہے -

۲ - '' کے منطق میں '' یعنی '' کی زبان میں '' - زبان یا محاورے کے معنی میں غالب '' منطق '' کو مذکر بولتے ہیں (دیکھو '' عود ہندی '' ص ۱۵۷) - اِس پر بھی '' غالب '' کی نکتہ رسی کی داد دینا چاہیے -

۳ - یعنی اہل پارس نے اُس کے لیے کوئی اِصلاح معین نہیں کی -

نگاران هند نے یہ نام موافق اپنے قیاس کے رکھے - ہم اِفادۂ معنیء فاعلیت لینے والوں کے قیاس کو نہیں مانتے ؛ الف نون حالیہ کہنے والوں کی ہم نے مطابقت رائے کی ہے - فارسی میں اِسم فاعل دو صورت پر ہے : یا " گویندہ " یا " گویا " - صیغہ‌ہاے امر کے مابعد جو الف‌نون ہے وہ حالیہ ہے ؛ ہاں ' فعل کا ایک توہم سا گزرتا ہے - سو اگر بہ اِمعان نظر دیکھیے ' تو ویسا ہی ایک وہم مفعولیت کا بھی پایا جاتا ہے - پس' نظر اِس بات پر کہ فاعلیت کی حالت اور مفعولیت کی حالت معاً پائی جاتی ہے ' یہ الف نون حالیہ ہے اور اپنے وجود کے اِثبات میں قواعد نحویۂ عربیہ کا محتاج نہیں - خاص[۱] " اُفتادن " میں دیکھو کہ نہ " اُفتندہ " مستعمل ہے ' مثل " گویندہ " ؛ نہ " اُفتا " مسموع و موجود ہے ' مثل " گویا " - " اُفتان " صیغۂ فاعل کہاں سے آگیا ؟ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ " اُفتان " کو ہم اِسم فاعل جب مانتے ' کہ " اُفت " و " بیفت " بمعنیء امر اہل زبان کی ' یعنی جو مالک ملکۂ اُردوے فارسی و عربی[۲] ہیں اُن کی ' نظم و نثر میں آیا ہوتا - اصل مادۂ " اُفتان " جو " اُفت " ہے موجود ہی نہیں ؛ " اُفتان " کہاں سے بمعنیء فاعل نکل آیا ؟ مگر ہاں ' گرنے کی حالت جس پر طاری ہو وہ " اُفتان " ہے ' از روے حالت ' نہ بحسب فعل - " میرندہ " کہو ' " مردن " میں سے کیوں نہ بنایا ؟ صیغۂ فاعل متروک رہا ' صرف صیغۂ مفعول یعنی " مردہ " پر قناعت کی - اور یہ جو قبلۂ اہل سخن فردوسی طوسی علیہ‌الرحمہ کے ہاں آیا ہے :-

---

۱ - غالباً " خاص کر " لکھنا مقصود تھا ؛ " کر " سہواً چھوٹ گیا -

۲ - " اُردوے فارسی و عربی " سے مراد وہ فارسی زبان ہے جس میں عربی کی آمیزش ہے -

جناب مولوی صاحب کرم از شما و کمی از ما اچھون کے ساتھہ

سب بھلائے کرتے ہین بزرگون کے ساتھہ نیکی کرنی

جوانمردی ہے اگر اپاہج نہوتا فوراً آپکے پاس پہنچتا اب

متوقع ہون کہ آج اسوقت یا اور وقت مگر آج ہی

آپ تشریف لائین اور ضرور تشریف لائین شام

تک چشم براہ رہونگا عنایت کا طالب غالب ۱۲

۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۶

(پیمانہ : اصل کے مطابق)

"ممیران" کسے را و ہرگز "ممیر"

مجاز ہے ' امر بھي اور تعدیہ بھي - متاخرین میں سے بھي عبدالقادر "بیدل" کہتا ہے :—

بمیر' اے سرکش ناپاک ! تا یکدم بیاسائی -

بلکہ اُردو میں بھی گراں‌جان آدمي کو کہتے ہیں : "ابے فلاں کے فلاں ! مرچک" - "سودا" کہتا ہے :—

جیتا رہے گا کب تلک ' اے خضر ! مرکہیں -

یہ سب بہ طریق مجاز ہے - خلاصہ یہ کہ الف‌نون فاعل نہ فارسي‌ء بحت میں تھا ' نہ فارسي‌ء آمیختہ‌بعربی میں ہے - قیاس کو میں مانتا نہیں - الف‌نون جہاں اسماء جامد کے آگے ہے ' جمع کا ہے اور جہاں صیغہ‌ہاے امر کے آگے ہے ' حالیہ ہے - والسلام بالوف[1] الاحترام - پہلا رقعہ ' بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے ' اِستفتا کے کاغذ کے ساتھ مجھ کو واپس مل جائے - نجات کا طالب غالب ۱۲ - (مہر)

—

(د)

جناب مولوي صاحب ' کرم از شما و کمي ازما - اچھوں کے ساتھ سب بھلائي کرتے ہیں ؛ بروں کے ساتھ نیکي کرني جواں‌مردی ہے - اگر اپاہج نہ ہوتا ' فوراً آپ کے پاس پہنچتا - اب متوقع ہوں کہ آج ' اِس وقت یا اور وقت ' مگر آج ہی آپ تشریف لائیں اور ضرور تشریف لائیں - شام تک چشم‌براہ رہوں گا - عنایت کا طالب غالب ۱۲ ۲۷ فروري سنہ ۱۸۶۶ -

—

[1] - اصل میں "بلا الوف" ہے - (دیکھو ص ۹۶ حاشیہ ۱)-

[اِن خطوں کے اِملا اور رسم خط کے متعلق صرف اِتنا کہنا ھے کہ نقل کرنے میں صرف اوقاف کے ضروري نشان لگا دیے گئے اور معروف اور مجھول " یے " یا واضح اور مخلوط " ھے " وغیرہ کا اِمتیاز قائم کرنے کے لیے تصرف کیا گیا ؛ وہ بھی جھاں تک چھاپے کے حرفوں کے ٹھپوں نے اجازت دي - اِس کے علاوہ جھاں کھیں تصرف کي ضرورت پڑي ' حاشیے میں بتا دیا گیا ھے - " غالب " نے اپنی تحریر میں ھمیشہ اِحتیاط برتي اور اکثر لفظوں پر اِعراب لگا دیتے تھے ' مگر اُن اِعراب کے نقل کرنے سے اِس لیے قطع نظر کیا گیا کہ چھپنے میں اِعراب کے ٹھپے اپنی اصلی جگھ سے ھٹ کر کھیں کے کھیں جا پڑتے ھیں اور لفظ بجاے صحیح کے غلط ھو جاتے ھیں -

تمام متقدین اور متاخرین کے علی‌الرغم "غالب" یہ کھتے تھے کہ فارسي لفظوں میں " ذال " لکھنا غلط ھے اور اِس لیے " گذشتن " اور "پذیرفتن" وغیرہ کو بالالتزام " زے " سے لکھتے تھے - "ھاتھ" کو "ھات" لکھا کرتے تھے - اِن خطوں کی نقل میں بھی " غالب " کی یہ طرز اِملا قائم رکھی گئی ھے -]

ایک اور چیز

مولوي اِمام بخش " صھبائی " کے ایک شاگرد مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے " قاطع برھان " کے رد میں " ساطع برھان " لکھی جو ۱۲۸۲ ھ میں شائع ھوئی - " غالب " نے اُس کے جواب میں ایک بھت طویل خط لکھا اور وہ اُسي سال " اودھ اخبار " کے دو لمبروں ۴۱ اور ۴۲ بابت ۱۰ اکتوبر و ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ع میں شائع ھوا - یہ خط ' جو " نامۂ غالب " کے نام سے مشھور ھے '

'' عود ھندي '' میں موجود ھے'' مگر اکثر جگہ سے غلط - میرے سامنے ایک قلمی نقل ھے جو '' اودھ اخبار '' کے پرچوں سے لي گئی تھی[2] - یہ نقل حکیم احسن‌اللہ خاں دھلوی کي فرمائش سے ھوئی تھی ' چنانچہ خاتمے کي عبارت یہ ھے :—

'' حسب فرمودۂ جناب، فیض‌انتساب ' حکمت ماب ' حذاقت‌دستگاہ ' خدا آگاہ ' جناب حکیم صاحب محمد احسن‌اللہ خاں بہادر ' دام اقبالہ '' -

اخبار نویس نے اپنی طرف سے جو تمہید لکھی ھے اُس سے اِس کا اندازہ ھوتا ھے کہ اُس زمانے کے اخبارنویسوں کا لب و لہجہ کیا تھا - اِس لیے پہلے وہ تمہید ' پھر '' نامۂ غالب '' ذیل میں درج ھے :—

نواب اسداللہ خاں بہادر غالب دھلوي

جناب ممدوح نے ایک کتاب '' قاطع برھان '' میں اکثر لغات و محاورات کے موارد اِستعمال کي تصحیح اور اغلاط کتاب '' برھان '' کی بہ عبارت دلچسپ اِصلاح فرمائی - اس پر بعض حسود کوتہ اندیش نے بہ مقتضاے کورباطنيء جبلی اور نیز بہ اُمید اِس کے کہ ایسے کامل‌الفن طوطيء ھند کے مقابلے میں کچھ تھوڑي چوں‌چرا کرنے سے عوام کالانعام کی نظروں میں کسی طرح سرخ‌روئی حاصل

---

۱ - '' عود ھندي '' ص ۱۳۵ — ۱۴۷ -

۲ - اِس قلمی نقل کو اصل قرار دے کر '' عود ھندي '' کے صفحات سے مقابلہ کرنے کے بعد '' نامۂ غالب '' کا متن درست کیا گیا ھے - اھم اختلافات حاشیے میں بتا دیے گئے ھیں -

کریں ' بجاے داد کے بیداد کیا کہ تردید کلام بلاغت نظام میں محنت بیجا اُٹھائي ؛ مگر لطیف‌الطبع میاں‌داد خاں صاحب '' سیاح '' رفیق سید غلام بابا صاحب رئیس سورت نے اُن تشکیکات کو بہ براهین شایستہ رفع کیا - اِسي طرح میرزا رحیم بیگ نامے کو بھي خلل دماغ ہوا تھا - اُن کی اِصلاح مزاج کے واسطے حضرت نے خود توجہ فرمائي ' چنانچہ وہ نامۂ بلاغت آگیں بجنسہ درج ذیل ہے -

نامۂ غالب

بہ خدمت مشفقي مکرمي میرزا رحیم بیگ صاحب ' نور اللہ قلبہ بالاسرار وعینہ بالانوار ' سخنے چند گفتہ می شود

نہ در منطق پارسي و دري
همین هندوی سادہ و سرسري -

جس طرح توحید میں نفی ماسوا اللہ دستور ہے مجھ کو تحریر میں حذف زوائد منظور ہے - عزم مقابلہ نہیں ' قصد مجادلہ نہیں - سر تاسر دوستانہ حکایت ہے ؛ خاتمے میں ایک شکایت ہے - شکوۂ دردمندانہ منافیِ شیوۂ ادب نہیں ' معہذا اظہار درد دل مراد ہے ' کوئی بات جواب طلب نہیں - احسان‌مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشي سعادت علي کي طرح آدھا نام میرا نہ لکھا ؛ اُن کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے اُستاد کا نہ لکھا - اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ '' بقول غالب با کدام خرس در جوال شدہ ام''[۱] بہم کیے یا اور دو چار جگہ کلمۂ توهین رقم کیے ؛ میں نے اپنے لطف طبع اور حسن عقیدت

---

۱ - ساطع برهان ' ص ۱۱۷ -

سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دلنشین کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی جامع برہان کو موافق میرے قول کے خرس یقین کیا۔ " با خرس در جوال شدن " عبارت ہے صحبت سے ؛ خواہی مدافعت کے واسطے ہو ، خواہی محبت سے ۔ مجھ کو اُس کا قرب بسبیل آویزش ہے ، تم کو اُس کا قرب از روے آمیزش ہے ۔ دوسرے فقرے کے معنی یہ ٹھہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کے مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث درد دل ہوئی ۔ شدت درد میں آدمی چیختا چلاتا ہے ، ہاے واے کرتا ہے ، غل مچاتا ہے ، جیسا کہ سعدی " بوستاں "[1] کی اُس حکایت میں ، جس کا پہلا مصرعہ ہے[2] :—

شبے زیت فکرت ہمی سوختم ،

فرماتا ہے :

کہ ناچار فریاد خیزد ز درد[3]

جناب میرزا صاحب ، کیا تم نہیں جانتے ؟ کیوں کر نہیں جانتے ؟ بے شبہہ جانتے ہو گے کہ اکابر اُمت کو اُمور دینی میں کیا کیا منازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دیگر پہنچی ہے ۔ اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا ، یہاں تک کہ اُس کی تحقیق بھی کی تو اور مدعیان علم و عقل اُس مسکین کے جگرتشنۂ خوں کیوں ہو جائیں ؛ اور جب

---

۱ - بوستان ، باب پنجم ۔

۲ - عود : " یلا ہے " ۔

۳ - عود : " مرد " ۔

تک اُس کا نقش ہستی صفحۂ دہر سے نہ مٹائیں ' آرام نہ پائیں ؟ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے " قاطع برہان " میں لکھا ہے نہ اُس کو سمجھتے ہیں ؛ اور نہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اُس کے معنے[1] سمجھتے ہیں - ' سوال دیگر ' جواب دیگر ' پر مدار ہے ؛ خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے ؛ " برہان قاطع " والے کی محبت سے دل بےقرار ہے ؛ فرط غیظ و غضب سے بدن رعشہ‌دار ہے - منشی سعادت علي نہ ناظم ہے نہ نثار ہے ' بہ موجب اِس مصرعے کے :---

مقتضاے طبیعتش ایلست

ناچار ہے[2] - تم کو معرض تحریر میں تحمل و تامل چاھیے ' نہ سخن‌پروری و جانب‌داري میں توغل چاھیے - بحسب اختلاف طبائع مانو یا نہ مانو '[3] مگر پہلے یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ‌نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے - اگرچہ " قاطع برہان " میں جا بجا لکھتا آیا ہوں ' مگر اب ہندي کي چندي کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں ' سب ہندي نژاد ہیں - ہاں علم صرف و نحو عربي میں بقدر تحصیل مسلم اور اُستاد ہیں - علم صرف و نحو کے کتب درسي موجود ہیں - جس نے چاہا اُس نے اُستاد سے اُن کتب کو پڑھ لیا ہے - فارسی کی جو فرہنگیں حضرات نے لکھي ہیں ' مطالب مندرجہ کس اُصول پر منضبط کیے ہیں اور اُس کا علم کس اُستاد سے حاصل کیا ہے ؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربي بھی

---

۱ - عود : " اور نہ کچھ آپ لکھتے ہیں نہ اُس کے معنے " -

۲ - عود " ناچار " - ۳ - عود : " مانو نہ مانو " -

تو صرف مطالعۂ کتب سے نہیں نکالتے[۱] ہیں - پہلے تعلیم و تعلم ہے ' پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں - قواعد فارسي کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور اِن ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے ؟ شیدائے ہندي و سیکروي[۲] نے حاجي محمد جان "قدسي" علیہ الرحمۃ[۳] کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے - میرزا جلالے طباطبائی علیہ الرحمۃ[۴] نے "شیدا" کو خط لکھا ہے - سرآغاز خط کا ایک قطعہ ' جس میں "صحرا" و "دریا" قافیہ اور "برساند" ردیف - شعر اخیر کا مصرعۂ ثاني یاد رہ گیا ہے :—

یعنی بہ مہادیو مقوی برساند

خلاصۂ مضمون خط یہ کہ تو صاحب زبان نہیں ہے ' زباں‌دان ہے یعنی مقلد اور کاسہ‌لیس اہل ایران ہے - حاجی محمد جان کے کلام کو سند پکڑ ؛ تجھے کس نے کہا ہے کہ اُس سے لڑ - کیا تو نے نہیں سنا جو "عرفی" و "فیضي" میں گفتگو ہوئي ہے اور موتمن‌الدولہ شیخ ابوالفضل

---

۴ - عود : "نکالے" -

۵ - ملا شیدا (متوفي ۱۰۵۲ ھ) جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے کا مشہور شاعر ہے - قدسي کے ایک قصیدے پر اعتراض کیے ہیں اور اپنے اکثر ہم‌عصر شاعروں کي ہجو کي ہے - شیدا کي پیدائش قندھار میں مگر نشو و نما فتح‌پور سیکري میں ہوئي -

۶ - مشہور شاعر "قدسي" (متوفي ۱۰۵۶ ھ) نے ہندستان آکر شاہجہاں کے زمانے میں ملک‌الشعرائي کا مرتبہ حاصل کیا -

۷ - میرزا جلال‌الدین "اسیر" (متوفي ۱۰۴۹ ھ) شاہ عباس صفوي کا مقرب شاعر تھا ؛ مےخواري کي کثرت سے جواني ہي میں مرا -

کے روبرو ہوئی ہے - لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا - مولانا جمال الدین "عرفی" رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہو گیا ہوں ' اپنے گھر کی بڑھیوں سے لغات فارسی اور یہی[1] ترکیبیں سنتا رہا ہوں - "فیضی" بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے "خاقانی" و "انوری" سے اخذ کیا ہے - حضرت "عرفی" نے فرمایا کہ تقصیر معاف "خاقانی" و "انوری" کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیرزالوں کا ہے - ہائے[2]' تمیز کہاں سے لاؤں جو دیکھے کہ یہ حال قلمرو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے - قیاس مع الفارق کی بہار دیکھو ' مجرد تقدم زمانی[3] کا اعتبار دیکھو - مانا کہ "عرفی" تحصیل علوم عربیہ میں اُن سے کمتر ہے ؛ صاحب زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے - کیا "عرفی" ' کیا "انوری" ' کیا خاقانی ؛ ایک شیرازی ' ایک خاوری ' ایک شروانی - اگر مجھ سے کوئی کہے : "غالب ! تیرا بھی مولد ہندوستان ہے " - میری طرف سے جواب یہ ہے : "بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے ؛

ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم هم از آن جملہ زبانم دادند

زباں دانی و فارسی میری ازلی دستگاہ ' اور یہ عطیۂ خاص من جانب

---

۱ - قلمی نقل اور عود هندی ؛ دونوں میں "بھی" ہے ' مگر ظاہر ہے کہ "بھی" کا یہاں محل نہیں -

۲ - قلمی نقل : "ہے" -

۳ - قلمی نقل : "زبانی" ؛ عود : "زمانی" -

اللہ ہے - فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے ؛ مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے " - ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوشگو اور معنی‌یاب ہیں ' لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زباں‌دانی کے باب ہیں - رہے فرہنگ لکھنے والے ' خدا اِن کے بیچ سے نکالے : اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل‌دیے - وہ بھی ' نہ کوئی ہم‌قدم[1] نہ کوئی ہم‌راہ ' بلکہ سو بہ‌سو پراگندہ و تباہ - رہنما ہو ' تو راہ بتائے ؛ اُستاد ہو ' تو شعر کے معنے سمجھائے - نہ آپ شیرازی ' نہ اُستاد اصفہانی[2] ؛ زہے رگ گردن و خہے دعوائے زباں‌دانی ! میرا یہ قول خاص ہے نہ عام ہے ؛ مجموع فرہنگ‌نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے - یہ کیا بات ہے کہ ' جامع " برہان " کا ماخذ " فرہنگ رشیدی " و " جہانگیری " ہے ' ؟ عبدالرشید[3] کی کیا شیخی اور میاں اِنجو[4] میں کیا پھری ہے ؟ قطب شاہ اور جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشاء برتری ہے ' تو بیچارہ جعفر زٹلی بھی فرخ‌سیری ہے - ایک لطیفہ لکھتا ہوں - اگر خفا نہ ہو جاؤ گے ' تو حظ اُٹھاؤ گے - جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ‌طراز ہیں ' یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں : تو بہ‌تو اور لباس در لباس ' وہم در وہم اور قیاس در قیاس - پیاز کے چھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے ' چھلکوں کا ڈھیر لگ جائےگا ؛ مغز نہ پاؤگے - فرہنگ لکھنے والوں کے

---

۱ - قلمی نقل میں " نہ کوئی ہم‌قدم " نہیں ہے -

۲ - عود : " رمضانی " (!)

۳ - ملا عبدالرشید ٹھٹوی ' " فرہنگ رشیدی " کا مولف -

۴ - خان جمال‌الدین اِنجو ' " فرہنگ جہانگیری " کا مولف - (دیکھو رسالۂ " ہندستانی " جلد اول ' ص ۶۲۸) -

پردے کھولتے چلے جاؤگے ' لباس ھی لباس دیکھوگے ؛ شخص معدوم - فرھنگوں کی ورق‌گردانی کرتے رھو ' ورق ھی نظر آئیں‌گے ؛ معنی موھوم - ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ھے ؛ آپ کے خاطرنشیں کرتا ھوں جو میرے دلنشیں ھے - فرھنگ نویسوں کا قیاس معنی‌و لغات فارسی میں نہ سراسر غلط ھے ' البتہ کم‌تر صحیح اور بیشتر غلط ھے[۱] - خصوصاً دکنی تو عجب جانانہ ھے : لغو ھے ' پوچ ھے ' پاگل ھے ' دیوانہ ھے - وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ بائے اصلی اور بائے زائدہ کیا ھے - حیران ھوں کہ اُس کی جانب‌داری میں فائدہ کیا ھے ؟ خدا جانتا ھے کہ میں یکرنگ ھوں ' مگر دکنی کے جانب‌داروں کا چورنگ ھوں - مجھے جو چاھو سو کہو - اوروں سے تم کیوں لڑتے ھو ؟ کہیں جامع " لطائف غیبی "[۲] کو برا کہتے ھو ' کہیں نگارندۂ " دافع ھذیان "[۳] سے جھگڑتے ھو - جانتا ھوں کہ دکنی کی عبارت کی خامی ' اُس کی رائے کی کجی ' اُس کے قیاس کی غلطی ' اگر نہ سب جگہ بلکہ بعض جگہ سچ جانتے ھو ؛ مگر یہ میں نہیں جانتا کہ اِتنی محنت کرنی اور اُس کے رفع تخطیہ کے واسطے توجیہات باردہ ڈھونڈنی کس واسطے ؟ ایسا اُس کو کیا مانتے ھو : مجھ پر جدا منہ آتے ھو ' مولوی نجف علی اور میاں‌داد خاں سے جدا بگڑتے ھو - بھائی صاحب ' مغلبچہ‌پن[۴] پر آگئے ' گوھار لڑتے ھو ؟ سچ ھے ' غالب آگندہ گوش ھے ' کسی کی نہیں سنتا - اِسی آپ کے مقرر کیے ھوئے قاعدے کے موافق بہ حلف کہتا ھوں کہ تم نے " قاطع برھان " و " دافع ھذیان " و لطائف غیبی " کو ھرگز نہیں

---

۱ - غنیمت کہ حضرت نے اِتنے ھی پر بس کیا -

۲ - میاں‌داد خاں " سیاح " - ۳ - مولوی نجف علی -

۴ - صود : " مغلچپاپن " -

دیکھا - " آویزہ " و " افسوس " کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اُس کا اِقرار اور میرا دوست میاں‌داد خاں شرمسار ہے - جو کچھ اُس منصف[1] نے اِس باب میں لکھا وہ قول فیصل اور کافی ہے - مانیں یا نہ مانیں، ناظرین کو اختیار ہے - "گلھری" بہ کاف فارسیء مکسور بہ‌وزن " اِکہری " لغت هندي‌الاصل ' اُس کی شرح میں جدا ایک فصل ؛ کاف فارسی کی جگہ کاف عربيء مفتوح ' اِعراب کا بہ‌وزن " تشکری " وضوح[2] - مجھے اور میرے دوست " سیف‌الحق " کو دو سہو طبیعی پر اِستعذار ؛ ہوا خواہان بوہرۂ دکنی کو اغلاط[3] متواتر کے جواز پر اِصرار - فاعتبروا یا اولی‌الابصار - " خرہ " بے واو بمعنیء نور ' اور " خورہ " مع الواو بمعنيء جذام ! ایک " ویژہ " بمعنیء پاک اور [ایک] " اویژہ " بمعنيء پاک[4] ! ایک یہ اور ہزار ایسے[5] اغلاط سند ' اور مقبول اور منظور ! گویا یہ مصرع جو حمد میں ہے :—

کند ' هرچہ خواهد ' برو حکم نیست

اُس کی شان میں صادق سمجھ لیا ہے - چشم بد دور ' اب چاہیے کہ اُس کے پوچھنے والے[6] اُس کے نام کے بعد " جل جلالہ " لکھیں ' اور اگر اِتنی جرأت نہ کریں تو نظر بہ اِفادہ و اِستفادہ " عم نوالہ " لکھیں -

---

۱ - دونوں نسخوں میں " مصنف " ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا -

۲ - عود : " رضوم " جو غلط ہے - ۳ - قلمي نقل : " احلاط " -

۴ - قلمي نقل : " ایک ویژہ بمعني پاک اور اویژہ بمعني ناپاک " ؛ عود : " ایک ویژہ بمعنی پاک اور آویژہ بمعني ناپاک " - یہ دونوں عبارتیں غلط ہیں -

۵ - قلمي نقل : " اور ایسے ہزار " - ۶ - عود : " پوچھنے والے " -

ستر برس کي عمر، کانوں سے بہرا، جمعیت کا تفرقہ زیادہ اور پھر خودداري اور کبر نفس[1] اور اِستغنا خداداد - بیہودہ بکنے میں اوقات کیوں صرف کروں، پاسخ‌نگاري کیوں لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف کروں؟ آپ کو اپنی نمود اور شہرت ملنظور ھے: خردہ‌گیری و عیب‌جوئی سے - مجھ کو نفرت ھے اور حیا آتي ھے زیادہ‌گوئی سے - آپ کے حسن کلمات طیبات سے قطع نظر کرکے ناظرین منصف کے وجدان پر چھوڑ دیتا ھوں اور شکایت موصوفہ سے پہلے تین امر ضروری لکھ لیتا ھوں :

[۱] " صیحہ بمعنيء آواز اسپ زنہار نیست "[2] - اِس کے سچ ھونے میں کیا کلام ھے؟ جو " صیحہ " سے " آواز اسپ " مراد رکھے وہ ناقص ھے اور خام ھے - کیا " عرفي " کا شعر، " عرفی " کے خط سے لکھا ھوا کسي کو نظر پڑا کہ ناظر بیں سن در تمھارا ذھن وقاد نقاد وھاں جا لڑا؟ لغت کسی باطن کے اندھے کے ھات سے لکھا جائے اور پھر " عرفی " جیسا شاعر دیدہ‌ور[3] بازپرس میں پکڑا جائے - تمھارا محبوب بوھرۂ دکنی شین منقوط مع التحتاني کے بیان میں " شیہہ " کو گھوڑے کے ھنہنانے کي فارسی بتاتا ھے - عربی میں گھوڑے کے ھنہنانے کو " صہیل " بہ وزن " دلیل " کہتے ھیں، " صیحہ " بہ وزن " بیضہ " عموماً بہ معنی " ھر صداے ھولناک و مہیب " آتا ھے - میں کیوں‌کر فرھنگ‌نگاروں کے اور اُن کے مددگاروں کے قیاس کو وحي سمجھوں، اور کیوں‌کر کاتبوں کي[4] اِملا کو مصحف مجید کي طرح سر

---

۱ - عود : " کسر نفس " -

۲ - دیکھو " درفش " ص ۳۶ اور " ساطع " ص ۱۷۲ -

۳ - قلمی نقل : " دیدہ‌دار " ؛ عود : " دیدہ‌در " -

۴ - عود : " کے " ؛ مگر غالب کے زمانے میں ' اِملا ' کو مونث بولتے تھے، بالکل

پر دھر لوں ؟ یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جماد اور نبات[1] فرض کرلوں -

[۲] جرم و خطائے " یوغ "[2] بر گردن بزرگن[3] جناب است - میں آپ کو مخاطب بالفتح ٹھہرا کر ' یہی فقرہ پڑھ کر ' چپ رہتا ہوں - بعد اِس کے تبدیل جیم بہ تحتانی کو نا مسموع کہتا ہوں[4] - "یعقوب" کو بہ‌تغیر لہجہ انگریزی زبان میں "جاکوب" کہتے ہیں. کہاں مبدل منہ ' کہاں تغیر لہجہ ! حضرت ' آپ جو کہتے ہیں خوب کہتے ہیں -

[۳] " رید " اور[5] " کود " کو ترجمۂ "طفل" نہیں مانتے اور پھر

اب بھی کچھ لوگوں کے نزدیک " اِملا " مونث ہے اور اگر " اِنشا " کے قیاس پر اِس کی تانیث عام طور پر مان لی جائے تو بہت اچھا ہو -

۱ - قلمی نقل : " جماد و نبات " -

۲ - عود : " بلوغ " جو غلط ہے - دیکھو " درفش " ص ۱۲۸ اور " ساطع " ص ۱۷۰ -

۳ - عود : " بفنگان " جو صحیح نہیں -

۴ - یہ "غالب" کی بڑی زبردستی ہے کہ جو بات اُن کو نہیں معلوم' وہ غلط اور اُس کا کہنے والا گردن‌زدنی - واقعہ یہ ہے کہ فارسی میں " ج " اور " ی " کا مبادلہ ہوتا ہے - ایران کے شمال میں جن لفظوں کے شروع میں " ی " ہے ' پارس میں وہ " ج " سے بولے جاتے ہیں - چنانچہ " جو " (شعیر) اور " جوان " کو شمال میں " یو " اور " یوان " ہی کہیں‌گا - عربی میں " یہود " تھا ' پہلوی میں آکر " یہوت " ہوا اور بعد کو پارس والوں نے " جہود " کر لیا -

۵ - عود ہندی میں " رید اور " نہیں ہے -

خاتمے میں " ریدگان " ' بصیغۂ جمع ' لکھواتے ہو[1] - واقعی یوں ہے کہ جو کچھ لکھواتے[2] ہو بہ نیروے بصر نہیں ' از روے سمع لکھواتے ہو -[3]

خط تمام ہوا - اب مستغیث کی عرضی کی سماعت ہو ' لیکن سماعت از روے انصاف بالاے اِطاعت ہو - عرضی گزراندے سے پہلے مستغیث پوچھتا ہے کہ آپ کے محکمۂ عالیہ کا سررشتہ دار دیانت دار ہے یا نہیں ؟ سخن فہم و ہوشیار ہے یا نہیں ؟ میں تو گمان کرتا ہوں کہ امین نہ ہو - دلیل سن لیجیے ' اگر یقین نہ ہو " - صیحہ بمعنی آواز اسپ زنہار نیست " : اس کے ماقبل اور بھی عبارت ہے - سنانے والے نے نہ پڑھی ہو ' کیا بعید ہے ؟ کس واسطے کہ اُس عبارت کے مفہوم کو ملحوظ نہ رکھنا اور , محمد اکرم پنجابی کا شعر تو قابل اِلتفات نہیں ' مگر مولانا جمال الدین " عرفی " شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا

---

۱ - " ریدک " کے معنے ہیں " لڑکا " یا " چھوکرا " - غالب نے لکھا تھا کہ اِس قبیل کے لفظوں میں کاف تصغیر کا ہے اور " کود " اور " رید ' ترجمۂ طفل ہے (" درفش " ص ۱۴۳) - مرزا رحیم بیگ نے جواب میں لکھا کہ ایسے لفظوں میں کاف تصغیر کا ہے اور نہ " رید " اور " کود " طفل کا ترجمہ (" ساطع " ص ۱۷۳) - مطلب یہ کہ اِن لفظوں میں کاف اصلی ہے ؛ مگر اُسی صفحے پر (کتاب کے خاتمے میں) " کودکان " اور " ریدکان " دونوں لفظ اِستعمال کیے ہیں - " غالب " اِس پر اعتراض کرتے ہیں ؛ مگر یہ اعتراض بجا نہیں - " ساطع " میں " ریدکان " ہے یعنی " ریدک " میں صرف الف نون اِضافہ کرکے - " اور اگر " ریدگان " بھی پڑھیے تب بھی وہ " رید ' کی نہیں بلکہ " ریدہ " کی جمع ہے جس سے یہاں کوئی واسطہ نہیں -

۲ - مراد : " لکھاتے " - ۳ - رحیم بیگ بیچارے اندھے تھے -

شعر بہ تتبع کاتب غلط لکھوا دیا تم سے بسا بعید ہے - انشا میں ناسخوں کی تحریف[1] کو مانتے ہو ؛ اِملا میں کاتبوں کی غلطی کے کیوں نہ قائل ہو ؟ اِنشا و اِملا و لفظ و معنی میں تقلید چھوڑ کر تحقیق کے کیوں نہ مائل ہو ؟ تقصیر معاف - یہ نہ اِستدلال بہ کلام عرفی عالی مراتب ہے بلکہ پیروی خامۂ کج رفتار کاتب ہے - کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ ' نہ ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے فراغ - آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی تو اپنا یہ شعر اُردو میرے ورد زباں اور اِس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا :—

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ ' گھبرائیں کیا ؟

اب جو اِصلاح حال و حصول مطالب سے دل مایوس ہے تو طبیعت اِسی غزل کی[2] اِس بیت سے مانوس ہے :—

عمر بھر دیکھا کیے[3] مرنے کی راہ
مرگئے پر ' دیکھیے ' دکھلائیں کیا ؟

کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڑا رونا رزق کا ہے - جب معاش مقرر ہو تو پھر غم کیا ہے ؟ نہ[4] صاحب ' یہ باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا ' پانی پی لیا اور چین سے سو رہے - آدمی عموماً اور صاحبان ننگ و ناموس خصوصاً ' باوجود فراغ معاش ' ایسی

---

۱ - قلمی نقل : " تعریف " -
۲ - قلمی نقل : " سے " -
۳ - قلمی نقل : " کیا " -
۴ - قلمی نقل : " او " -

جاں‌گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے[1] ؟ یہ حال تو یا صاحب واقعہ جانے یا خدا جانے - دوسرے سے یہ کار افتادہ کیوں[2] کہے اور بغیر کہے دوسرا کیا جانے ؟ مناظرے کا تو ہرگز ارادہ نہیں ؛ اگر مردہ‌دل نہ ہوتا تو دو باتیں کہتا ، زیادہ‌نہیں - وہ بھی نہ ازروے بحث و تکرار ، نہ بہ انداز استفسار ؛ اظہار سے مقصود نفس اظہار - یہ جو آپ نے مولوی امام بخش[3] کو " امام المحققین " خطاب دیا ہے ، کتنے محققین نے اُن کو امام مان لیا ہے ؟ جب تک نہ اجماع محققین کا ہوگا ، یہ خطاب بہ‌اجماع اہل عقل ناجائز و ناروا ہوگا[4] - وہ فرماں‌روائے عہد " شہنشاہ " کہلائے گا ، کئی بادشاہ جس کے فرماں‌پزیر ہو جائیں گے - ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام " مہر شہنشاہ " رکھ لیا - یہ مہر شہنشاہ صاحب کیوں کر شاہجہاں جہانگیر[5] ہو جائیں گے ؟ اگر حضرت بہ فتحۂ قاف ثانی ، بہ صیغۂ تثنیہ " امام المحققین " کہتے تو ایک ماموم[6] آپ ہوتے[7] اور نراین داس تنبولی دوسرا

---

۱ - " عود : ہے " -   ۲ - قلمی نقل : " کیا " -

۳ - " صہبائی " جن کو مرزا رحیم بیگ نے ساطع برہان میں " امام‌المحققین " کے لقب سے یاد کیا ہے (ساطع ، ص ۳) -

۴ - قلمی نقل : " ناجائز ہے و ناروا ہوگا "

۵ - قلمی نقل : " شاہجہاں و جہانگیر " -

۶ - یہاں ظاہرا " مقتدی " یا " پیرو " کے معنی ہیں ؛ مگر حقیقت میں " ماموم " وہ شخص ہے جس نے دماغ پر چوٹ کھائی ہو - عجب نہیں کہ " غالب " نے یہ جان کر یہاں یہ لفظ استعمال کیا ہو -

۷ - عود : " نہ ہوتے " -

ہوتا ۔ "ساطع برہان" کے تیرھویں صفحے کی نویں سطر میں آپ لکھتے ہیں : " و ہمچنیں بر افراط و تفریط توضیح را کاربند نہ شدہ اند کہ بداں حرف‌گیری تواند کرد" ۔ " تواند " توانستن کے مضارع کی بحث میں سے صیغۂ واحد غائب ہے ؛ فاعل چاہتا ہے ' خواہی معرفہ جیسے احمد ' محمود ' خواہی نکرہ جیسے فلان و بہمان ' کسے یا شخصے ' مردے یا زنے ۔ اور اگر فاعل مذکور نہ ہو تو اُس صورت میں " تواں‌کرد " چاہیے کہ " تواں " سالم بیسم فاعلہ ہے ۔ کرامت تو مجھے حاصل نہیں ؛ ہاں ' از روے حسن عقیدت کہتا ہوں کہ یا آپ نے یوں لکھا ہے : " کسے بداں حرف‌گیری تواند کرد " یا " تواند " کی جگہ " تواں " رقم فرمایا ہے ۔[۱] دیکھیے ' آپ نے بیل کے جوئے کا بوجھ میری گردن پر رکھ دیا اور میں نے ایک بیل کا بوجھ آپ کی پشت مبارک سے اُٹھا لیا ۔

" او اسداللہ دادخواہ ! جلد آ اور اپنی عرضی لا " ۔

" حضرت ! آیا اور عرضی لایا " ۔

" پہلے پانچ کاغذوں کی نقلیں علی‌الترتیب پڑھی جاویں ' پھر سررشتہ‌دار صاحب بہ کمال امانت و دیانت عرضی سناویں " ۔

[۱] نقل عبارت ' برہان قاطع ' : " آب دہ دست ' بہ کسر دال ابجد و ہاے ہوز ' اشارہ بہ حضرت رسول صلوات اللہ علیہ است خصوصاً و شخصے را نیز گویند کہ بزرگ مجلس بود و آرایش صدر و زینت مجلس ازو باشد عموماً " ۔

[۲] ۔ نقل عبارت ' قاطع برہان ' : " از خامی عبارت چشم

---

۱ ۔ قلمی نقل : " لکھا ہے " ۔

می‌پوشم و می‌خروشم که آب‌ده دست مرکب از آب و ده' که صیغهٔ امر است از دادن ' و دست ' که باوجود معاني دیگر مسند را نیز گویند - معنیء ترکیبي : رونق دهندهٔ مسند - هرآئنه تا مسند را به طرف نبوت یا رسالت یا هدایت مضاف نه گردانند ' به مقام نعت فرو نیارند ' بلکه در مدح اکابر و صدور نیز بے اضافهٔ لفظ امارت و شوکت و امثال اینها نه نگارند - نه بیني که تنها آب‌ده دست افادهٔ معنيء شویانندهٔ دست می‌کند و آن خود اهانتیست قبیح - بیچاره درنظم و نثر نعت ' آب‌ده دست رسالت ' دیده است و نیمهٔ مضمون را نعت اندیشیده است " -

[۳] - نقل عبارت ' ساطع برهان ' : " آب‌ده دست - خدا نه کند که این اعتراض از جانب مرزاے من باشد - کورسوادے همچو من گفته باشد ; به خاطر داشت ' آن درج کتاب کرد - ورنه این کنایه قابل اعتراض نیست ' چه آب‌ده دست جملهٔ ترکیبیست- دست ' که در عربي و فارسي به‌معنيء مسند است' مضاف; و مضاف الیه محذوف باید دانست - بلکه کلامیست مستقل ' مترادف بالادست که معنيء صدر مسند و بزرگ قوم باشد - صاحب ' مؤیدالفضلا ' درلغت فارسیه این لغت را به‌سند دو کتاب ' که ' ادات ' و ' قنیه ' [۱] باشد ' به همین صورت و صیحت[۲] و معني

---

۱ - " ادات الفضلاء " اور " قنیة الطالبین " لغت کی دو کتابیں هیں - ان لفظوں کو کسي کاتب نے صحیح نہیں لکھا ھے : - عود هندي : " آداب و قتیلا " ; ساطع برهان : " آداب و قینلا " ; قلمي نقل ، " ادات دفینه " -

۲ - عود اور ساطع : " صحت " جو یہاں صحیح نہیں ھے -

نگاشت و در ' مدار '[1] نیز - و صاحب ' رشیدی ' آورده که ' آب‌ده دست ' به معنی بزرگ مجلس و معنیء ترکیبی آن رونق‌ده صدر و مسند - قوله : بیچاره در نظم و نثر نعت ' آب‌ده دست رسالت ' دیده و نیمهٔ مضمون را نعت اندیشده است - انتهی - اقول : جامع[2] این کنایه را در نظم و نثر بے اِضافهٔ ' رسالت ' دیده است و همچنان در رشتهٔ تحریر کشیده است - خاقانی گوید :—

دست‌آب‌ده مجاورانش ارزن‌ده برج کونرانش -

تبصره - پس‌گردان جناب اگر فراموش نه‌کنند ' در شرح کنایهٔ ماهی چشمهٔ خضر در باب المیم جویند که می گ یند که آب‌ده دست اِستعاره براے آنحضرت از خاقانی از رکاکت است - واے برین عقیدت که او را به پیمبری برداشتند و باز به نشیب رکاکت سرنگون انداختند " -[3]

[۴] نقل عبارت ' برهان قاطع ' : " ماهوچی شمهٔ خضر ' کنایه از زبان و دهان معشوق است " -

[۵ نقل عبارت] ' قاطع برهان ' : یا رب ! ' ماهوچی شمهٔ خضر ' کنایهٔ کدام لغت است ؟ من در کتاب مطبعه بدین صورت دیده ام - مصرعه :

قلندر هرچه گوید دیده گوید -

---

۱ - " مدار الافاضل " لغت کی کتاب هے -

۲ - یعنی جامع برهان قاطع " -

۳ - قاطع برهان ' ص ۲۲—۲۳ -

در ضمیر می گزرد که ' ماهیء چشمهٔ خضر ' خواهد بود و آن خود مضمونیست بهطریق اِستعارہ بالکنایه که سخنور بسا خون جگر خوردہ باشد تا در نظم و نثر خویش آوردہ باشد - سپس هرکه این را در گفتار خویش آرد سرقه خواهد بود - از لغات مستقله و کنایه هاے مشہورہ نیست که بهکار دبیران روزگار آید ' شیر خدا ' که ترجمهٔ ' اسدالله ' است ' گوئی که یکے از نا مہاے ولایت‌پناہ است ' صد هزار کس در کلام خویش آوردہ باشند و سرقه نیست - دکنی در باب شین مع الہا ' شیر شرزهٔ غاب ' اِسم حضرت امیر علیه‌السلام نوشته ؛ و آن مضمونیست که خاقانی در قصیدهٔ میمیه[1] بهم رساندہ - ' شیر شرزہ ' خود صفتیست عام که بر هر مرد شجاع و سرهنگ جنگ‌جو اِطلاق توان کرد و ' غاب ' بهمعنیء بیشهٔ نیستان است - هرآئنه این صفت نه سزاوار شان اسداللهی باشد ' خاقانی خود بهطریق تنزل گفته است - این چنین صفت اِسم کسے ' که بعد از خدا و رسول او را به بزرگی توان ستود ' چگونه روا تواند بود - همچنین ' آبدہ دست ' در باب الف ممدودہ اِسم حضرت ختم‌المرسلین صلوات الله علیه قرار دادہ است و این لفظیست در غایت رکاکت[2] " - (پس غالب منع کرتا هے برهان دکنی کو که لفظ

---

۱ - درفش اور قلمی نقل : " قسیه " : عود : " قیمه " - صحیح " میمیه " یعنی وہ قصیدہ جس کے شعر میم پر ختم هوتے هوں -

۲ - " رکاکت " کے بعد قلمی نقل اور عود میں " صفت لفظ " بهی هے مگر یه دونوں لفظ نه درفش میں هیں نه ساطع میں - ممکن هے که خط لکهتے وقت " غالب " نے خود هی بڑها دیے هوں -

رکیک، آنحضرت کے حق میں صرف نہ کرے)[1] "چنانکہ ہم در آن فصل مفصل نوشتہ ایم، مقصود ما اینست کہ اینچنین مضامین لغت مستقل و کنایۂ مقبول[2] چرا قرار یابد، و جز در شرح اشعارے کہ حاوي این کلمات باشد چرا نگارش پزیرد" - [3]

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم - "آب" ترجمہ "ما" کا، ھندي جس کی "پاني" ؛ اور بہ‌معنیء "رونق و لطف" بھی آتا ھے اور اسلحہ کی تیزي اور جواھر کی صفائی کو بھي کہتے ھیں - "دست" ترجمۂ "ید" ھے، جس کی ھندی "ھات" : اور بہ‌معنیء "قسم و نوع" اور بہ‌معنيء "مسند" بھي مستعمل ھے - ھم کو اِس مقام میں "آب" بہ‌معنی "پاني" اور "دست" بہ‌معنی "ھات" اور اِس کی ترکیب[4] "آب‌دست، اور اِس کے مقلوب یعني "دست آب" کے باب میں کلام ھے - "آب دست" بہ حرکت و سکون موحدہ عموماً ترجمۂ "غسالۂ ید" ھے اور خصوصاً وضو کو کہتے ھیں - تعمیم کی سند : اُستاد کا شعر :—

بےتکلف رو بہ ساقي کن، اگر دل خستۂ
کابدست او شفابخش ھمہ بیمارھاست،

---

۱ - یہ اُردو عبارت "غالب" نے اپنے خط کي عبارت کے سلسلے میں یہاں لکھي ھے - اِس مقام پر ایک فقرہ اِضافہ کرنا چاھتے تھے جو "قاطع برھان" میں نہ تھا - اُسے اگر فارسي میں لکھتے تو یہ شبہہ ھوتا کہ یہ عبارت بھی "قاطع" کي ھے - اِس لیے اُردو میں لکھا -

۲ - قلمی : "معقول" جو صحیح نہیں -

۳ درفش، ص ۱۰۶—۱۰۷ -

۴ - عود : "ترکیب یعنی" -

تخصیص کی سند : " نام حق " کی بیت :—

آبدست و نماز باید کرد دل مقام گداز باید کرد -

عرف میں ' آبدست ' کس عضو کے غسالے کو کہتے ہیں ؟ ہم تو اِتنا پوچھ کر چپ ہو رہتے ہیں - پس ' آب‌دہ دست ' اور ' دست آب دہ ' کے معنے ' وضو کروانے والا ' اور ' ہاتھ دھلانے والا ' - ' آب ' بہ معنیء ' رونق ' اور ' دست ' بہ‌معنیء ' مسند ' کا یہاں اِدخال محض جہل اور صرف اِہمال - یہ تو میرا قول ہے کہ ' آب‌دہ دست رسالت ' رسول کو کہہ سکتے ہیں - ایک بے ادب فقط ' آب‌دہ دست ' کہتا ہے ؛ اور ہم منہ تکتے ہیں - منشی سعادت علی[1] کو نہ علم نہ فہم ؛ اُس نے اِس قباحت کو نہ جانا - میرزا رحیم بیگ صاحب ! افسوس کی بات ہے : تم نے اِس بیان خاص میں " برہان قاطع "[2] والے کے قول کو کیوں‌کر مانا ؟ ہے ہے ' سراسر بےپردہ اشرف‌الانبیا علیہ و آلہ السلام کی تذلیل اور توہین ہے - جو پیمبر کو ایسا کہے وہ مجمع اہل اِسلام کے نزدیک مرتد اور مردود و بےدین[3] ہے - بلکہ مخالفین بھی ' جو مسلمان اپنے پیمبر کو برا کہے ' اُس کو برا جانیں گے ' یقین ہے - پس پیمبر کا ' آب‌دہ دست ' نام رکھنے والا مورد لعنۃ اللہ و الملائکۃ[4] و الناس اجمعین ہے - خاقانی کے شعر کے لکھنے سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ یہ شعر

---

۱ - " محرق قاطع " اِنھیں نے لکھی تھی اور غالباً یہ وہی منشی سعادت علی ہیں جو دھلی کالج کے مدرس اور مطبع سراجی ' دھلی ' کے مالک تھے -

۲ - دونوں نسخوں میں " قاطع برہان " ہے ' جو صحیح نہیں ہو سکتا -

۳ - قلمی نقل : " مرتد و مردود بے دین " - ۴ - عود : و ملائکتہ " -

قطعہ‌بند اور اِس[1] کا پہلا مصرع شعر مجھے[2] یاد ہے - پہلے پوچھتا ہوں کہ ' دست‌آب‌دہ ' کا فاعل اور شہن کا مرجع تم نے کس کو ٹھہرایا ' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کا نشان اِس میں بہ طریق مذکور یا مقدر کہاں پایا ؟ جب اِس مصرع کی رو سے :

دست‌آب‌دہ مجاورانش

' دست‌آب‌دہ ' پیمبر کا نام قرار پایا ' تو دوسرے مصرع کے مطابق :

ارزن‌دہ برج کبوترانش

' ارزن‌دہ ' کا خطاب بھی حضرت پر صادق آیا - سبحان اللہ ! جہاں مصطفیٰ و مجتبیٰ ' رحمۃ للعالمین و خاتم المرسلین آپ کے القاب ہیں ' وہاں ' آب دہ دست ' بھی آپ کا لقب ٹھہرایا - مرزا جی ! میں ترک جاہل ہوں - بجا ہے ' اگر مجھ کو گالیاں از روے عتاب دو گے - خدا کے واسطے ! پیمبر کو کیا جواب دو گے ؟ بندہ پرور ! خاقانی کا شعر قطعہ‌بند ہے اور اِس شعر کا پہلا شعر یہ ہے :

روح ' از پے آبروے خود را ' خلد ' از پے رنگ و بوے خود را '

دست‌آب‌دہ مجاورانش ارزن‌دہ برج کبوترانش -

اوپر کے دونوں مصرعوں میں " را " کا لفظ زائد : پہلا مصرع تیسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع چوتھے مصرع سے متعلق - نثر اِس کی فارسی میں یوں ہوتی ہے : " روح از پے آبروے خود دست‌آب‌دہ مجاوران اوست و خلد از پے رنگ و بوے خود ارزن‌دہ کبوتران اوست " - یہ دونوں شعر کعبۂ معظمہ کی تعریف میں اور دونوں

---

۱ - قلمی نقل : " اوس " - ۲ - عود : " پہلا شعر مجھ کو " -

شیئوں کی ضمیر بہ‌طرف کعبہ راجع - اِس اِظہار کی تصدیق
" تحفۃ‌العراقین " سے کیجیے اور ہندي کی چندي " غالب " سے
سن لیجیے - روح اپني افزایش آبرو کے واسطے وضو کا پانی دیتی ہے
کعبے کے مجاوروں کو اور خلد اخذ رنگ و بو کے واسطے دانہ کھلاتا
ہے کعبے کے کبوتروں کو - وضو کوا پانی دینا اور کبوتروں کو دانہ کھلانا
ادنی خدمت ہے - خدا کے واسطے! مخدوم کونین کو خادم کہنا
مدح ہے یا مذمت ہے؟ معہذا خاقاني کے اِس مصرع سے " دست
آب‌دہ " پیمبر کو سمجھنا بےاِعتنائی اور غفلت ہے - خاقانی نے
" روح " کو " آب‌دست‌دہ " کا فاعل مانا ' تم نے پیمبر کو معاً
اِس فعل کا فاعل اور ایک فاعل کا دو فعل سے متعلق ہونا کیوں کر
جائز جانا؟ " قافلہ شد یعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ‌سالار رفت
یعني رسول مقبول رحلت کرد " - یہ ' قاف مع‌الالف میں ' کلام
اُسي مستہین رسول کا ہے - " دست‌آب‌دہ " کی شرح میں تحقیر
اور " قافلہ شد " میں اِستہزا ہے - " برہان قاطع " والا اگر یہ
قباحتیں نہیں سمجھتا ہے تو احمق ہے ' اور اگر سمجھ کر لکھتا ہے
تو کافر مطلق ہے - اب میرے خونابۂ زخم دل کی روانی اور قلم کی
خونابہ‌فشانی دیکھیے : تبصرۂ مندرجۂ حاشیۂ " ساطع برہان "[۲]
کے حق میں کیا فرماتے ہو ' اور اِس فقرۂ اخیر کو : " باز در نشیب
رکاکت سر انداختند " کس کا لکھا بتاتے ہو؟ سنو ' نخرالفضلا و
ختم‌العلماء امیرالدولہ مولوي فضل حق رحمۃ اللہ علیہ نے رد عقائد
وہابیہ میں بہ‌زبان فارسی ایک رسالہ لکھا ہے اور اِس عہد کے علما

---

۱ - عود : " کا " -   ۲ - ساطع برہان ' ص ۲۳

کی اُس پر مہریں ھیں - اُس رسالے میں جناب مولوی صاحب مرحوم لکھتے ھیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ حضرت کو قوت مجامعت بہت تھی ' حال آنکہ یہ امر واقعی ھے ؛ یا یہ کہ آپ کی ردا میلی تھی ' اگرچہ اُس وقت میں ھو ' لیکن چوں کہ ایک گونہ سؤ ادب اور اِھانت ھے ' حاکم اِسلام کو چاھیے کہ اِس قول کے قائل کو سزا دے اور اگر حاکم سزا نہ دے تو اھل شہر پر عزل حاکم واجب ھے اور اگر اھل شہر ایسا نہ کریں تو وہ شہر دارالحرب ھے - پس بہ‌موجب فتواے علماے اِسلام فقرۂ مذکور کا لکھنے والا کفر میں شداد سے اشد اور کذب میں مسیلمۂ کذاب سے سوا ھے - خیر' عقبیٰ میں وہ خالق کا مقہور اور دنیا میں خلق کا مطعون ھوگا۔ مجھ کو کیا ھے [۱] ؟ مجھے تم پر ھنسی آتی ھے - بعضی بات سمجھی نہیں جاتی ھے - خاقانی روح کو " آب‌دست‌دہ مجاوران حرم " کہتا ھے ' تم کہتے ھو کہ خاقانی " دست‌آب‌دہ " اِسم پیمبر صلی اللہ علیہ و سلم کہتا ھے - مولوی اِمام بخش نے تم کو بہت کچھ پڑھایا ' مگر طریقۂ اِستنباط معنی نہ بتایا - میرے حق میں جو کہتے ھو ' خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا کہتے ھو - میں نے اِس کے سوا کہ " خاقانی بہ طریق تنزل گفتہ است " اور کیا کہا ھے جو مجھے برا کہتے ھو ؟ وہ بھی ذکر " شیر شرزۂ غاب " میں نہ " دست‌آب‌دہ " کے باب میں - اُس نے جناب امیرالمومنین کے واسطے ایک لفظ سھل سرسری لکھا ' میں نے قبول نہ کیا اور اُس کے قول کا تنزل ظاھر کر دیا - آنحضرت کو اُس نے " آب‌دہ دست " یا " دست آب‌دہ " کہاں لکھا اور کیوں لکھتا ؟ نہ احمق تھا نہ بےادب - جب اُس نے نہیں لکھا تو میں

---

۱ - مود : " مجھ کو کیا " -

اُس سے کیوں اُلجھوں ؟ اور کب اُلجھا ؟ نہ کج‌فہم ہوں، نہ مغلوب‌الغضب۔
" آب‌دہ دست " کے پردے کھل گئے - بے اِضافۂ لفظ آخر " دست "
بہ‌معنیء مسند نہ آے گا ؛ " آب‌دہ دست " ھات دھلانے والا کہلائےگا -
ہاں ، ایک طور ھے[1] - تم نے اُس کو اور طور سے لکھا ھے ؛ میں
بہ طریق ابلغ و احسن لکھتا ہوں ، یعنی " تخت و اورنگ " سلاطین
کے جلوس کے واسطے اور " وسادہ و مسند "[2] اُمرا کے جلوس کے واسطے
موضوع ھے - نظر اِس اصل پر سلطان کو " زیب‌افزاے آورنگ "
بے اِضافۂ لفظ " سلطنت " اور امیر کو " زینت‌بخش مسند " بےافزایش[3]
لفظ " اِمارت " لکھو - انبیا، خصوصاً سیدالانبیا مسند پر کب بیٹھے
تھے ؟ اُن کے غلاموں کو اِمارت ننگ ھے اور زمزمۂ " الفقر فخری "
بلندآھنگ ھے - میرے خداوند کا فرش : حصیر ، نمد ، گلیم ؛
رداے صحابہ : سطح خاک - میں ، مومن‌مجرم ، اپنے اُس خداوند
کو جس کی شان میں اگرچہ یہ مصرع مدح مجمل ھے :

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن قول فیصل ھے ، " آب‌دہ دست " و " زینت مسند " کیوں‌کر
سمجھوں ؟ بلکہ مجموع اھل اِسلام بہ‌شرط فہم صحیح و طبع سلیم گوارا
نہ کریں گے کہ وہ صفت عام ، جو دنیاداروں کے واسطے ھے ، قبلۂ
دین و دنیا پر صادق آئے - دکنی اور اُس کے فضلہ‌خوار قابل
خطاب نہیں - ایہا الاخ المکرم ! " فضلہ‌خوار " جواب ھے" پس

---

۱ - قلمی نقل : " سے " - ۲ قلمی نقل : " اور اورنگ و سادۂ مسند " -

۳ - قلمی نقل : " بے اضافۂ

گردان جناب " کا - یہ کلمہ مستوجب عتاب نہیں - یقین ہے کہ آپ نے اب تو از روے دلالت لفظ و معني جان لیا ہوگا اور اِس فقیر حقیر کو نظربہ‌قومیت ترک و پیشۂ آبائيء سپاہ‌گری " محسن المحققین " خطاب دیا ہوگا - جاننا اِس امر کا [ہے] کہ " آب‌دہ دست " میں اگر " آب " سے پاني اور " دست " سے ہات مراد لیں ، تو اُس کو اِسم پیمبر سمجھنا کتني بےادبي ہے ؛ اور اگر " آب " کو بہ‌معنیء رونق اور " دست " کو بہ‌معنیء مسند مانیں ، تو بے اِلحاق لفظ " نبوت " و " ہدایت " حضرت کو اِس ترکیب کا مشار اِلیہ سمجھنا کیسي بوالعجبی ہے - " آب‌دہ دست " و " رونق‌بخش مسند " صفت ہے عموماً منعمان مال‌دار کي ، یہاں تک کہ اِس اِصطلاح سے تعریف کر سکتے ہیں صرافان و ساہوکاران بلاد و امصار کی - میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بہ‌کمال تعظیم سلام کرتا ہوں - پیمبر کی تحقیر کو مسلم رکھتے ہو ، تم جانو ؛ اور سید ابرار خاقاني پر بہتان کرتے ہو تم جانو اور وہ میدان معني کا شہسوار - مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے ؛ اگرچہ وہ سب الغو ہے اور جھوٹ ہے ، معقول اور راست نہیں ؛ لیکن ، واللہ ، مجھ کو عرصۂ محشر میں اُس کي بازخواست نہیں -

ز یمن عشق بہ کونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و ز ما دوستی تماشا کن -

تکملہ (ص ۹۰ و ۹۲)

۱ - منشی مشکور علي صاحب نے مہرباني سے اپنے والد مرحوم کے حالات لکھ کر بھیجے ھیں جن کا اقتباس یہ ھے :—

حکیم محب علي ' " نیر " ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ (م ۲۴ جون ۱۸۳۸ م) کو پیدا ھوئے - فارسی ' عربي اور طب کي تعلیم اپنے والد سے پائي - میرٹھ میں نواب مصطفی خاں " شیفتہ " کے پڑوس میں رھتے تھے اور اُن سے تلمذ بھي تھا - مرزا " غالب " میرٹھ آتے تو نواب صاحب ھي کے ھاں ٹھہرا کرتے تھے - حکیم صاحب اُن کو اپنے مسودے دکھاتے تھے - جب غدر ھوا ھے تو حکیم صاحب میرٹھ کي عدالت کے سررشتۂ نظارت میں اپنے والد کي جگہہ پر کارگذار تھے - جب غدر فرو ھو گیا تو مین‌پوري آکر وکالت شروع کي - طبابت بھي کرتے تھے مگر اُس سے روپیہ کمانا مقصود نہ تھا - شاعري کا مشغلہ بہت کم تھا - ۱۸ جمادی الاخر ۱۳۲۲ھ (م ۳۱ اگست ۱۹۰۴ م) کو اِنتقال کیا اور مین‌پوري کي عیدگاہ کے صحن میں اپنے والد کے پائیں دفن ھوئے -

۲ - (ج) کے مکتوب اِلیہ غالباً مولوي ضیاءالدین خاں ' پروفیسر دھلي کالج ' تھے جو اُسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے ؛ ۱۸۶۴ م میں عربي کے مددگار پروفیسر اور بعد کو پروفیسر مقرر ھوئے ؛ کالج کے ٹوٹ جانے پر اِکسرا اسسٹنٹ کمشنر ھوئے اور آگے چل کے شمس‌العلما کا خطاب اور ایل ایل - ڈی کا اِعزاز (اِڈنبرا یونیورسٹي سے) پایا - حج کو گئے تھے وھیں (غالباً ۱۹۰۹ م میں) وفات پائي - بسئي داراپور کے جاگیردار کے خاندان سے تھے' چنانچہ آج بھي اِن کے گھرانے کے لوگ " بسئي والے " کہلاتے ھیں - خط کے عنوان سے پایا جاتا ھے کہ " ضیا " اِن کا تخلص تھا ؛ مگر جہاں تک دریافت ھو سکا ' یہي اِطلاع ملی کہ مولوي صاحب شعر کہتے ھي نہ تھے - ممکن ھے کہ اِبتدا میں شعر کہتے ھوں بعد کو چھوڑ دیا ھو -

---

ضروري تصحیح (ھندستاني ' جلد ۳)

(۱) ص ۸۵ - اخیر سطروں میں " ایک لغت . . . . نایاب ھے " کي جگہہ یوں چاھیے : " شیخ محمد علي تھانوي کي کشاف اصطلاحات الفنون ' کي اِشاعت کا اِھتمام کیا ' جو بعد کو استمبول اور مصر میں بھي چھپي -

(۲) ص ۲۱۷ ' سطر - " کئي " کي جگہہ " تقریباً " چاھیے -

نیرنگ خیال

ہندوستان کا مقبول ترین علمی اور ادبی ماہوار مجلہ
دس سال سے برابر شائع ہو رہا ہے
سال بھر میں قریباً ایک ہزار (۱۰۰۰) صفحات
اور
کئی درجن رنگین تصاویر شائع ہوتی ہیں

ملک کی کئی ہزار تعلیم یافتہ خواتین اُسے پڑھتی ہیں - نیرنگ خیال کی اشاعت ہندوستان بھر کے تمام علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ ہے ہر ماہ تقریباً ایک لاکھ تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ میں رہتا ہے - نیرنگ خیال کی مقبولیت کا راز صرف یہ ہے کہ اس میں تمام بڑے بڑے اہل قلم مضامین لکھتے ہیں اور اس کا چندہ بے حد قلیل ہے -

چندہ سالانہ : تین روپئے چار آنے - سالانہ سمیت چار روپئے بارہ آنے - سالانہ دسمبر کے پرچے کے علاوہ بطور زائد خاص نمبر علحدہ شائع ہوتے ہیں، جس کی جدا گانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے -

نیرنگ خیال میں اِشتہار دینا ہندوستان کی تمام متمول پبلک تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ ہے -

منیجر

نیرنگ خیال
شاہی محلہ، لاہور

—

اُردو

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) کا خالص
ادبی سہ ماہی رسالہ
جو
جنوری، اپریل، جولائی، اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے
جس میں
ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -
اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب، بی - اے -
سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو، جامعہ عثمانیہ،
حیدرآباد (دکن) -

سالانہ چندہ : سات روپیہ ایک نسخے کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)
یا
کتابستان
۱۷ - سٹی روڈ الہ آباد

سائینس

انجمن ترقی اُردو، اورنگ‌آباد (دکن) کا خالص
سائینس کا سه ماهی رساله
جو
جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع هوتا هے
جس میں
سائنس کي جدید ترین ایجادات،
انکشافات اور اختراعات پر بحث هوتي هے

زیرادارت

جناب پروفیسر مولوی محمد نصیرالدین احمد عثمانی صاحب،
ایم - اے، بي ایس سي - معلم طبیعات، کلیه جامعه عثمانیه،

سالانه چنده: آٹھه روپیه - ایک نسخه کی قیمت دو روپیه -

انجمن ترقي اُردو، اورنگ‌آباد (دکن)
یا
کتابستان،

۷۱ سٹی روڈ، الهٔ‌آباد سے
طلب کیجئے

دنیائے ادب میں غیر فانی اضافہ

رسالہ "جہانگیر" لاہور کا شاندار

قیمت ایک روپیہ چار آنہ

عید نمبر

دسمبر کے آخری ہفتہ میں ادبی باصرہ نواز خصوصیات سے منصۂ شہود پر

جلوہ گر ہوجائیگا

نتیجہ خیز و دلکش فسانے! محققانہ علمی مقالے!
کیف آور نظمیں! روح پرور غزلیں!

دیدہ زیب رنگین و سادہ تصاویر اس کی زینت ہیں - ہر صاحب ذوق اسے دیکھکر پکار اُٹھیگا کہ

"صفحۂ کاغذ بنا ہے دامن گل کا جواب"

سر زمین دکن کی مفصل تاریخ اور اعلحضرت خسرو دکن کے سوانح حیات کا

❁ عدیم النظیر مجموعہ نظام نمبر ❁

کسی مسلمان کو اِس کے مطالع سے محروم نہ رہنا چاہیے

شایع ہوچکا ہے - ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحات ۱½ درجن نادر تصاویر
قیمت فی پرچہ صرف دو روپیے لیکن مذکورہ ہر دو خاص نمبر

اگر بلا قیمت حاصل کرنا چاہتے ہیں

تو

آج ہی مبلغ تین روپیے چھہ آنے سالانہ قیمت بھیج کر مستقل خریداری قبول فرمائیں

نیاز مند ــــــــــــــــ

منیجر رسالہ جہانگیر ریلوے روڈ لاہور

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۴ } اپریل سنہ ۱۹۳۴ع { حصہ ۲

غالب کے خطوں کے لفافے

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے ' پی ایچ ' ڈی

"غالب" کے خطوں اور رقعوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے کو نامہ نگاری کا کیسا شوق تھا اور وہ خط کتابت میں کیا کچھ اہتمام کرتا تھا - بعضے خطوں کو پڑھ کے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص جیتا ہی اِس اُمید پر تھا کہ بیٹھا دوستوں کو خط لکھا کرے - اوروں کی کوتاہ قلمی کی شکایت قدم قدم پر کرتا ہے ' اپنے جلد جلد خط لکھنے اور بلا تاخیر جواب دینے کی ہر موقع پر داد چاہتا ہے - کبھی کسی اور سے خط کی نقل کروا کے رکھ چھوڑتا ہے ' کبھی مکتوب الیہ ہی سے فرمائش ہے کہ نقل لے کر میرا خط مجھے واپس بھیج دینا - کبھی تو ڈاک میں تلف ہو جانے کے ڈر سے خط بیرنگ بھیجتا اور مکتوب الیہ کو ہدایت کرتا ہے کہ تم بھی بیرنگ بھیجا کرو ' [۱] کبھی ڈاک خانے والوں سے رسم پیدا کرتا اور اپنے مکتوب الیہ کو یوں لکھتا ہے :—

---

۱ - رسالۂ "اُردو" ج ۱۴ ' ص ۱۹۵ -

" پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے ؛ جو دوست خط لکھتا ہے

وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے " ۔ [۱]

ایک شاگرد کو بگڑ کر لکھتا ہے :—

" ملک مغرب ، بلدۂ دہلی ، کٹرۂ روڈ گراں ، یہ کیا لکھا

کرتے ہو ؟ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے ۔ محلہ غلط ،

ملک زائد ۔ ہندوستان میں دلی کو سب جانتے ہیں ،

اور دلی میں مجھ کو سب پہچانتے ہیں " ۔ [۲]

ایک دوست کو لکھتا ہے :—

" وطن کو جاؤ ؛ لیکن ، بھائی ، وطن پہنچ کر ضرور مجھ

کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتا لکھنا تاکہ میں اُس نشان

سے تم کو خط بھیجوں " ۔ [۳]

اُنسی دوست سے کوتاہ قلمی کا شکوا کیسے خوب پیرائے میں کرتا ہے :—

" صاحب ، میں نے ' اودھ اخبار ' میں دیکھا کہ چھوٹے

صاحب مقدمہ جیتے ..... میں تو تہنیت میں خط لکھوں

گا ؛ مگر رشک آتا ہے کہ بہ حوالۂ ' اودھ اخبار ' لکھوں

اور بہ حوالۂ سیف الحق نہ لکھوں " ۔ [۴]

" جس شخص کو خط کتابت سے اِس درجے کی دل چسپی ہو

جس نے خطوط نویسی کو اچھا خاصا ایک فن لطیف بنا دیا ہو ، اُس کے

خط کے لفافے کیسے ہوتے ہوں گے اور اُن لفافوں پر پتا لکھنے کا کیا انداز

---

۱ ۔ عود ہندی (آگرہ ، ۱۹۱۰ ع) ، ص ۱۵۶ ۔

۲ ۔ رسالۂ " ہندستانی " ، ج ۳ ، ص ۴۷۶ ۔

۳ ۔ مکمل اردوے معلیٰ ، ص ۲۲ ۔

۴ ۔ اردوے معلیٰ ، ص ۲۳ ۔

ہوگا ؟ " یہ سوال اکثر ذہن میں آیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ جواب :
" افسوس ، لفافوں کو محفوظ رکھنے اور ہم تک پہنچانے کا اِن مکتوبات کے جمع کرنے والوں نے کچھ خیال نہ کیا " - اِس مایوسی میں " عود ہندی " اور " اردوے معلیٰ " کی ورق گردانی جو کی تو لفافوں کا نشان ملا - مطبع مفید خلائق ، آگرہ کے مہتمم ، منشی شیو نرائن سے ارشاد ہوتا ہے :—

" لفافوں کی خبر پہنچی - آپ نے کیوں تکلیف کی ؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے : بیکار آدمی کیا کرے - بہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے ، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے -

ع ہرچہ از دوست می رسد نیکوست " - ۱

منشی شیو نرائن بچارے نے لفافے چھپوا بنوا کے بھیجے مگر وہ کاہے کو حضرت کے پسند آتے - سن لیجیے :—

" برخوردار ، آج اِس وقت تمہارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا ؛ دل خوش ہوا - بھائی ، میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں : یہ لفافے ' از مقام ' و ' در مقام ' یہ ' تاریخ ' و ' ماہ ' مجھ کو پسند نہیں - آگے جو تم نے بھیجے تھے ، وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے - اب یہ لفافوں کا لفافہ اِس مراد سے بھیجتا ہوں کہ اِن کے عوض یہ لفافے جو ' در مقام ' و ' از مقام ' سے خالی ہیں ، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو ، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اُس کے عوض مجھ سے لے لو -

---

۱ - اُردوے معلیٰ ، ص ۲۵۹ -

اور اگر اِس طرح کے لفافے نہ ہوں تو اُن کی کچھ
ضرورت نہیں '' ۔ [۱]

معلوم ہوا کہ کسی عبارت بلکہ کسی لفظ کا بھی لفافوں پر چھپوانا مقصود نہ تھا ؛ مگر یہ نہیں کھلتا کہ پھر کیسے لفافے چاہتے ہیں ' جن کے لیے آگرے کے چھاپےخانے سے یہ خط کتابت ہو رہی ہے ۔ ہمیں منشی مہیش پرشاد صاحب کا شکرگذار ہونا چاہیے جن کی کوشش سے غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک ہی دو نہیں ' چوبیس لفافے دیکھنے کو ملے ؛ ایک کا عکس اور تیئیس اصل ۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ اِن چوبیس لفافوں میں سے سات کے حاشیوں پر طرح طرح کی سیاہ‌قلم بیلیں اور مداخل چھپے ہوئے ہیں اور اُن کے اندر پتا اور 'در مقام' و 'از مقام' اور 'تاریخ' و 'ماہ' سب کچھ حضرت کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے ۔ یہ تھے وہ لفافے جن کی فرمائش تھی ۔

وہ ایک لفافہ جس کا عکس منشی صاحب نے حاصل کیا ہے ' محبی صلاح‌الدین خدا بخش مرحوم و مغفور کے قبضے میں تھا ؛ اُن کی ناوقت موت کے بعد اُن کی کتابوں کے بیش‌بہا ذخیرے کے ساتھ بانکے‌پور کے کتب خانۂ خدا بخش میں داخل ہوا ۔ باقی تیئیس لفافے ' جو سب کے سب قاضی عبدالجمیل صاحب مرحوم ''جنون'' بریلوی کے نام لکھے گئے تھے ' اُن کے بیٹے جناب قاضی محمد خلیل صاحب زاد مجدہ نے منشی مہیش پرشاد صاحب کو اِشاعت کے لیے مرحمت فرمائے ۔ منشی صاحب نے مجھ پر کرم فرما کر مجھے اِن کے شائع کرنے کی اِجازت دی ' جس کے لیے میں اُن کا شکرگذار ہوں ۔

---

۱ ۔ اُردوے معلیٰ ' ص ۷۱ ۔ ۲۷۰ ۔

قاضي صاحب مرحوم کے نام کے لفافوں پر بعد کو کسی نے شمار کے ہندسے لگائے ہیں اور اِس میں تاریخوں کي تقدیم تاخیر کا بھی لحاظ رکھا ہے - غلطی سے دو لفافوں پر 'ایک' کا ہندسہ پڑ گیا ہے ؛ تین پر کوئی ہندسہ نہیں ہے - وہ لفافے، جن پر ۴، ۵، ۹، ۱۱، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۶، ۲۸ اور ۲۹ کے ہندسے پڑے ہوں گے، موجود نہیں ہیں - آخری ہندسہ ۳۱ ہے اور اِس لفافے پر روانگی کي تاریخ ۹ اکتوبر ۱۸۶۴ع لکھی ہے - اِس تاریخ کے بعد کے بھی دو لفافے موجود ہیں : ایک ۷ نومبر ۱۸۶۵ع کا، دوسرا ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ع کا لکھا ہوا - اِن لفافوں میں سب سے پرانا وہ ہے جس پر ۱۲ اکتوبر ۱۸۵۳ع کی تاریخ لکھی ہوئی ہے ؛ مگر قاضي صاحب کے نام ایک خط "پنج آہنگ" میں بھی ہے اور اُس کي کتابت کی تاریخ ۲۸ صفر ۱۲۶۹ھ ہے (یعنی ۱۱ دسمبر ۱۸۵۲ع) اور غالباً یہی سب سے پہلا خط ہے جو مرزا غالب نے قاضی صاحب کو لکھا - اِس حساب سے غالب نے اپنے مرنے سے سوا دو برس پہلے تک قاضی صاحب کو کم سے کم چھتیس خط بھیجے تھے ؛ مگر "پنج آہنگ" اور "اُردوے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں سب ملاکر کل اٹھارہ ھي خط ہیں - اِس کمي کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی کا کلام اِصلاح کے لیے آتا تھا تو اصلاح کے بعد وہ لفافے میں رکھ کے واپس کردیا جاتا تھا ؛ اُس کے ساتھ کسي خط کا ہونا ضروری نہ تھا -

افسوس ہے کہ اِن لفافوں کے اندر جو خط یا کاغذ تھے وہ بیشتر ضائع ہو گئے - صرف پانچ کاغذ باقی رہ گئے ہیں جن سے "ہندستاني" کی کسي اگلي اشاعت میں بحث کی جاسکے گی -

موجودہ لفافوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جس طرح اپنی اِنشا میں اکثر زوائد کو ترک کردیا تھا، لفافے پر پتے کی جو عبارت

لکھا کرتے تھے اُس میں بھی رفتہ رفتہ بہت اختصار کر دیا تھا - اِن لفافوں کو سلسلہ وار دیکھنے سے اِس تدریجی اِصلاح کا پورا اندازہ ہو سکے گا - اِس لیے آئندہ صفحوں میں سب پتے نقل کیے جاتے ہیں - صرف اُن لفافوں کی نقل نہیں دی گئی جن کے عکس اِس مضمون میں شامل ہیں اور جن کی پوری عبارت عکس میں آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے - ایک خاص بات یہ ہے کہ اُس زمانے کے دستور کے خلاف غالب کبھی کبھی پتا ' بجائے فارسی کے ' اردو عبارت میں لکھا کرتے تھے - چنانچہ اِن چوبیس میں تین لفافے ایسے ہیں (عکس د' ہ' م) جن پر پتا اردو میں لکھا ہے - غالب کے بعض خطوں میں تاریخ نہیں ہے مگر لفافے پر ضرور تاریخ لکھتے تھے - صرف ایک لفافے پر ' جو دستی بھیجا گیا تھا (عکس ی) تاریخ نہیں ہے - قاضی صاحب ' بریلی سے کہار کے ہاتھ آم بھیجا کرتے تھے : غالب شکریے کا خط لکھ کر اُسی کہار کے حوالے کردیا کرتے تھے - چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں [1] :—

"سبحان اللہ ! سر آغاز فصل میں ایسے ثمرہائے پیشرس [2] کا پہنچنا نوید ہزارگونہ میمنت و شادمانی ہے - ......جمعے کے دن دوپہر کے وقت کہار پہنچا - اُسی وقت خط کا جواب اور آم کے دو خالی ٹوکرے دیکر روانہ کیا......" [3]

عجب نہیں کہ یہ لفافہ اِسی خط کا ہو -

کچھ لفافے ایسے بھی ہیں جن پر خط کے پہنچنے کی تاریخ لکھی ہے - یہ غالباً مکتوب اِلیہ کبھی کبھی لکھ دیا کرتے تھے - ایک لفافے کی

---

۱ - اُردوے معلیٰ ' ص ۱۵۸ : عود ' ص ۱۵۷ -

۲ - "عود" میں "پیشرس" ہے ' جو صحیح نہیں -

۳ - ایک اور خط میں ہے : "دس قلمیں اور چھٹانک بھر سیاہی کہار کے حوالے کردی ہے - خدا کرے بلا حفاظت آپ کے پاس پہنچے" (اردوے معلیٰ ' ص ۱۵۹) -

تاریخ کا اخیر حصہ ضائع ہوگیا ہے (عکس و) مگر رسید کی تاریخ سے سلہ دریافت ہوتا ہے -

یہاں لفافوں کی نقلیں دی جاتی ہیں ، اِس اِلتزام کے ساتھ کہ :—

(الف) سلسے کے شمار کے بعد قوسین میں وہ ہندسہ دے دیا گیا ہے جو اُس لفافے پر بعد کو کسی نے ڈال دیا ہے - اگر لفافے پر کوئی ہندسہ نہیں ہے تو قوسین میں چلیپا بنا دیا گیا ہے -

(ب) جو لفظ یا حرف کاغذ کے پھٹ جانے سے ضائع ہوگئے ہیں اُن کو ، جہاں تک ممکن ہوا ، پورا کرکے کھلی‌دار خطوں میں رکھا ہے -

(ج) جن لفافوں کے عکس دیے گئے ہیں اُن کی نقل نہیں دی گئی ہے ، بلکہ عکس کا حوالہ دے دیا گیا ہے مگر جن میں کوئی لفظ یا حرف ضائع ہوگیا ہے اُن کی پوری یا ضروری حصے کی نقل بھی دے دی گئی ہے -

۱ (۱) : عکس (الف)—۱۲ اکتوبر ۵۳ ع ۱

۲ (۱) : عکس (ب)—۲۱ اکتوبر ۵۳ ع ۱

۳ (۲) : عکس (ج)— ۲۶ اکتوبر ۵۴ ع ۱

۴ (۳) : عکس (د) :—

[شہر بر]یلی سوجے خاں کا گھیر [2] پرانے قلعہ اور مسجد [جامع کے] قریب مرزا غلام قادر بیگ کے مکان پر پہنچ کر مخدوم مکرم مولوی عبدالجمیل صاحب کو پہنچے از اسد من‌مقام دہلی مرسلۂ دہم نومبر سنہ ۱۸۵۴ع پوست پیڈ - ۱

---

۱ - عبارت کے ختم پر جو علامت ہے وہ " فقط " کی مخفف شکل ہے ، جو اکثر پانچ کے ہندسے کے مماثل لکھی جاتی تھی -

۲ - یعنی " اِحاطہ " - رہیلکھنڈ کے شہروں میں یہ اِصطلاح بہت عام ہے -

۵ (۶) :—

درشهر بریلی کٹرہ مان راے بدوکان حافظ احمد حسین صاحب سوداگر موصول و بخدمت مخدومی مکرمی مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌الله تعالیٰ مقبول باد از اسد مرسلۂ شنبہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۵۵ع پوست پید ۔ [1]

۶ (۷) :—

در بریلی بہ کٹرہ مان را[ے بہ دکان حافظ احمد حسی]ن صا[حب سوداگر موصول و بخدمت مخدوم] مکرم مولانا قاضی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌الله تعالیٰ مقبول باد از اسد مرسلہ [......]سنہ [۱۸۵۶] پوست پد

۷—(X) : عکس (۵) :—

[شہر [2] بدایو]ں میں فرشوری تولہ محلہ میں جناب مولوی اساس‌الدین صاحب کے پاس پہنچ کر [اون کے ذریع]ہ سے میرے شفیق عنایت فرما مولوی عبدالجمیل صاحب کو پہنچے از غالب یکرنگ بیرنگ[3] مرسلۂ چہارم جون سنہ ۱۸۵۸ع

۸ (۸) :—

در شہر بانس بریلی موصول و بخدمت قاضی صاحب شفیق مکرم و مخدوم معظم قاضی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌الله تعالیٰ مقبول باد مرسلۂ اسدالله روز جمعہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ع اسٹامپ پید ۔ [1]

---

۱ ۔ دیکھو صفحہ ۱۳۹ حاشیہ ۱ ۔

۲ ۔ یا شائد " خط ہذا " ۔

۳ ۔ یہ لفظ غالب کے لیے نہیں ' بلکہ خط کے لیے ہے ۔

عکس (د)

عکس (ج)

بریلی قاضی کا ٹولہ ۱۹ رجب سنہ ۱۲۶۳ بیرنگ ضرور

بخدمت مولوی صاحب مخدوم و مکرم مولوی عبدالجلیل صاحب زاد مجدہٗ موصول باد

عکس (ط)

۹ (۱۰) :—

در بھیسلپور بمحکمۂ منصفی موصول و بخدمت مولوی صاحب مخدوم مکرم مولوی قاضی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌اللہ تعالیٰ مقبول باد از غالب مرسلۂ جمعہ ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۵۹ع بصیغۂ اسٹامپ پیڈ ۱۲

۱۰ (۱۱) : عکس (و) :—

یکشنبہ ۲۸ ماہ [اگ]ست [سنہ ۱۸۵۹ع]

[باد]مقبول.........

۱۱ (۱۲) :—

***[1] ** یوم‌الخمیس ۸ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ع

بخدمت مولوي صاحب شفیق مکرم و مخدوم معظم جناب مولوي قاضی عبدالجلیل [2] صاحب سلمہ‌اللہ تعالی مقبول باد

۱۲ (۱۳) :—

*** ۲۷ جنوري سنہ ۱۸۶۱ غالب یکرنگ بیرنگ

بخدمت مولوی صاحب مخدوم مکرم و معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌اللہ تعالی موصول باد

۱۳ (۱۴) :—

*** ۲۲ فروری سنہ ۱۸۶۱ غالب یکرنگ بیرنگ

بخدمت مخدوم مکرم و مطاع معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب امین منصفی بھیسلپور سلمہ اللہ تعالی موصول باد

---

۱ - اِن نشانوں سے یہ مراد ہے کہ یہاں بھی وہی لفظ ہیں جو عکس (و) میں اِن مقامات پر ہیں ۔

۲ - یہاں دھوکے سے ' جمیل ' کی جگہ ' جلیل ' لکھ گئے ہیں ۔

۱۴ (۱۵) : عکس (ز)—۳۰ جون سنه ۶۱ - [1]

۱۵ (۱۸) : عکس (ح)—۱۹ جون سنه ۱۸۶۳ -

۱۶ (۲۱) :—

بریلی قاضی کا پل ۷ جنوری سنه ۱۸۶۴ پیڈ ضروری

بخدمت مخدومی مکرمی جناب مولوی عبدالجمیل صاحب زاد مجدہ موصول باد

۱۷ (۲۴) :—

بریلی قاضی کا پل ۱۹ مارچ سنه ۱۸۶۴ع [2] پیڈ ضروری

بخدمت مولوی صاحب مخدوم مکرم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌الله تعالی فائز باد

۱۸ (۲۵) : عکس (ط)—۴ اپریل ۱۸۶۴ع [3] پیڈ [ضـ]ر[وری]

۱۹ (۲۷) : عکس (ی)—[مظ]ہر......مجد[ہ]

۲۰ (۳۰) : عکس (ک)—۲۴ اگست سنه ۱۸۶۴ [4]

۲۱ (۳۱) : (بیلدار حاشیه) :—

بریلی مسجد جامع قاضی کا پل ۹ اکتوبر سنه ۱۸۶۴ پیڈ ضروری

بخدمت شفیقی مکرمی مولوی عبدالجمیل صاحب سلمہ‌الله تعالی موصول باد

---

۱ - مگر دلی کے ڈاک خانے کی مہر میں '۲۹ جون ۶۱' ھے - ٹکٹ کے نیچے 'غالب' لکھا ھے اس طرح سے کہ لام کی نوک اور بے کا اخیر حصہ ٹکٹ کے اوپر آگیا ھے -

۲ - ٹکٹ کے اوپر 'اسد' لکھا ھوا ھے - ۳ - ٹکٹ کے اوپر 'غالب' لکھا ھوا ھے -

۴ - ٹکٹ کے اوپر 'اسد' لکھا ھوا ھے -

عکس (ی)

بہ لطف و کرم مولوی عبدالجمیل صاحب زاد مجدہ

عکس (ک)

عکس (ل)

عکس (۴)

بریلیا جامع مسجد کے پاس حضرت قاضی عبد الجلیل صاحب کی خدمت میں پہنچے
اسے یکرنگ بیرنگ ۱۶ ماہ اکتوبر سنہ ۶۶
Barrelly

عکس (ن)

از عظیم آباد پٹنہ محلہ کشمیری کوٹھی مطبع عظیم المطابع موصول و بخدمت جناب
میر ولایت علی صاحب مہتمم مطبع مذکور زاد مجدہ مقبول باد رسید فرود
جواب طلب
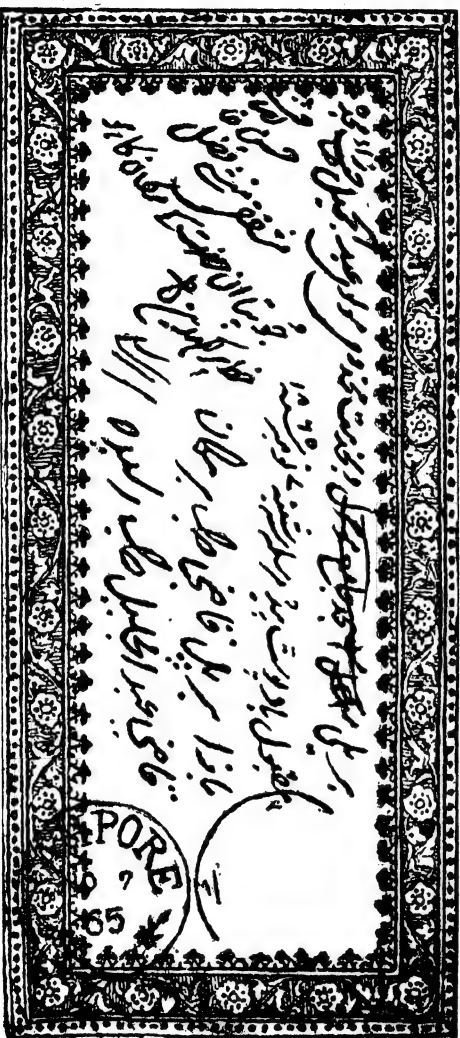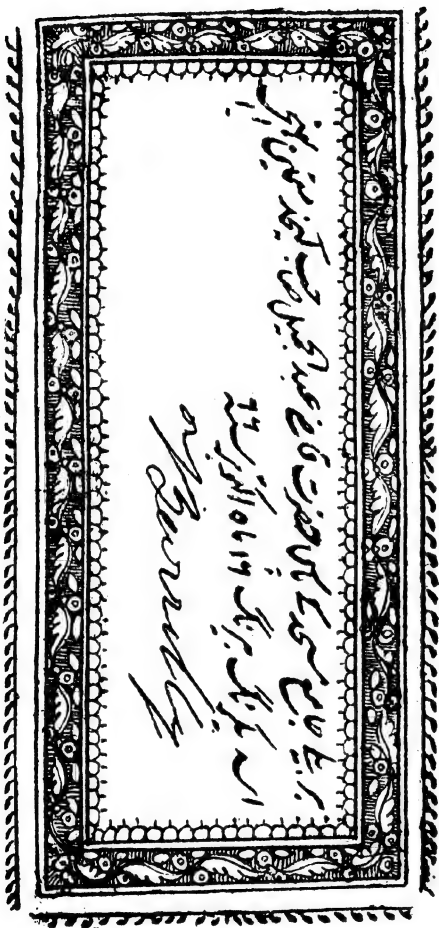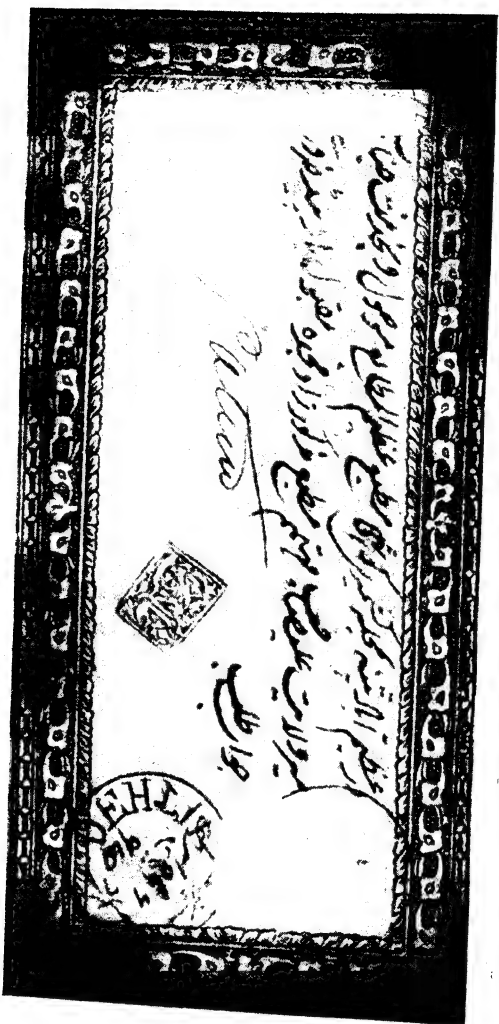
۲۲ (X) : عکس (ل)— ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۵

۲۳ (X) : عکس (م)— ۱۶ اکتوبر سنہ ۶۶—

۲۴ : عکس (ن)—

یہ خط میر ولایت علی مہتمم عظیم المطابع : پٹنہ کے نام ھے اور غالباً ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا - داھنی طرف نیچے کے گوشے میں " ۶ ماہ اپریل " لکھا ھوا ھے اور اُس کے نیچے ' ۶۵ ' کا ھندسہ معلوم ھوتا ھے - ڈاک خانے کی مہر اِن لفظوں پر پڑی ھے اور ' ۶۵ ' کے اوپر اپریل کے حرف AP آگئے ھیں جن کی وجہ سے خاص کر ' ۵ ' کا ھندسہ مشکل سے پڑھا جاتا ھے - اِسی گوشے میں بائیں جانب کو زرا ھٹ کر غالب کی مہر ھے :

" غالب ۱۲۷۸ "

یہ وھی مہر ھے جس کا عکس " ھندستانی " کی پچھلی اِشاعت میں (ص ۹۸ کے مقابل) موجود ھے -

---

تصحیح

" ھندستانی " کی پچھلی اِشاعت (بابت جنوری ۳۴ء) میں جو میرا مضمون شائع ھوا ھے اُس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ھیں - ناظرین

براہ کرم اِس طرح تصحیح کر لیں :—

ص ۹۰ ' حاشیہ س ۷ : " میرتھ " کی جگہ " اِیٹہ " اور س ۱۲ : " ھاں " کی جگہ " وھاں " ؛ ص ۹۱ ' س ۹ : " چپ " کی جگہ " چھپ " ؛ ص ۱۱۶ ' س ۱۹ : "سمجھو" کی جگہ " سمجھوں " ؛ ص ۱۱۷ ' س ۱ : " کے " کی جگہ " کہ " ؛ ص ۱۳۲ ' س ۴ : " ۲۳ جون " چاھیے -

ص ۱۱۱ کے حاشیوں کے ھندسے ۴ ' ۵ ' ۶ ' کی جگہ ۱ ' ۲ ' ۳ چاھیں - " ۷- میرزا...الخ " کو قلمزد کرکے یوں پڑھنا چاھیے :—

"۴— میرزا جلال‌الدین طباطبائی اِصفہانی ۱۰۴۴ھ میں ھندستان آکر شاھجہانی دربار کے تاریخ نویسوں میں شامل ھوا - اُسی سال ایک کتاب " شش فتح کانگڑہ " کے نام سے لکھی ' جس میں ایک مہم کا حال چھ مختلف بلیغ پیرایوں میں تحریر کیا ھے - دوسری کتاب " بادشاہ نامہ " ھے ' جس میں شاھجہاں کے جلوس کے پانچویں سال کے آغاز سے آتھویں سال کے آخر تک کے حالات ھیں - اِس کی سب سے زیادہ مشہور کتاب " توقیعات کسریٰ " ھے جس کی تالیف ۱۰۶۲ھ میں شروع ھوئی اور جو شاھجہاں کے بیٹے مراد کے نام سے معنون ھے - برتش میوزیم کے ایک قلمی نسخے (اوریئنٹل ۱۶۸۰) میں جلال کی بیاض کا ایک انتخاب محفوظ ھے اور اُس میں وہ تادیب نامہ بھی شامل ھے جو اُس نے " شیدا " کو لکھا تھا اور جس کا حوالہ غالب نے دیا ھے " -

دکن کے مراثی اور مرثیہ گو

(از صغیر احمد صدیقی ، بی ، اے)

یہ بات اب ہر شخص کو معلوم ہے کہ اُردو ادب کی ابتدائی نشو و نما دکھن میں ہوئی اور اُس وقت جبکہ شمالی ہند میں فارسی کا دور دورہ تھا دکن میں لاتعداد ایسے شعرا موجود تھے جو صرف اُردو ہی زبان میں شاعری کرتے تھے اور نثر نگار تھے جو ہر قسم کا اظہار خیال اسی زبان میں کرتے تھے - جدید تحقیقات نے اس قسم کے معتدبہ لٹریچر کو بے نقاب کیا ہے اور ہندوستان اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں بہت تفحص و کاوش کے بعد ان اردو شہ‌پاروں کا پتا لگایا ہے - انھیں تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ اور اصناف سخن کے دکھنی شعرا نے مرثیے کو بھی فروغ دیا اور علاوہ مستقل مرثیہ گویوں کے عموماً شعرا اس میں کچھ نہ کچھ طبع آزمائی کرتے تھے - ان شعرا کے کلام کے نمونے اور اُن پر محققین کے تبصرے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ گوئی نے دکن میں خاصی ترقی کر لی تھی اور موجودہ مرثیے کے جملہ لوازم جو شمالی ہند کے شاعروں خاص کر سودا کا اختراع سمجھے جاتے ہیں دکھنی مرثیہ گویوں کے یہاں بھی اپنی ارتقائی حالت میں پائے جاتے ہیں - جو کتابیں اُردو شاعری کی تاریخ یا مرثیہ گوئی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں مثلاً آب حیات ، گُل رعنا ، شعرالہند ، تاریخ ادب اردو ، اور موازنہ انیس و دبیر وغیرہ سب ان تحقیقات سے

پہلے کی ھیں اس لیے ان میں قدیم مراثی پر کما حقہ روشنی نہیں ڈالی جاسکی لہذا ضرورت ھے کہ دکنی مراثی کی جو اُردو کے قدیم ترین مرثیے ھیں ایک اجمالی تاریخ مرتب کیجائے جس کے لیے یہ مختصر سا مضمون ھدیۂ ناظرین ھے - [۲]

مرثیہ اُردو کے قدیم ترین اصناف سخن میں سے ھے چونکہ ایک عرصۂ دراز تک دکن کے قدیم شعرائے اردو کا کلام پس پردہ رھا اس لیے اردو شاعری کی ابتدا سے لوگ بالکل بے خبر رھے - عموماً ولی سب سے پہلا اردو شاعر تسلیم کیا جاتا تھا - اس لیے فطرتاً مرثیے کی ابتدا بھی اُسی زمانے میں سمجھی جاتی تھی - آزاد نے "آب حیات" میں سیوا نامی ایک دکن کے مصنف کا تذکرہ کیا ھے - لکھتے ھیں کہ اُس نے "روضۃالشہدا کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا - اُس کے مرثیے اب تک وھاں کے امام باڑوں میں پڑھے جاتے ھیں اور غالب ھے کہ اس طرح کے شاعر اُس عہد میں بہت ھونگے - مگر ایسی شاعری کو علمی نہیں کہہ سکتے" [۳] مگر اصول ارتقا کو مد نظر رکھتے ھوئے ھم کو شعرائے متقدمین کے کلام کو شعر کے جدید معیار سے نہ جانچنا چاھیے - کیونکہ امتداد زمانہ کے ساتھ ھر چیز کا معیار بھی بدلتا جاتا ھے - ایسی صورت میں ھم کو اُس زمانے کے مذاق کے اعتبار سے ایک معیار قائم کرنا چاھیے اور اس تاریخی معیار پر اُن شعرا کے کلام کو جانچنا چاھیے - تب اُس وقت معلوم

---

۱ - [اصل یوں ھے کہ اِن کتابوں کے مصنفوں نے نہ شاہ حاتم سے پہلے کے شاعروں کے کلام کی طرف پوری توجہ کی نہ دکھنی زبان سے واقف تھے - پھر تحقیق ھوتی تو کیوں کر ؟ اِدارہ]

۲ - اس مضمون میں صرف اُنھیں مرثیہ گویوں کا ذکر کیا گیا ھے جو مستقل طور پر مرثیہ لکھتے تھے یا جن کے مراثی کوئی تاریخی اھمیت رکھتے ھیں -

۳ - آب حیات ، ص ۷۹ -

ہوگا کہ اُس زمانے کی شاعری بھی "علمی شاعری" تھی اگر واقعی "علمی شاعری" کا کوئی مفہوم ہے -

مولانا شبلی نعمانی بھی لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں شاعری کی ابتدا ولی سے ہوئی" پھر لکھتے ہیں کہ "ولی [1] نے اگرچہ کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھي لیکن اُس کے کلام میں مرثیے کا پتا نہیں لگتا" - تذکرہ گُل رعنا میں بھی ایک ایسی مثنوی ولی کی جانب منسوب کی گئی ہے [2] جس کا حوالہ تاریخ ادب اردو کے مصنف نے بھی دیا ہے - [3] مگر جدید تحقیقات سے جہاں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ولی سے بہت پہلے اردو شاعري کی ابتدا دکن میں ہوچکی تھی وہاں یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ در حقیقت ولی ویلوری نے ایک مثنوی بنام روضۃالشہدا لکھی تھی جس کا تعلق ملا حسین واعظ کاشفی کی اسی نام کی کتاب سے ہے اور جس کو دہ مجلس بھی کہا جاتا ہے - ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ "دہ مجلس اس مشہور و معروف ولی کی تصنیف نہیں بلکہ یہی روضۃالشہدا ہے جس کا نام دہ مجلس بھی ہے اورنگ‌آباد کے ولی نے اس نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی ہے، حال ہی میں ولی کا جو کلیات طبع ہوا ہے اُس میں دہ مجلس کے جو چند اشعار ہیں وہ فی‌الحقیقت ویلور کے ولی کے ہیں [4]" - مولف "یاد گار انیس" نے بھی غلطی سے اس

---

۱ - موازنۂ انیس و دبیر، ص ۱۱ - ۲ - گل رعنا، ص ۲۹۷ -
۳ - تاریخ ادب اردو ترجمۂ مرزا محمد عسکری صفحہ ۲۱۲ حاشیہ -
۴ - اردو شہ‌پارے، ص ۱۳۵ -

مثنوی کو ولي اورنگ آبادی سے منسوب کیا ھے اور مثنوي کے خاتمے کے یہ دو شعر درج کیے ھیں :—

ھوا ھے ختم جب یو درد کا حال

تھا گیارہ سو یہ اکتالیسواں سال

کہا ھاتف نے یو تاریخ معقول

ولی کا ھے سخن حق پاس مقبول [۱]

مگر نصیرالدین صاحب ھاشمی لکھتے ھیں کہ "یورپ کے کسی نسخے میں دہ مجلس، کا قطعہ تاریخ درج نہیں ھے خصوصاً سب سے قدیم دیوان جو ۱۱۴۴ ھ کا لکھا ھوا ھے اور ابوالمعالی کے فرزند کے جمع کردہ - دیوان میں اس کا نہونا اس امر پر دلالت کرتا ھے کہ ولی نے وہ تاریخ نہیں کہی" - [۲] بہر حال اب یہ بالاتفاق تسلیم کر لیا گیا ھے کہ ولی نے کربلا کے حالات میں کوئی مثنوی نہیں لکھی مگر اُنھوں نے کچھ مرثیے ضرور کہے ھیں جو اُن کے دیوانوں میں نہیں ملتے - ھاشمي صاحب نے ایڈنبرا کے مرثیوں کی بیاض میں اِن کا پتا لگایا ھے اور اُس کے کچھ اقتباسات بھی ولی کے نام سے اپنی قابل قدر تالیف میں درج کیے ھیں مگر اُنھوں نے اِس کی تصریح نہیں کي ھے کہ آیا وہ ولی ویلوری کے ھیں یا ولي اورنگ آبادی کے - غالباً اُن کی مراد ولی اورنگ آبادی سے ھے جو صاحب دیوان ھیں -

اے ھادئی سلسار تو کیوں جا بسایا کربلا

اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا

---

۱ - یادگار انیس ، ۸ -

۲ - یورپ میں دکھنی مخطوطات ، ص ۴۹۵ -

اے نور چشم مصطفیٰ فرزند نوشاہ مرتضیٰ
اے دلبر خیرالنساء کیوں جا بسایا کربلا
تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے
تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا

سلام :—

اُس نور مصطفیٰ پسر بولو سلام یاراں
محبوب مرتضیٰ پسر بولو سلام یاراں
اُس پاک پارسا پر حیدر کے دلربا پر
اُس لعل بے بہا پسر بولو سلام یاراں
یوجی ولی فدا کر اس شاہ کربلا پر
اُس لائق ثنا پسر بولو سلام یاراں[۱]

لیکن مرثیہ گوئی کی ابتدا ولی سے بہت پہلے ہو چکی تھی - پھر سوال یہ ہے کہ سب سے پہلا مرثیہ گو کون تھا صاحب تذکرہ " گل رعنا " لکھتے ہیں کہ " اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی - وہاں شروع ہی سے مرثیہ گو پیدا ہوگئے - علی عادل شاہ کے زمانے میں ایک مرثیہ گو تھا جو اردو میں مرثیہ کہتا تھا اور بادشاہ کے اصرار پر بھی اس نے اپنی زبان کو بادشاہ کی تعریف سے آلودہ نہیں کیا - جب تک جیتا رہا مرثیے کہتا[۲] رہا " یہ غالباً اس مرزا کے متعلق ہے جو علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا سب سے بڑا مرثیہ گو تھا مگر مرثیے کی ابتدا اس سے بھی بہت پہلے ہو چکی تھی - مولف " دکن میں اُردو " نواب نصیر حسین خیال کے مضمون داستان اردو مطبوعہ رسالۂ لسان الملک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شمالی ہند سے بہت پہلے دکن میں مجالس عزا

---

۱ - یورپ میں دکھنی مخطوطات ، ص ۶۳۴ - ۶۳۵ -

۲ - گل رعنا ، ص ۳۹۶ -

اور مرثیہ گوئی کا رواج ہو چلا تھا - سب سے پہلے بیجاپور پھر گولکنڈے اور احمد نگر میں - اِبتداً یہاں فارسی شعرا کا کلام اور بالخصوص محتشم کاشی کا مرثیہ پڑھا جاتا تھا - مگر چونکہ بعد میں دکھنی نے قریب قریب فارسی کی جگہہ لے لی تھی اِس لیے مراثی کا اِس زبان میں ادا ہونا ناگزیر تھا - اِس طرح مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا جن میں سب سے پہلا نوری تھا مصنف " دکن میں اردو " نے ان کی تقلید کرتے ہوئے مرثیہ گویوں میں سب سے پہلا نام شیخ شجاعُ‌الدین نوری کا پیش کیا ہے - پھر لکھتے ہیں کہ " نوری بیجاپوری علم و فن کا شائق شعر و سخن کا دلدادہ تھا - علم کا شوق آگرے تک لے گیا - ایک زمانے تک ابوالفضل اور فیضی کا ساتھ رہا " [۱] صاحب " شعرالہند " نے بھی اِنھیں کی تقلید کی ہے - [۲] مگر حقیقتاً فیضی کے دوست نوری کا شجاعُ‌الدین نوری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ بیجاپور کا شاعر تھا - قائم نے مخزن نکات میں دو شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے جن کا تخلص " نوری " تھا : ایک ملا نوری دوسرا شجاعُ‌الدین نوری - پہلے کے حال میں لکھا ہے : " ملا نوری از قاضی زادہ ھاے قصبہ اعظم پور است در فن بدیع و معما سر آمد روزگار بود - شعر فارسی بسیار برتبہ گفت چنانچہ قصائد طویل‌الذیل ازوے یاد گار است.....فیضی اورا بسیار دوست می داشت - دوسہ غزل ریختہ بطور قدما ازوے مسموع است اما بالفعل سواے ایں یک بیت مقطع چیزے در خاطر نیست -

هر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد

بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے " [۳]

---

۱ - دکن میں اردو ' ص ۴۷ -

۲ - شعرالہند ج ۱ ' ۱۱۰ -

۳ - مخزن نکات ' ص ۳ -

دوسرے نوری کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ " سید شجاع‌الدین نوری متخلص، ہر چند از سادات بلدۂ گجرات است اما تمام عمر بعلاقۂ روزگار در حیدرآباد بسر بردہ - آخر حال بعہدۂ تعلیم پسر وزیر سلطان ابوالحسن پایۂ امتیاز یافت -

نوری اپس کے دل کی کسو سے نہ کہہ بتھا

حاصل بھلا اب اِس سے، دوانے ! جو تھا سو تھا " [۱]

میر حسن نے بھی اپنے تذکرے میں قائم کے الفاظ نقل کر دیے ہیں - [۲] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملا نوری اور سید شجاع‌الدین نوری دو مختلف اشخاص ہیں جن کا تخلص ایک ہے - ایک تو عہد اکبری میں تھا اور فیضی کا دوست تھا دوسرا عہد اکبری کے تقریباً نصف صدی بعد ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں تھا - پھر مولف " دکن میں اردو " جو اشعار نوری کے پیش کرتے ہیں وہ گیارہ صدی ہجری کے اوائل کے نہیں معلوم ہوتے ہیں - اُن کی زبان بہت صاف ہے اور گیارھویں صدی کے اواخر کی زبان سے ملتی جلتی ہے - اِس لیے اغلب ہے کہ یہ اِس دوسرے نوری کے اشعار ہوں اور غلطی سے ملا نوری سے منسوب کئے جاتے ہوں - [۳]

کوئی نظم اُس میں تو کرتا نہ تھا

ولے سب تعجب دیا ہم متا

نہ کچھہ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا

وہم مرثیہ سے بھل کر دیا !

---

۱ - مخزن نکات، ص ۲ -

۲ - تذکرۂ میر حسن، ص ۱۹۸ — ۱۹۹ -

۳ - اُردو شہ پارے ص ۴۱، ۱۱۹ : اُردوے قدیم، ص ۶۲ حاشیہ -

شروع میں کیا نظم کل واقعا
دہم تک احوال پورا اکہا
میں جب اُسکو لوگوں کے آگے پڑھا
عجب حال آشور خانہ میں تھا
جن و انس کرتے تھے سب واہ وا
کہ دکھن میں لکھا ہے کیا مرثیہ
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا
کبھی اس سے پہلے سنانے پڑھا
اماماں سے اس کا ملے گا صلا
کہ ہے نوری موجد تو اس طرز کا

یہ اشعار " دکن میں اردو " میں درج [1] ہیں اور نواب نصیر حسین خیال کے مضمون داستان اردو ' سے نقل کیے گئے ہیں - اِن اشعار سے یہ گمان ضرور ہوتا ہے کہ اِنہیں شعروں کا لکھنے والا دکھن میں مرثیے کا موجد ہے مگر کوئی تحقیقی اور فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی - ہاں اِتنا ضرور وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ دکن کی سلطنتیں بیجا پور اور گولکنڈہ ابتدا ہی سے شیعہ مذہب کی پیرو تھیں اِس لیے مرثیہ گوئی کا آغاز دکھن میں بہت قدیم زمانے میں ہو چکا ہوگا -

سب سے قدیم مرثیہ گو جس کا کلام دستیاب ہوتا ہے محمد قلی قطب شاہ ہے - [2] ڈاکٹر گریہم بیلی لکھتے ہیں کہ یہی پہلا مرثیہ گو تھا بعد میں اوروں نے اُس کی تقلید کی - [3] بہر حال موجودہ معلومات

---

۱ - دکن میں اُردو ' ص ۴۸ -
۲ - رسالۂ " اردو " بابت جنوری ۱۹۲۱ع ' ص ۱۷ -
۳ - اردو لٹریچر ' ص ۳۴ - ۳۵ -

یہیں تک ہے ممکن ہے کہ مرثیہ کی ابتدا اِس سے بھی پہلے ہوئی ہو - اِس کا نمونہ کلام یہ ہے -

دو جگ اماماں دکھہ تھے سب جیو کرتے زاری واے واے
تن روں کی لکڑیاں جالکر کرتي ہیں زاری واے واے
اسمـان جھج جـالا ہـوا سـورج اگن والا ہـوا
چلدر سو جل کالا ہوا ہے دکھہ اپاری واے واے
اک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھیلتے خنجر
کافـر کئے کیسے قہـریـو زخم کاری واے واے
قطبا کو ہے اللہ مدد دستا ہے اس دل میں خدا
تومنج مدد حیدر ولد بیریاں کو زاری واے واے

علی عادل شاہ کے عہد کا سب سے بڑا مرثیہ گو مرزا تھا اُس نے سوائے مرثیہ کے اور کچھہ نہ لکھا یہاں تک کہ بادشاہ نے اپنی مدح لکھنے کے لیے کہا تو اُس نے ایک مرثیہ لکھکر بادشاہ کے نام معنون کر دیا - [1] اس کی تصانیف کا اب تک پتا نہیں لگا - ایڈن برا کے مجموعۂ مراثی میں "مرزا" نامی ایک شاعر کے پندرہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں مگر اُن مرثیوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ۱۱۵۰ھ تک زندہ تھا اور علي عادل شاہ کا ہمعصر شاعر "مرزا" ۱۰۸۳ھ سے قبل مر چکا تھا - مصنف اردو شہ پارے کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ ان میں دونوں مرزا کے مراثی کے منتخبات ہوں - [2]

سید میران ہاشمی بیجاپور کا قدیم تریں مرثیہ گو بتلایا جاتا ہے لیکن اِس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں - اس کے مراثی نایاب ہیں -

---

۱ - دکن میں اردو ، ص ۴۹ -
۲ - اردو شہ پارے ، ص ۷۳ -

اس کے ریختی کے دیوان میں البتہ کچھ اشعار مرثیے کے ہیں مگر اعلیٰ معیار کے نہیں ہیں - اس کا انتقال سنہ ۱۱۰۹ء میں ہوا - [۱] اس کا ایک مرثیہ ایڈنبرا کی بیاض میں ملتا ہے جس کے کچھ بند "دکھنی مخطوطات" میں نقل ہوئے ہیں - [۲]

کاظم علی عہد قطب شاہ کا مرثیہ گو تھا - اس کا تذکرہ نواب نصیر حسین خیال نے اپنے مضمون "داستان اردو" میں کیا ہے - اور اس کا ایک شعر درج کیا ہے -

اے نابکاراں دین کا چھتر گرانا کہاں روا

سرور نبی کی آل کو یو دکھ میں بندانا کہاں روا

مولف "دکھنی مخطوطات" نے اس مرثیے کے اور اشعار بھی درج کیے ہیں [۳] - اس کے کلام میں مرثیت اور شعریت دونوں صفات پائی جاتی ہیں :—

(۱) جن کو سولاتے گود میں رکھتے تھے دوش اوپر

دریائے خون سر سے چلا اُن کے جوش کر

کیا صبر کر رہے ہیں دولب کوں خموش کر

اس ناز پروراں کی خبر لو علی ولی

(۲) گلزار احمدی پہ چلی صرصر خزان

کانٹوں پہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں

ہر سروراستی پہ کریں نوحہ قمریاں

بیدل صنوبراں کی خبر لو علی ولی

---

۱ - اردو شہ پارے ' ص ۷۲ -

۲ - یورپ میں دکھنی مخطوطات ' ص ۳۲۱ -

۳ - دکھنی مخطوطات ' ص ۱۸۵ - ۱۸۶ -

اِس زمانے میں دو اور مرثیہ گو گذرے ہیں رام راؤ اور سیوا - رام راؤ کے متعلق کچھ معلومات نہیں - سیوا نے دو کتابیں لکھی ہیں "روضۃالشہدا" اور "قانون اسلام" - اس کا انتقال غالباً سنہ ۱۰۹۲ھ میں ہوا - [1]

عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک مرثیہ گو لطیف گذرا ہے - مگر اس کے مراثي کوئی ادبی اہمیت نہیں رکھتے - البتہ ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں شاہ قلي خاں شاہی نے مرثیہ گوئی میں بہت شہرت حاصل کی - [2] ڈاکٹر زور نے اس کے کچھ مراثی کا مطالعہ جامعہ ایڈنبرا کے کتب خانہ میں کیا ہے ان کا بیان ہے کہ ایک مرثیہ واقعی لاجواب ہے - اس کا طرز بیان ایک حد تک انیس کے انداز بیان کے مماثل ہے اور زبان بھی اعلیٰ اور شاعرانہ ہے - [3]

یہاں تک تو گیارھویں صدی ہجری کے مرثیہ گویوں کا تذکرہ تھا - اب بارھویں صدي کے اوائل میں تین مرثیہ گویوں کا نام سب سے پہلے پیش ہوگا - ایک تو ذوقی دوسرے اشرف اور تیسرے احمد - سید شاہ حسین ذوقی کے مرثیے زیادہ تر غزل نما ہیں - زبان صاف ہے مگر فارسیت زیادہ غالب ہے - اور اثر کم پایا جاتا ہے -

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے تم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں
وہ جاہل دوزخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن
جوں برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں

---

۱ - اردوے قدیم ' ص اردو شہ پارے ص ۷۵ -
۲ - تذکرہ میر حسین ' ۱۲۳ -
۳ - اردو شہ پارے ' ص ۱۲۰ -

محرم کا پھر آیا ہے مہینا
کریگا تیغ غم سوں چاک سینا
در بحر امامت ہے شہ دیں
پیمبر کے انگوٹھی کا نگینا
نگاہ مہر سوں ذوقی کو دکھلاؤ
مدور روضہ بدر مدینا

اشرف کے مراثي اکثر غزل کی طرح میں ہیں - اس کے مرثیے اس کے ہمعصر احمد کے مراثی سے بہتر ہیں - ذیل میں اس کے ایک مرثیے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اس کے مراثی میں کتنی ادبیت ہے - ایک بیوی اور ماں کے جذبات کي ترجمانی کرنے میں کسقدر فطرت نگاری کی ہے حضرت شہر بانو حضرت علی اصغر کی جدائی پر بین کرتی ہیں -

جب مسکراتا وہ بچا میں شاد ہوتی دل ملے
بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہلساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو غمگین دیکھتی لیجا کے دیتی گود میں
سوتا کفن وہ اوڑھکر اب میں لیجاؤں کس کے تئیں
جاتے تھے جب شہ رن ملنے اصغر کو میں چھاتی لگا
دکھ میں بھلانی اس کھلا اب میں کھلاؤں کس کے تئیں

فارسی کی خوبصورت تراکیب ، چست بندش اور صفائی بیان میں اس کے بعض اشعار غالب کی یاد دلاتے ہیں سوائے دو ایک الفاظ کے ان اشعار کے سب الفاظ آج کل کے معلوم ہوتے ہیں -

اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
برنگ برق خرمن سوز دل ہے ہر سخن میرا

هوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا
ہوا ہے بسکہ زخمی خنجر داغ غم شہ سوں
برنگ لالہ ہے لبریز خوں دل کا چمن میرا

یتیم احمد کے منجملہ اور مراثی کے ایک مرثیہ بہت لاجواب ہے اس میں حضرت علی اصغر کی وفات کا واقعہ حضرت شہر بانو کی زبان سے کہلوایا گیا ہے - اس کے مراثی کی زبان اس کے ہمعصروں کے مراثی کے مقابلہ میں سادہ اور سلیس نہیں ہے - [1] نمونہ کلام یہ ہے - [2]

حیف گھائل حسین تن تیرا
جسم پر خون ہے پرھن تیرا
تو کہاں ہور کیدھر تن تیرا
کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا
نہیں ملتا بوند کس کتیں پانی
سخت طفلاں کی سر پو حیرانی
حیف اصغر نے تجکو روحانی
جگ سوں پیاسا گیا ہے تن تیرا

مرزا گولکنڈہ کے متعلق بہت اختلاف ہے کہ آیا وہ مرثیہ گوئی کرتا تھا یا نہیں - مولف اردو شہ پارے نے کافی تحقیقات کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ بھی مرزا بیجا پوری کیطرح ایک مرثیہ گو تھا - ہاشم علی اس کے معاصر نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۱۵۰ھ تک زندہ تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مرزا بیجا پوری نہیں ہو سکتا کیونکہ موجودہ معلومات کی بنا پر اس کی

---

۱ - اردو شہ پارے ' ص ۳۸۱ -
۲ - دکھنی مخطوطات ' ص ۱۴۲ ' ۱۴۳ -

تاریخ وفات سنہ ۱۰۸۳ھ سے قبل بتائی جاتی ہے - یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مرزا گولکنڈہ کے علاوہ کوئی تیسرا شاعر ہو - ایڈنبرا کی لائبریری میں جو مراثی مرزا کے نام سے پائے جاتے ہیں اُن کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس کے ہیں البتہ اُن کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصنف ایک اعلیٰ درجہ کا اور پختہ شاعر ہوگا - یہ مراثي زیادہ تر مشکل زمینوں میں ہیں اور اُن کي زبان بھی سلیس نہیں معلوم ہوتی نمونہ کلام یہ ہے - [1]

شہ کا ماتم سن دریا کے موج نت نعرا کرے

غرق ہیں اس غم میں سب لولو و مرجاں الودا

درد و غم شہ کا پتھر کے دل منے کیتا اثر

تب سوں لہو میں غرق ہے لعل بدخشاں الودا

حسن کا احوال عشق کے تئیں خدا نہ دکھلاے اندنوں میں

نین ڈوبے ہیں لہو میں رو رو زلف پڑی ہے شکن میں غم تھیں

خبر مصباں کی اشک ریزی کی جب بدخشاں سوں عرب میں

عقیق جتنے تھے سب لو ہو ہوکے بہہ چلے ہیں یمن میں غم تھیں

مرزا کے ہمعصروں میں قادر بھی تھا جس کا تذکرہ ہاشم علی نے اپنے اشعار میں کیا ہے - اِس کے مراثی سے اُس کی علمی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے اُس کے سترہ مراثی جو دستیاب ہیں تسلسل ' تازگي ' ادبیت اور اِنسانی جذبات کی ترجماني سے مالا مال ہیں "باوجود حقیقی اور فنی مرثیے ہونے کے اس کے کلام میں شاعرانہ خصوصیات کا نقداں نہیں ہے" - [2]

---

۱ - اردو شہ پارے ' ص ۱۲۱ ' ۱۵۸ -

۲ - اردو شہ پارے ' ص ۱۷۱ -

چھوپا ہے دین کا چندر کہ جس کے سوگ سوں جگ پر
فلک ہر ملک میں تانے شمیانا رات کالی کا
نہیں لو اشک شبنم سوں کھولے ہیں آہ کے گل ہو
دیکھو غم کے چمن میانے لطافت غم کے مالی کا

تیسرا شاعر جس کا تذکرہ ہاشم نے اپنے ''دیوان حسینی'' میں کیا ہے روحی ہے یہ بھی مرزا اور قادر کا ہمعصر تھا اس کے زیادہ مرثیے نہیں ملتے مگر جو کچھ ہیں خوب ہیں - روحی کے مراثی میں جتنی شعریت اور تغزل ہے کسی اور دکھنی مرثیہ گو میں نہیں پائی جاتی -

آج غمناک ہیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غمزدہ سیلہ داغ حیران ہیں
نرگس و لالہ یا سمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے
لہو میں ڈوبے ہیں سب لگن کے گل
جب سلی شہ کی بات مجلس میں
جل بجھے شمع انجمن کے گل
نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا
سر پہ رکھنے کو تجھ چرن کے گل
خوش لگے تجھ طبع سے اے روحی
دل کے باغاں منے سخن کے گل

ہاشم نے ایک اور شاعر رضی کا تذکرہ کیا ہے جو اچھے مرثیہ گویوں میں تھا اور اس کا معاصر تھا اور غالباً گجرات کا رہنے والا تھا - اُس کے کل نو مرثیے دستیاب ہوتے ہیں - نمونہ کلام یہ ہے -

ماتم شہ سوں پڑي خرمن پہ دل کے بیجلی
تب ستی حاصل ہوئی افسوس ہم کو بیکلی
نہن جوں بادل کے ہور آہ جیسے بانسری
غم کے جنگل میں بجاتا ہوں سدا بے اختیار

ولی ویلوری نے بھی اس زمانے میں ایک نظم بنام روضۃالشہدا لکھی ہے - جس کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ یہ ولی اورنگ آبادي کي تصنیف نہیں ہے - یہ سنہ ۱۱۳۰ھ میں لکھی گئی ہے - اس کے متعلق بلوم ہارٹ نے یوں لکھا ہے - '' روضۃالشہدا دس مجالس میں منقسم ہے - مجلس اول میں آنحضرت کی وفات کا بیان ہے ' دوسری میں حضرت فاطمہ زہرا کی وفات ' تیسری میں شہادت حضرت علی ' چوتھی مجلس میں شہادت امام حسن ' پانچویں میں ذکر امام حسین و شہادت مسلم بن عقیل وغیرہ ' چھٹی مجلس میں فرزندان مسلم کی شہادت ' ساتویں مجلس میں حضرت حسین کی روانگی مکہ سے کربلا کو اور شہادت حر ' آٹھویں مجلس میں شہادت احباب اور اقربا حسین علیہ‌السلام ' نویں مجلس میں شہادت امام حسین و صاحب زادگان امام کا ذکر ہے ' دسویں مجلس میں شہادت کے مابعد واقعات کا بیان ہوا ہے ''[1] اسٹوارٹ نے اپنے کیٹلاگ میں اس کی متعلق یوں صراحت کی ہے - '' روضۃالشہدا یعنی شہیدوں کا باغ ایک دکھنی نظم ہے جو امام حسین کی شہادت کے مرثیوں اور کربلا کے حالات پر لکھی گئی ہے ایک اور مصنف '' سیوا '' نے بھی اُن کو لکھا ہے یہ عشرہ محرم میں امام باڑوں میں پڑھے جاتے ہیں '' - ان بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم مرثیہ ہے - مگر مولف اردو شہ پارے لکھتے ہیں کہ '' اس کے عنوانات دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب

---

۱ - یورپ میں دکھنی مخطوطات ' ص ۳۵۳ -

خاندان رسول کی جنگوں اور شہادتوں کی ایک تاریخ ہے"[۱] لیکن اگر مرثیہ کا اطلاق صرف بیلمہ مراثی پر کیا جائیگا تو انیس و دبیر کے بھی کلام کا معتدبہ حصہ مرثیہ کے حدود سے خارج ہو جائیگا - واقعات کربلا کا تذکرہ - حضرت امام حسین اور اُن کے اعزا و رفقا کی شہادت کا بیان نظم میں اور وہ بھی اس انداز سے کہ مجالس میں پڑھے جانے کے قابل ہوں ایک نظم کے مرثیہ ہونے کی کافی دلیل ہے - فارسی میں مقبل نے بھی اس قسم کے مراثی لکھے ہیں اور مولانا شبلی نے یہ لکھتے ہوے کہ اُن کو تاریخ کہنا زیادہ موزوں ہے اُن کا شمار مرثیہ ہی میں کیا ہے -[۲] بہر حال اگر یہ مرثیہ نہیں تو مرثیے کے قبیل سے ضرور ہے - تمام نظم گو یکسر مذہبیت میں ڈوبی ہوئی ہے مگر شاعرانہ نکات اور ادبی خصوصیات سے معرا نہیں ہے -

اُس کے بعد ہاشم علی برہان پوری کا نمبر آتا ہے - یہ اپنے زمانے کا بہت مشہور مرثیہ گو تھا اس نے سواے مرثیہ گوئی کے کسی دوسری صنف سخن میں قلم نہیں اُٹھایا جیسا کہ وہ خود کہتا ہے -

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خواں ہے شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اس نے لکھا نہیں

بجز مدح نیں شعر ہاشم علی
کہو راستی کے سخن پر سلام

وہ بہت راسخ الاعتقاد اور خوش عقیدہ تھا اس کا خیال تھا کہ اُس کی شاعری کی خوبیاں اس کے مداح اہل بیت ہونے کیوجہ سے ہیں اور اس وجہ سے وہ ہر قسم کی نکتہ چینی سے بالکل بے نیاز تھا - اس خلوص و اعتقاد کی وجہ سے اس کے مرثیوں پر از دل خیزد کا اطلاق ہو سکتا ہے

---

۱ - اردو شہ پارے ، ص ۱۴۶ -]
۲ - موازنۂ انیس و دبیر ، ص ۱۰ -

وہ ہر سال باضابطہ طور پر مرثیہ کہا کرتا تھا - اس سے گماں ہوتا ہے کہ غالباً وہ ایک پیشہ‌ور مرثیہ گو تھا -

تجھکوں ہاشم علی حسین سرور ہر برس مرثیہ لکھاتے ہیں

اس کے مجموعہ مراثی بنام ''دیوان حسینی'' میں ۲۳۸ مرثیے ہیں ذیل میں اُس کے کلام کا کچھہ اقتباس درج کیا جاتا ہے - حضرت شہر بانو حضرت اصغر کے فراق میں بین کرتی ہیں -

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رہی سونا یہ پالنا جھلاتی رہی
ہاے کیوں روٹھ کر گیا مجھ سوں میرے پیارے کے تیں مناتی رہی
قاسم آیا ہے جب بیاہنے کو میں تماشا تجھے دکھاتی رہی
دودھ پیتا مرا گیا بالے غم سوں چھاتی مری بھراتی رہی

اوٹھ گلے کا لوہو دلاؤں میں نیند آتی تجھے سلاؤں میں
چل ترا پالنا جھلاوں میں حیف یو بالپن ترا اصغر
کس کا اب پالنا جھلاؤنگی لوری دیکے کسے سلاؤنگی
کسکو چھاتی سے میں لگاؤنگی حیف لو بالپن ترا اصغر

حضرت کبریٰ بوقت رخصت حضرت قاسم سے کہتی ہیں -

اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کیوں رہوں
تجھ باج میں جہاں میں پھر اُمید کیا کروں
جد کے مدینہ کیونکہ میں اس تھار سے پھروں
تم اپنے سانھہ لیکے دکھاؤ وطن مرا
جاتے ہو چھوڑ رن کیطرف مجھ کو تم رلا
نہیں شرم کا ہلوز یہ سر سوں گھونگھٹ کھلا

کرتے نہیں محبت و جاتے میا بھولا
اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا

اسی عہد کے اور مرثیہ گو رضا ، شرف ، غلامی ، سیدن اور امامی ہیں اُن کے کلام کا اقتباس طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے -

دکن کے مراثی پر ایک اجمالی تبصرہ :—

جس طرح انسان نے زندگی کے ہر شعبے میں تدریجی ترقی کی ہے اسی طرح مختلف اصناف ادب میں بھی اُس کا ارتقا درجہ بدرجہ ہوا ہے - پھر جیوں جیوں وہ آگے بڑھتا ہے بلندیاں پست ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ بالائے بام پہونچ جاتا ہے - اب اُسے چاروں طرف نشیب ہی نشیب نظر آتا ہے - وہ ہر سمت حقارت آمیز نگاہ ڈالتا ہے اور یہ کبھی نہیں سوچتا کہ لب بام تک اُس کی رسائی انہیں زینوں سے ہوئی تھی جواب وہاں سے پستی کی جانب مائل نظر آتے ہیں - انیس و دبیر کا کلام مرثیہ گوئی کا معراج کمال تصور کیا گیا ہے اِس لئے ظاہر ہے کہ اُن کا کلام پڑھ لینے کے بعد قدیم مرثیہ گویوں کے کلام سے متاثر ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بالائے سقف کھڑے ہوکر زینوں کی نسبتی بلندی معلوم کر لینا - مگر پھر بھی سقف کی اونچائی حقیقتاً انہیں زینوں کی مجموعی بلندی ہے اس لئے اگر قدیم مرثیہ گویوں کے کلام میں ہم انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کے جملہ عناصر کا اُن کی ابتدائی حالت ارتقا میں مشاہدہ کریں تو ہم کو تعجب نہیں ہونا چاہیے -

دکن میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کسی ادبی غرض و غایت کی بنا پر نہیں ہوئی - اس کا مقصد یکسر مذہبی تھا مجالس عزا میں رونا رولانا اور ثواب اخروی کرنا حاصل مرثیہ گویوں کا نصب العین تھا اِس لئے شروع میں محض بیلنہ مراثی پر اکتفا کیا گیا اور کلام میں صرف مرثیت

پیدا کرنے کی کوشش کی گئی مگر ایک ہی موضوع پر بار بار لکھنے کے لئے بیان میں تنوع چاہیے ورنہ کلام بے کیف اور بے اثر ہو جائیگا - اس لئے رفتہ رفتہ شعریت کا بھی لحاظ کیا جانے لگا اور ادبی نکات خود بخود پیدا ہونے لگے - مگر شائد عام طور پر مرثیہ گویوں نے اُس کی تقلید نہیں کی اور پرانی روش کو قائم رکھا - اِسی وجہ سے ترقی کی رفتار بہت سست تھی مگر اس میں شک نہیں کہ دکن کے مراثی میں بعض ایسے ضرور ہیں جو اپنی شعریت کیوجہ سے دوسروں سے ممتاز ہیں اور سودا کے مراثی کے مماثل ہیں - ایک دفعہ عزلت نے اپنے مرثیے کے آخر میں اشارہ کیا تھا کہ

خام مضمون مرثیہ لکھنے سوں چپ رہنا بھلا

پختہ درد آمیز عزلت نت تو احوالات بول

مگر اس کے ایک بڑے ہمعصر رضا نے مرثیے کے اصطلاحی معنوں اور مقصد کو دلیل بنا کر اس طرح اُس کا جواب پڑھا - [۱]

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیہ میں یوں کہا

خام مضموں مرثیہ لکھنے سوں چپ رہنا بھلا

لیکن اس مظلوم بے سر کا بیاں کرنا روا

تاکہ سن کر یو بیاں ہوویں محبان اشکبار

روایات نظم کرنے کی مثالیں "دوازدہ مجلس" اور "روضۃالشہدا" میں ملیں گی - مضمون بندی بھی بالکل ابتدائی حالت میں پائی جاتی ہے - بعد میں انہیں چیزوں کو میر ضمیر نے زیادہ مستقل اور منظم طریقے سے رواج دیا - حضرت قاسم کی شادی اور حضرت علی اصغر کی شہادت کا واقعہ قریب قریب ہر مرثیہ گو نے نظم کیا ہے اور طرح طرح کی جدتوں سے سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے -

---

۱ - اردو شہ پارے ، ص ۱۵۳ -

شرف :—

سیج جھولے کی میں بناتی تھی

بالے اصغر کوں تب جھلاتی تھی

جب دولارا وہ نیند بھر سوتا

دودھ پینے کو میں جگاتی تھی

پانی بن خشک ھوگیا ھے شہر

دیکھ اصغر کوں تلملاتی تھی

پھوپھیاں صدقے اسکے جاتی تھیں

چاؤ سے جب اسے اوچاتی تھی

تیر گذرا گلے سوں اصغر کے

ھاے کس دکھ سے جان جاتی تھی

آج کیا کہہ پکاروں کہہ مجھ کوں

تب میں اصغر کی ماں کہاتی تھی

اشرف :—

جب مسکراتا وہ بچا میں شاد ہوتی دل منے

بے جان پڑا ھے گود میں اب میں ھنساؤں کس کے تئیں

جب شہ کو غمگین دیکھتی لیجا کے دیتی گود میں

سوتا کفن وہ اوڑھکر اب میں لیجاؤں کس کے تئیں

جاتے تھے جب شہ رن منے اصغر کو میں چھاتی لگا

دکھ میں بھلاتی اس کھلا اب میں کھلاؤں کس کے تئیں

کس قدر سادگی سے ایک ماں کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ھے -
فطرت نگاری نے کلام کو پردرد اور اقتضاے حال کے بموجب بنا دیا ھے -

۵

مضمون بندی کی ایک مثال اور ملاحظہ ہو اور دیکھئے کہ کلام کو پر اثر بنانے کے لئے کیا جدت کی گئی ہے -

غلامی :—

بانو پہ کربلا میں کیسا یہ دکھ پڑا ہے
گودوں میں پیارا اصغر بن دودھ مر چلا ہے
ہو رانڈ بیٹھی بیٹی داماد مر چکا ہے
سر کا چتر بھی ڈھلنا کوی دم کو آ رہا ہے

سمجھانا اس بچی کا اسوقت کیا مصیبت
بابا بنا تڑپنا اور تشنگی کی شدت
" اے بیٹی تیرے بابا کھانے گئے ضیافت
معصوم کا یہ سن کر دہ چند جی جلا ہے

کہنے لگی کہ " اماں ہے ہے یہ کیا غضب ہے
مرتی ہوں بھوک سیتیں پیاسوں سیں جاں بلب ہے
ضیافت میں گئے ہیں بابا مجھ بن سو کیا سبب ہے
بابا نے مجھ پہ شائد شفقت کو کم کیا ہے

مجھ سیں کبھو نہ کرتے بابا موی جدائی
اصغر کوں لے گئے ہیں مجھ سیں میا اوتھائی
ہاور نہوے جو تم کو بتلاؤ کہاں ہے بھائی
اصغر کا پالنا بھی خالی دیکھو پڑا ہے "

دو رو حرم میا سیں اوس طفل کوں منا تے
هر یک لے بر میں اس کو چھاتی ستھوں لگاتے
کہتے تھے تیرے بابا اب کوی گھڑی میں آتے
واللہ ساتھ شہ کے اصغر نہوں گیا ھے

———— ————

سمجھا کتے وہ سارے پن کرتے نہوں وہ باور
کہتے جو لے گئے ھیں دستا نہیں کوں اصغر
لاچار ہو کہے تب اهل حرم نے یک سر
اصغر کی لاش لاکر اوس کو دکھا دیا ھے

———— ————

بھائی کو دیکھ روتے دوڑے ھیں بھر میں لینے
ھر روز کی طرح سے لاگے ھوں بوسہ دینے
کہتے کیوں آج بھائی نیں اُٹھتا دودھ پینے
کیوں اس کے پیرھن کو تازہ لہو لگا ھے

بعد میں متاخرین نے اور زیادہ لطیف پیرایہ میں ان جذبات کی مصوری کی ھے مگر اس جذبہ نگاری کی ابتدا حقیقتاً دکھنی مراثی سے ھوئی ھے -

واقعہ کربلا کے افراد' اُن کا طرز گفتگو اور عرب کے جملہ رسم و رواج کو ھندوستانی رنگ میں پیش کرنے کا شرف اولیت بھی دکھنی مرثیہ گریوں ھی کو حاصل ھے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں ان کا مطمح نظر یکسر مذھبی تھا اور مرثیہ کا تنہا مقصد رونا رولانا تھا - اس لئے اُنھوں نے اپنے مراثي کو موثر بنانے کے لئے فطرتاً ھندوستانی رنگ میں رنگ دیا -

ھاشم علی :—

بالے اصغر کے تئیں بلاتی رھی　　سونا یہ پالنا جھلاتی رھی
تھا برس گانٹھ کا تجھے ارماں　　لال جاما ترا سلاتی رھی
قاسم آیا ھے جب بھیانے کو　　میں تماشا تجھے دکھاتی رھی

شاہ محمد :—

داماد قاسم نیک جواں　　شہید ھوے کربل [1] میاں
اس کی شادی کا احوال　　لہو میں احمر کسوت لال
بیوہ بہتی میری ھے　　رو رو کر منہ دھوتی ھے
پھوڑ کر چوڑیاں ننگی ھاتھ　　ملتی بیٹی دونوں ھاتھ
مہندي جو دیکھو ھات　　لہو میں بھر کر درنوں ھات
ایسی شادی نیں دیکھی　　جیسی دیکھی بیٹی کی
جلوے کے دن ھو جدا　　دولا اس کا کر دوا
رن پر جاتے بارا بات　　اس کے خاوند کا سر کاٹ

دوا دہ مجلس [2] :—

افسوس آج بیاہ کے دن مر گیا وہ شاہ
ھے ھے بنا بنی پہ نیا داغ دھر گیا
پر ھر تھا سہرا ھاتھہ میں کنگنا بندھا ھوا
اس طرح اپنے بابا کنی دیکھے سر گیا

---

۱ - سودا نے اکثر بجائے کربلا کے کربل استعمال کیا ھے معلوم یہ ھوا کہ دکھن میں یہ لفظ مستعمل تھا -

سری—ندا الست پر یکم قالو بلا کھے سو　　وھی بلا کربل میں آیا بالاشہ اکرم کا
فضل— شاہ کربل فضل پر دیکھو مدوھر آن ھیں
قصاب—یا نبی شہ کرن جا کربل سوں لانے تم چلو
فاطمہ مادر نوں مرں اس کا دیکھانے تم چلو

۲ - دکھنی مخطوطات ، ص ۵۸۳ -

هاشم علی :—

جلوہ سیں اُٹھہ کے رن کو چلا تب کہی دلہن
دامن پکڑ کے لاج سوں انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن
تم بن رہے گا ہاے یہ سونا بھون مرا

کیسی یوکد خدائی وکیسی ہے یو برات
آتا فراق تم سوں یہ جلوہ کی آج رات
گھر کو نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات
دیکھا نہیں جمال کو بھر کے نین مرا

اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کیوں رہوں
تجھ باج میں جہاں میں پھر امید کیا دھروں
جد کے مدینے کیونکہ میں اس تہار سے پھروں
تم اپنے ساتھ لیکے دکھا دو وطن مرا

جاتے ہو چھوڑ رن کیطرف مجھکو تم رولا
نہیں شرم کا ہنوز یہ سر سوں کھونگھٹہ کھلا
کرتے نہیں محبت و جاتے میا بھلا
اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا

اصغر :—

جب چڑھے لڑنے کو قاسم تب کہے رو رو دلہن
اے نجومی سانچہ کہہ کسوقت بر لاگی لگن

تھے کھڑے کیسی یو مجھ کوں چھوڑ گئے ابن حسن
تخت چڑھتے بخت اولٹے یہ ہوا کیسا سگن

ندیم :—

حضرت علی اصغر کی شہادت پر حضرت شہر بانو نوحہ گر ہیں -

تجھ بن جوگن کا کر بھیس ' راکھ لگا موں کھولے کیس
تجھ کو ڈھونڈھوں دیس بدیس ' سونا تیرا پالنا
دکھ کي کنتھا پہنوں تن ' غم کی دھونی جالوں من
تجھ بن مجھ کو گھر ہے بن ' سونا تیرا پالنا

متاخرین مرثیہ گویوں نے اس موقع کو جب شہدائے کربلا رن کی رخصت لیتے ہیں بہت پر اثر اور ڈرامائی انداز میں نظم کیا ہے - اس کی ابتدا کا سہرا بھی دکھن ھی کے مرثیہ گویوں کے سر ہے - ذیل میں ایک مثال درج کی جاتي ہے مگر اسے اسي نقطہ نظر سے دیکھنا چاھیے کہ یہ محض ایک ابتدا تھی -

غلامی :—

دوھرا غم آکے گھیرے گا شاہ زمن کو آج
جلوہ میں کیوں بٹھاتے ھیں ابن حسن کو آج
کھونگھٹ میں سوگ آن پڑے گا دلھن کو آج
قاسم خدا کے واسطے مت جا تو رن کو آج

غلطاں بخوں ہوئے ھیں سب احباب و اقربا
باندھے کمر زبہر شہادت وہ مقتدا

قاسم نے اذن حرب طلب کرکے یوں کہا
عمو نہ جاؤ بن کو رضا دو ہمن کو آج

رحلت کے دن پدر یو وصیت کیا مجھے
تجھ پر نثار ہونے نصیحت کیا مجھے
تاکید کرکے کام کی رخصت کیا مجھے
یہ سن انھوں سے شہ نے کیے پر نین کو آج

بولے اگر تجھے یو وصیت کیا پدر
حق میں ترے مجھے بھی جو کے وہ نامور
لاوں بجا میں حکم برادر توں کر صبر
یو بات کر طلب کیے سرور سبن کو آج

خیمہ میں اپنے لایا دلہن کو وہ نوجواں
ھل من مبارز اھل ستم بولے ناگہاں
دست عروس چھوڑ کے قاسم ہوئے رواں
بولے خدا کو سونپ چلا ہوں تمن کو آج

دامن پکڑ عروس لگے رونے غم ستیں
کہتے میا ابھی سیں اوٹھاتے ھو ھم ستیں
بولے کہ شوخی کرتے ھیں اعدا تم ستیں
جاکر ھٹاؤں فرقہ دوزخ وطن کو آج

کہنے لگے کہ ہوتے ہو یا ابن عم جدا
بیکس اکیلی چھوڑ مجھے دو کہ میں مبتلا
تم کو کریں شہید مبادا یہ اشقیا
بیوا ہو ترستی رہوں پھر میں ملن کو آج

اوپر لکھے ہوئے تیسرے اور چوتھے بند میں سیرت نگاری کی خفیف سی جھلک پائی جاتی ہے جو بالکل یا غیر محسوس یا غیر ارادی طور پر کی گئی ہے - اِس کے علاوہ مکالمہ میں ڈرامائی انداز بھی پایا جاتا ہے جسے بعد میں متاخرین نے بہت ترقی دی - مضمون بندی اور جذبہ نگاری کی تحت میں جو غلامی کا مرثیہ درج کیا گیا ہے اس میں مکالمہ ہے - ایک بچے کی ضد اور اس کے بہلائے جانے کو بہت فطری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے امامی کے متعلق بھی ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ " اکثر گفتگو کے طور پر لکھتا اور اپنے مراثی میں ڈرامائی اثر پیدا کرتا[۱] ہے " -

مراثی میں براعت استہلال کا استعمال بھی غالباً دکھنی مرثیہ گویوں نے شروع کیا سودا کا ایک مربع مرثیہ ہے جس کا مطلع یہ ہے -

فلک نے کربلا میں ابر جسدم ظلم کا چھایا
کمان جور کو قوس قزح کیطرح چڑھوایا
سوا پیکاں کے اک قطرہ نہ اس ظالم نے برسایا
کہوں کیا تیر باراں سے نبی کے گھر کو ڈبوایا

اس میں براعت استہلال کے علاوہ برسات کا تلازمہ شروع سے آخر تک ملحوظ رکھا گیا ہے - بالکل اسی قسم کا ایک مربع مرثیہ ہاشم علی

---

۱ - اردو شہ پارے ، ص ۱۶۷ -

کے یہاں پایا جاتا ھے - جس کے تین بند " اردو شہ پارے " میں درج ھیں [۱] -

پھر گھٹا ھوئی غم کے بادل کی گگن پر آشکار
کربلا میں میگھ برسے لہو کے دھاراں بے شمار
تیغ چمکی سر اوپر بجلی کے مانن بار بار
کیا سماں ھے ھے پڑا سارا جہاں میانے اندھار

یہ جھڑی دس دن لگے گی ماہ غم عاشور ھے
کربلا کے موج غم سوں دل کی ندیاں پور ھے
نعرہ ھا کڑکیں گرج کر آج نغمے صور ھے
چو طرف گھنگھور ھے لہو کی برستی ھے پھوھار

نہیں نکلتا ھے سورج سوے نہیں سکھ کے بھوں
خون دل سے جہاں تلک دیکھو ٹپکتی ھے نین
تر ھوے ھیں اشکباری سوں لرزتے ھیں نین
آہ کا ھر دم ھوا ھے گا دلوں سیتی پوکار

سودا نے اکثر حضرت قاسم کی شہادت کا مرثیہ شادی کی رسوم کے تلازمے کیساتھہ لکھا ھے - ایک مرثیہ یوں شروع ھوتا ھے -

یارو ستم نو یہ سنو چرخ کہن کا
ٹھانا ھے عجب طرح سے بیاہ ابن حسن کا

---

۱ - اردو شہ پارے ، ص ۲۹۶ -

سنجوگ یہ کچھ باندھا ھے دولہا سے دلہن کا
جو تار کفن کا ھے سو ڈورا ھے لگن کا

مگر اس انداز بیان کا پیش خیمہ سیدن کا یہ مرثیہ کہا جا سکتا ھے جس میں حضرت امام حسین کی شہادت کو اسی تلازمے کیساتھ پیش کیا گیا ھے اور شہادت کو عروس قرار دیا گیا ھے -

ماہ محرم میں دیکھو چندا ھو مالی ائیا
تارے لگن کے گوند کر سہرا جو شہ کوں لائیا
گلگنا ستم کا باندھکر روکہ کا اُبٹنا کوں لگا
حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سے تن نہلایا
اپنے یو جیو کو وار کر دیوے دھگانا سیس کا
ھر یک نے شہ کے سنگ سوں خلعت سہانی پائیا
قاضی قضا کا عقد بانکر ختم شر طاں شرعیاں
تھالاں کے خواناں کر انگیں ، شمشیر چوبھا کھائیا
تھا بردشت کربلا ظلمات بحر خوں کا
ھیں پیاس میں طفلاں سکل پانی ستیں ترسائیا
آکر مشاتا موت کی ، دولھن شہادت کی بنا
تقدیر کے سو تخت اوپر ، بٹھلا کے جلوا لائیا
سیدن سقا شہ کا سدا ، میدان تر کرنے بدل
نینوں کی مشکاں اشک سوں ، بھربھر کے نت چھڑکائیا

رزمیہ کی ابتدا بھی دکن ھی میں شروع ھوئی - یہاں پرولی کی روضۃالشہدا کے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ھیں [1] -

---

۱ - دکھنی مخطوطات ، ص ۳۵۹ -

بزاں طارق کا بیٹا یک عمر تھا
چد یکے فن میں خرسا بیخبر تھا
اونے اکبر کا اتیں وار کھایا
جہنم میں پدر کو جا ملایا
دوجا تھا طلحہ کر طارق کا فرزند
اُتھا ملعون ھاتھے سا تلو مند
جل اپنے باپ ھور بھائی کے غم سوں
ترت شہزادے پر دھایا منم کوں
سو اکبر کا گریباں هاتھ سوں دھر
منکیا تھا کھینچ کر سینے زمیں پر
تلک اکبر نے جلالی کر ھرنات
شبے ملعون کے کردن اوپر ھات
پکڑ قوت ستے ایسا مروڑی
جو گردن کی رگاں ھو رھاتر توڑی

سو حلقہ کرکے سب کفار جو پیر
کھڑی شیر خدا کی شیر کوں گھیر
دندی سب جوڑ کر بھالے سوں بھالا
رگی چوگرو جیوں سورج کوں ھالا
چھڑیا شیکوں خدا وصل کا کیف
جلالت سوں بجانے تب چلے سیف
کہیں پھر پھر بجاتے وقت تروار
انا ابن رسول اللہ ھر بار

کہ شاید اس صدا سوں قوم جاہل
کریں معلوم اپنا کورے دل
اونعرا کھلبلا عرش بریں کو
ہلاتا تھا سب ارکان زمیں کو

سو حملہ کر تلنگ چودہ سوں کفار
لگے کرنے بدن پر شاہ کے وار
لگی تب شہکوں زخماں تن پوساری
اوچھلنے کو لگی لہو کے فواری

سودا کے مراثی کی مختلف شکلوں سے یہ صحیح طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مختلف مواقع کے لئے مرثئے کہے ہیں مگر اس رسم کی بھی ابتدا دکن ہی سے ہوئی - چنانچہ ہاشم علی کے متعلق ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اس نے " صرف منبر پر بیٹھ کر پڑھنے ہی کے لئے مرثیے نہیں لکھے بلکہ اُسے ماہ محرم کے عام رسم و رواج کا بھی لحاظ رکھنا پڑا - زیارت اور چالیسویں کے نیز الوداعی مرثیوں کے علاوہ (جو علموں اور تعزیوں کو ٹھنڈا کر کے واپس آتے وقت پڑھے جاتے ہیں) تابوت لے جاتے وقت راستہ سے پڑھتے ہوے جانے کیلئے بھی اس نے علیحدہ مرثئے لکھے - چنانچہ مرثیہ نمبر ۱۵۵ اور ۱۶۹ میں پچاس پچاس شعر لکھنے کے بعد یہ اشارہ کرتا ہے -

' ازیں جاروبروے تابوت ایستادہ شدہ بخوانندہ و آہستہ روانہ شوند '

زیارت اور چالیسویں کے مرثیوں کی ابتدا میں حسب ذیل نوٹ لکھے ہیں -

۱ — " دربیان روز سیوم کہ دراصطلاح روز پھول و روز زیارت گویند وایں مرثیہ مخصوص ان روز است " -

۲ — " مرثیہ چہلم کہ باصطلاح اہل ہند چالیسواں گویند و مناسب است کہ دراں روز یا شب خواندہ شود " - ۱

اسکے علاوہ غلامی کا حسب ذیل مرثیہ یا نوحہ غالباً ماتم کیلئے لکھا گیا ہے - موجودہ زمانے میں ماتم کے لئے یہی شکل اور یہی یہی بحر زیادہ پسند کیجاتی ہے - حضرت شہر بانو یوں کرتی ہیں -

ظلم کیا ہے کٹھن ہے ہے فلک کیا کیا
شہ سوں چھڑایا وطن ہے ہے فلک کیا کیا
اب میں جھلاوں کسے چھاتی لگاتی لگاوں کسے
دود پلاوں کسے ہے ہے فلک کیا کیا
نکلی میں جب از وطن کیسی ہوئی تھی سکن
گم ہوے سارے رتن ہے ہے فلک کیا کیا
لوہو میں اکبر مرا زخمی بدن ہے پڑا
تن ہوا سر سوں جدا ہے ہے فلک کیا کیا
حال مرا زار ہے جیونا دشوار ہے
عابدیں بیمار ہے ہے فلک کیا کیا
میری سکینہ نڈھال پیاس سوں ہے خستہ حال
کیا کروں اے ذوالجلال ہے ہے فلک کیا کیا
آئی تو آئی کہاں بیٹھی بیاھی کہاں
مہرا جوائی کہاں ہے ہے فلک کیا کیا

---

۱ اردو شہ پارے ، ص ۱۶۳ -

شہ مہرا مارا پڑا کوئی نہیں والی مرا
بیوہ ہوئی اے خدا ہے ہے فلک کیا کیا

ایک اسی قسم کا نوحہ ندیم کا بھی ہے جس میں حضرت علی اصغر کا ماتم ہے - ایک نوحہ اسی قسم کا ذوقی کے یہاں بھی ملتا ہے -

ملکر سب افواج شام آہ دریغا دریغ
شہ پہ کیا اجدھام آہ دریغا دریغ
شہ کے الم میں مدام رکھ توں زاری سوں کام
بول توں ذوقی مدام آہ دریغا دریغ

جس طرح قصیدے کے اخیر میں ممدوح کے لئے دعائیہ لکھنے کی رسم ہے اسی طرح مرثیہ کے اختتام پر اپنے لئے دعا کرتے ہیں اور دین و دنیا میں اپنی فلاح اور بہتری کے طلبگار ہوتے ہیں یہ رسم بھی دکنی مرثیہ گویوں کے یہاں عام طور پر خصوصاً مربع مرثیوں میں پائی جاتی ہے - چنانچہ نظر اپنے ایک مرثئے کو یوں ختم کرتا ہے -

کہنے لگا ہے جب سوں الم کے نظم میں بیت
دنیا کوں دل سوں سب کے تو بول اس الم میں بیت
دو جگ منے نظر کو بجز حب اہل بیت
مقصد نہیں ، مراد نہیں ، مدعا نہیں ،

اس سے بڑھ کر مقصد اور مراد اور کیا ہوسکتی ہے -

اخیر میں دکن کے مراثی کی شکلوں کے متعلق بھی لکھنا ضروری ہے - دکن کے مرثیے عموماً مربع بندوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں - جس میں پہلے بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اور بقیہ بندوں کے چوتھے مصرعے اسی ردیف اور قافیے میں ہوتے

ہیں جو ابتدائی بند کا ہوتا ہے کچھ مرثیے مخمس کی شکل میں بھی پائے جاتے ہیں سلام و درود و فاتحہ وغیرہ غزل کی شکل میں لکھے گئے ہیں اکثر مرثیے غزل کی شکل میں بھی پائے جاتے ہیں ان کو پڑھکر اور ان کے انداز بیان کو دیکھکر متاخرین کے سلام یاد آجاتے ہیں ۔

مسدس کا پتہ البتہ دکھنی مراثی میں نہں چلتا - اس کے متعلق بعد میں عجیب اختلافات پیدا ہو گئے - کسی نے اس کا موجد میر انیس کو ٹھہرایا [۱] کسی نے اس کی ابتدا میر ضمیر کے عہد سے بتائی [۲] بالآخر سکندر و سودا اسکے حقدار قرار پائے اور سوال یہ پیدا ہوا کہ شرف اولیت کس کو دیا جائے کیونکہ دونوں معاصر تھے اور ایک کا تقدم دوسرے پر ثابت نہیں مولف " حیات دبیر " لکھتے ہیں کہ سودا کا مسدس " کتاب میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے - فقیر تک گلیوں میں پڑھتے ہیں [۳] - سودا سکندر کے معاصر ضرور تھے مگر عام شاعر تھے اور سکندر خاص مرثیہ گو مشہور ہیں ۳ " اس بناپر صاحب " یاد گار انیس " نے فضل تقدم سکندر کو دیا ہے [۴] مگر مولف " حیات دبیر " پھر لکھتے ہیں کہ " کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے کہ دو معاصروں میں سے اول کس نے کہا تو سکندر و سودا دونوں کو موجد ماننا چاھئے ,, صاحب شعرالہند لکھتے ہیں کہ " قدما کے تمام مرثیے جن سے مرثیہ گویوں کے تمام انداز معلوم ہوتے ہیں سامنے موجود نہیں اس لئے ہم سودا کو یقینی طور پر اس کا موجد نہیں کہہ سکتے خود سودا نے مختلف انداز

---

۱ - واقعات انیس ، ص ۶۲ -

۲ - کاشف الحقائق ج ۲ ، ص ۳۷۰ -

۳ - حیات دبیر ج ۱ ، ص ۱۱۷ - ۱۱۶ -

۴ - یادگار انیس ، ص ۱۲ حاشیہ -

میں بکثرت مرثیے لکھے ھیں جن سے بظاھر یہ معلوم ھوتا ھے کہ مرثیے کے جو انداز پہلے قائم ھو چکے تھے سودا نے اونہوں کی تقلید کی ھے "[1] میر صاحب غریب کا کسی نے نام نہ لیا حالانکہ انہوں نے بھی مسدس لکھا ھے اور وہ بھی سودا اور سکندر کے ھم عصر تھے - مگر میر صاحب کے مراثی عرصہ تک نایاب رھے اور اِن کے متعلق شاید کسی کو واقفیت نہیں تھی ان کے مسدس مرثیہ کا ایک بند نمونتاً درج کیا جاتا ھے -

چلاسر کٹ کے اُس جان جہاں کا
گرا ھے خاک پر خوں ھر جواں کا
ھوا ستھراو یوں خرد و کلاں کا
مقرر لوٹنا ھے خانماں کا
کسو ملت میں ایسا بھی ھوا ھے
نبیا وارث ھمارا ھی موا ھے

اب جناب نصیر حسین صاحب خیال کا خیال ھے کہ مسدس کی ایجاد سکندر سے بہت پہلے ھو چکی تھی چنانچہ انہوں نے مولف " حیات دبیر " کو بذریعہ خط بتایا کہ مسدس کے موجد نہ میاں سکند پنجابی ھیں اور نہ مرزا سودا - اس کا موجد حیدر یا حیدری دکھنی ھے جس کا تذکرہ گارسن دی تاسی اور مولوی کریم الدین نے کیا ھے - یہ ولی کا ھمعصر تھا اور غالباً سو برس کی عمر میں عملداری احمد شاہ باشاہ میں فوت ھوا - ڈاکٹر اسپینگر صاحب کے پاس جو مرثیہ کی بیاض ھے اس میں حیدری کا ایک مرثیہ بہت دھوم دھام کا ھے - جس کا پہلا بند یہ ھے -

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ھے
شب رخصت ھے بھائیوں سے شہ دیں کی جدائی ھے

---

۱ - شعرالہند ج ۲ ، ص ۱۱۴ -

خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ھے

سرھانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دھائی ھے
منھ اس کا چومتی ھے اور یہی کہہ کہہ کے روتی ھے
اری اُٹھ لادلی میری غضب کی صبح ھوتی ھے [1]

مگر بقول " مولف یادگار انیس " یہ " ایسا بہتان عظیم ھے کہ اس کی تردید کے لئے نقلی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں " اس کی زبان کی ارتقائی حالت دیکھکر بہ یک نگاہ فیصلہ کیا جاسکتا ھے کہ ممکن ھے کہ حیدر یا حیدری عہد احمد شاہ کا کوئی مرثیہ گو ھو مگر یہ بند اس کے مرثیے کا نہیں ھو سکتا اور غالباً متاخرین میں سے کسی غیر معروف شاعر کی تصنیف ھے -

غرضکہ موجودہ مرثیے کے جملہ عناصر دکن کے مراثی میں بھی پائے جاتے ھیں جو آج سے دو ڈھائی سو برس پیشتر لکھے گئے ھیں مگر یہ بالکل ابتدائی حالت میں ھیں اور بعد میں شمالی ہند کے مرثیہ گویوں میں سکندر و سودا وغیرہ نے انھیں اور ترقی دی مگر یہ غیر مربوط رھے اور ھنوز کسی ایک مرثیہ میں ان کا اجتماع نہیں ھوا ھے - کسی مرثیہ میں تھوڑا سا مکالمہ مل جاتا ھے - کہیں کوئی روایت نظم کر دی جاتی ھے کبھی چار چھ اشعار رزمیہ کے قلمبند کر دئے جاتے ھیں - کہیں کہیں سیرت نگاری کر دی جاتی ھے اور جگہ جگہ واقعات کے بیان میں ھندوستانی رنگ زیادہ گہرا ھوتا گیا ھے سب سے پہلے ان عناصر کو مکمل و مربوط کرکے منظم و مرتب حالت میں پیش کرنے کا فخر میر ضمیر کو حاصل ھے جنھیں موجودہ مرثیہ گوئی کا بابا آدم کہنا چاھیے - اُنھوں نے اس صنف

---

۱ - دربار حسین دیباچہ ' ص ۳ - ۲ -

میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا - اور پرانے طرز کو چھوڑ کر جس کے حدود بالکل غیر متعین تھے ایک نیا پیرایہ اختیار کیا جس کے کچھ مقررہ اصول تھے - جس کا ایک خاص انداز بیان تھا اور جس کے چند ضروری اجزا تھے انھوں نے غلط الفاظ اور سست بندشوں کو ترک کرکے جس کا خیال اب تک مرثیہ گو کم کرتے تھے مراثی کی زبان اور طرز بیان کو دوسرے اصناف کے ہم پلہ کر دیا اور حسب ذیل اجزا کو ضروری قرار دیا - (۱) چہرہ (۲) رخصت (۳) سراپا (۴) آمد (۵) رجز (۶) رزمیہ (۷) شہادت (۸) بین (۹) دعا - اس نئے طرز کو دبیر نے فروغ دیا اور انیس نے معراج کمال تک پہنچایا - مگر مرثیہ کے اس ہرے بھرے چمن میں آبیاری کا اولین شرف دکھن ہی کے مرثیہ گویوں کو حاصل ہے -

---

نکولس رورک

ایک مصوّر اور علمبردار امن

(از مسٹر رام چندر تنڈن ایم - اے - ایل ایل - بی)

مترجمۂ مدیر 'ہندستانی'

(۱)

اپنے اُن معاصرین میں جنہوں نے بنی نوع انسان کے سود و بہبود اور اُن کی اصلاح و فروغ کے لئے شدید کوششیں کی ہیں، اُن میں نکولس رورک کا نام بہت ہی نمایاں حیثیت سے سامنے آتا ہے - ایک سائنٹسٹ، ایک فلسفی، ایک ماہر آثار قدیمہ، ایک حسن کار، ایک مکتشف غرضکہ اس نے اپنی زندگی میں شہرت و ناموری کی متعدد حیثیتیں اختیار کیں - دنیا کے تمام مفکرین اور تہذیب و شائستگی کے تمام پرستاروں نے اسکے تخلیقی کارناموں کا امتحان کرکے اس کی تصدیق کی ہے - آئین سٹائن (Einstein)، میٹر لنک (Maeterlinck)، اندریف (Andreyeff)، زولواگا (Zuloaga)، اتسزو تاکیوچی (Istuzo Takeuchi) اور اسی طرح کی دیگر نامور ہستیوں نے یکساں طور پر اس کے کارناموں کی خوبصورتی اور اسکی خیراندیشی کی تعریف و توصیف کی ہے - خود ہمارے ملک میں ربندرناتھ ٹیگور، چندرشیکھر رمن، جگدیش چندر بوس اور است کمار ہلدار نے اسکے پیام تہذیب کا اعتراف کرکے اس کی خدمت میں فیلوشپ کا خراج پیش کیا ہے - رورک پینتالس سال سے اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف ہے، لیکن اب تک اسکی سرگرمی اور اس کا جوش فرو نہیں ہوا بلکہ ہم اسکے تازہ ترین عمل میں بھی دوامی ترقی کی روح اور حقیقی معنوں میں ایک رواں دواں زندگی کے شواہد موجود پاتے ہیں -

رورک کی شخصیت نہایت عجیب ہے ۔ اُس میں مشرق کا گہرا تخیل اور مغرب کا جوش حرکت ایک مخلوط و ممزوج صورت میں نمایاں ہوا ہے ۔

رورک کا مخصوص کارنامہ حسن کاری کے میدان میں ظاہر ہوا ہے - یہ کہا جاتا ہے کہ رورک کا درجہ حسن کاری میں وہی ہے جو آئین‌سٹائن کا سائنس میں اور فورڈ کا صنعت و حرفت میں - اس مضمون میں کسی مقام پر اسکی حسن کاری پر محاکمے اور تبصرے کی کوشش کی جائیگی - لیکن تمہید ہی میں جس امر پر خصوصیت سے زور دینا ہے وہ یہ ہے کہ صرف حسن‌کاری ہی کے میدان میں رورک کے کمال نے اتنے بیشمار مظاہرے کئے ہیں اور زمانے کی اتنی مدت کو احاطہ کئے ہوئے ہے کہ اس مختصر سے خاکے میں ہمیں میل راہ کی صرف تھوڑی سی جھلک مل سکتی ہے اور بس - اس لئے کہ اس حسن کار نے تین ہزار سے زائد زائد تصویریں تیار کی ہیں جو کرۂ ارض کے تقریباً پچیس ممالک کے سیکڑوں عجائب خانوں اور نجی ذخیروں میں بکھری ہوئی ہیں - ایک ہزار سے زائد تصویریں تو تنہا نیو یارک کے عجائب‌خانے میں موجود ہیں -

یہ تصویریں خواہ کم تعداد میں ہمارے سامنے ہوں یا زیادہ ، ہم انکی وسیع‌المشربی اور ہمہ گیری اور ان سب سے زائد ان کی صداقت کی بلند تکرار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے - ان تصویروں کے متعلق مشہور شاعر ربندر ناتھہ ٹیگور نے اپنے ایک خط میں جسے موصوف نے رورک کے نام لکھا تھا اپنے خیالات کا اسطرح اظہار کیا ہے :—" آپکی تصویروں سے میں بیحد متاثر ہوا ، مجھے انکے ذریعہ سے ایک ایسے امر کی تصدیق ہوئی جو بالکل نمایاں ہے ، تاہم انسان کو اپنی ذات سے اس کی متواتر تحقیق کرنا پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ صداقت غیر محدود ہے - آپ کی تصویریں بہت ہی صاف ہیں تاہم ان کی تشریح الفاظ سے نہیں کی

نکولس رورک
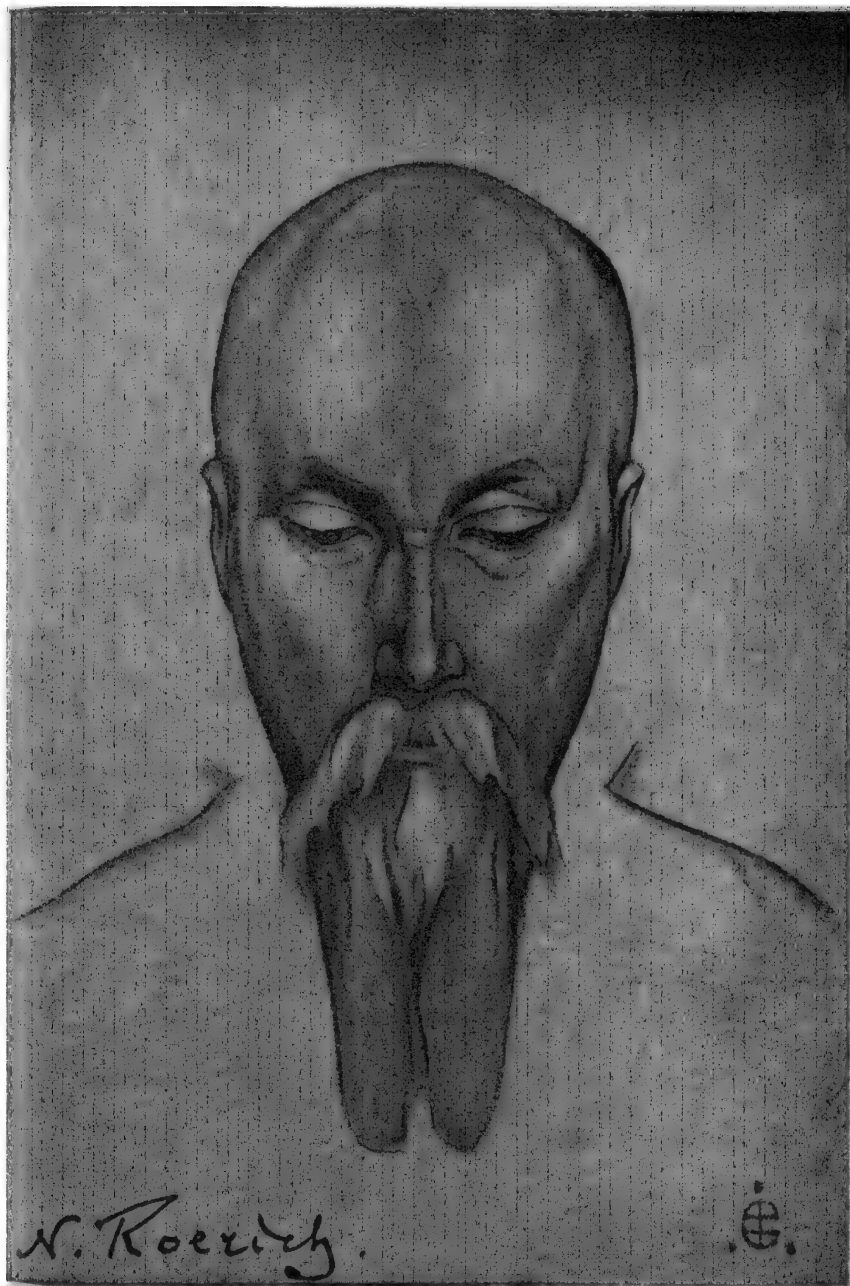
(تصویر تیار کردۂ سیوتو سلو رورک)

جا سکتي - آپ کی حسن کاری اپنا آپ جواب ھے ' اس لئے که وہ عظیم الشان ھے " -

(۲)

نکولس رورک ۱۰ اکتوبر سنه ۱۸۷۴ع کو روس کے مقام سینٹ پیٹرس برگ میں پیدا ھوا - اُس کا باپ کونسٹنٹن ' ایف ' رورک ' نارس ' کی نسل کا ایک مشہور بیرسٹر تھا - اسکی ماں ' میری کالشنی کاف ' سکوڈ (Pskov) کے ایک قدیم روسی خاندان سے تھی - رورک کا خاندان نسلی اعتبار سے ناروینجیا کے وائیکنگس سے تعلق رکھتا ھے اور رورک نام دسویں صدی عیسوی کی قدیم تاریخوں میں بھی ملتا ھے - اسطرح موجودہ حسن کار (رورک) میں باپ کی طرف سے نارڈک صفات اور ماں کی جانب سے روسی صفات مجتمع ھوگئے ھیں -

رورک کا خاص طرز ' جو اسی کے نام سے منسوب ھے' رورک کی حسن کاری کا ایک مستقل اسکول ھوگیا ھے - حتیٰ کہ اپنے ابتدائی لڑکپن کے زمانے میں بھي رورک اپنے مخصوص شخصی طرز میں (جس کے تکرار و اعادہ کا امکان نہیں ھے) کام کیا کرتا تھا اور اس طرح اپنے فن کي ذاتی ترقي کی بنیادیں مستحکم کر رھا تھا -

رورک کی عمر جس وقت دس برس کی تھي اور وہ اپنے خاندانی علاقے ایشور (Isvara) میں مقیم تھا ' اس نے وائکنگس کے قدیم تودوں کا غائر مطالعہ شروع کر دیا - بڑے بوڑھوں نے اُن آثار و باقیات کے چھیڑنے سے اُسے منع کیا ' لیکن اُس نے خود اعتمادي کی بنا پر اُن آثار و قبور کي تحقیقات جاری رکھی - چنانچہ اسے اس تحقیقات میں بہت سی کانسے کی چیزیں دستیاب ھوئیں - یہ چیزیں اُسنے اپنے ملک کی مجلس

آثار قدیمہ کو نذر کر دیں - اس طرح لڑکپن ہی میں اُسے خوبصورت چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی -

پندرہ برس کے سنِ میں نقاشی و مصوّری کے فن میں کمال حاصل کرکے اس نے مضامین اور نقشے آرٹ کے مصوّر رسالوں میں بھیجنا شروع کر دئیے ' جو ان رسالوں میں لے لئے گئے اور شایع ہوئے - اس طرح اس حسن کار کے ادبی اور فنّی دور کا آغاز ہوا -

سب سے پہلے رورک، کے والدین نے قانون پڑھنے کے لئے اسے سینٹ پیٹر سبرگ کی یونیور سٹی میں داخل کرایا ' اس نے اس مضمون پر پوری توجہہ صرف کی لیکن اسکی طبیعت کا میلان بہ‌نسبت قانون کے سائنس اور آرٹ کی طرف زیادہ تھا ' اس لئے فنون لطیفہ کی اکیڈیمی میں ایک طالب فن کی حیثیت سے داخل ہوا اور مصوّری میں کمال پیدا کرنے کی انتہائی کوششیں شروع کر دیں ' یہاں وہ بہت ہی قابل اور لائق طالب علم ثابت ہوا اور تین برس کی تعلیم ایک سال میں ختم کر لی - چنانچہ یہاں اس نے گریجویٹ ہونے کی سند حاصل کی - اس کے بعد اس نے پیرس میں حسن کاری کی تعلیم حاصل کرنا شروع کیا - ابھی وہ نو عمر ہی تھا کہ '' مجلس ترقی حسن کاری '' کے عجائب خانے میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوا اور اسی حیثیت سے وہ پیرس روانہ ہوا تھا جب کہ وہاں اس نے حسن کاری کی اعلیٰ تعلیم بھی ضمناً حاصل کرلی - پیرس سے واپسی پر وہ اس مجلس کا سکریٹری مقرر ہوا ' سنہ ۱۸۹۲ ع سے سنہ ۱۹۰۰ع تک وہ آثار قدیمہ کی امپیریل اکیڈیمی میں بحیثیت معلّم کے کام کرتا رہا - اسی زمانے میں وہ رسالہ '' آرٹ '' کا اڈیٹر بھی تھا - سنہ ۱۹۰۳ع میں وہ روس کی ' آرکیٹکچرل سوسائیٹی کا ممبر منتخب ہوا - یہ امتیاز صرف اعلیٰ درجہ کے انجینیر اور

ماهرین فن تعمیر کے لئے مخصوص تھا ، لیکن روورک کا انتخاب خاص حالات کی بنا پر عمل میں آیا - زار روس کی جانب سے ایک گرجے کے نقشے کی تیاری کا اعلان ہوا - روورک نے بھی (اگرچہ فن تعمیر کا ماہر نہیں تھا تاہم ایک افسر اعلیٰ کی تحریک پر جو روورک کی حسن کاری کا قدر شناس تھا) ایک نقشہ تیار کرکے پیش کیا - جسوقت نقشوں کے لفافے کھولے گئے کسقدر حیرت کی بات تھی کہ درجۂ اول کا انعام کسی ماہر فن تعمیر کو نہیں بلکہ روورک کو جو ایک مصوّر تھا دیا گیا ـ سنہ ۱۹۰۶ع سے سنہ ۱۹۱۶ع تک روورک " مجلس ترقی حسن کاری " کا ڈائرکٹر رہا ، سنہ ۱۹۱۰ع میں وہ یوروپین سوسائٹی " دنیاے حسن کاری " کا صدر اول منتخب ہوا -

یونیورسیٹی کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے بھی روورک نے متعدد علمي ، اثاري اور حسن‌کاری کی مجلسیں قائم کیں اور حسن‌کاری کی متعدد نمائشیں بھی اسکے اهتمام سے منعقد ہوئیں - انقلاب روس سے کچھہ پہلے اس نے ملک چھوڑ کر فن لینڈ میں اقامت اختیار کر لي تھی اس کے بعد اس نے سوڈن اور ڈنمارک کا سفر کیا اور اپنی تصویریں ان ممالک میں پیش کیں - مئی سنہ ۱۹۲۰ع میں اسنے سب سے پہلے اپنی حسن کاری کی نمائش لندن میں کی - بہر صورت جہاں جہاں روورک جاتا تھا اسکي تصویروں کے شوق میں ایک جم غفیر جمع ہو جاتا تھا ، اسی کے ساتھہ اسکے مقلد اور نقال بھی پیدا ہونے لگے -

(۳)

سنہ ۱۹۲۰ع میں روورک کی کارگذاریوں کا منظر یوروپ سے امریکہ میں تبدیل ہو جاتا ھے ـ امریکہ میں اُسنے حسن کاری کی بہت سی مجلسیں قائم کیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں ، " دی ماسٹر انسٹیٹیوٹ

آف یونائٹڈ ارٹس " (The Master Institute of United Arts) اور " کرونامنڈی " (Corona Mundi) ھے جو بین‌الاقوامی حسن کاري کا مرکز ھے -

" دی ماسٹر انسٹیٹوٹ آف یونائیٹڈ آرٹس " سنہ ۱۹۲۱ع میں قائم ھوا ـ انتظام یہ کیا گیا کہ مصوری ' نقاشی ' تھئیٹر ' آرائش ' بت تراشی' موسیقي ' ادبیات ' صحافت اور فوٹوگریفی وغیرہ وغیرہ متعدد شعبوں کا سامان ایک ھي چھت تلے فراھم کیا جاے - رورک اپنی تمام عمر میں حقیر ابتدا کا قائل رھا ھے ' اس سے پوچھا گیا کہ اتنے وسیع فنون کا سامان کیا ایک ھی چھت تلے ممکن ھے ؟ اسکا جواب جو اسنے دیا اس سے اسکی خاص طبیعت کا صحیح طور پر اندازہ ھو سکتا ھے ـ اسنے کہا کہ " تخلیق و تولید کے تصور کے لئے ایک شخص کو فرآ انجلیکو کی ایک کوٹھري سے زیادہ جگہ کی ضرورت نہیں ھے ـ ھر درخت کو اُگنا چاھئے - اگر کام صالح اور جاندار ھے تو وہ ترقي کریگا اور اگر اسے نیست ھونا ھے تو وہ کیوں نہ ایک ھی کمرے میں نیست و نابود ھو کر رھے " - زمانے نے بتا دیا کہ جو تخم اسطرح بویا گیا اسمیں نشو و نما کی صلاحیت تھی ' اس آدارے کا مقولا یہ تھا ـ

" حسن کاری تمام عالم انسانی کو باھم متحد کر دیگی - حسن‌کاری ایک شے واحد ھے اور ناقابل تقسیم - حسن‌کاری کی شاخیں بکثرت ھیں مگر وہ سب ایک ھیں - حسن کاری آیندہ اتحاد باھمي کا ایک مظہر ھے - حسن کاري سب کے لئے ھے ـ حسن کاري کو عام لوگوں کے سامنے لاؤ کیونکہ یہ انھیں کي چیز ھے ـ ھمیں صرف عجائب خانے ' تھیٹر '

دارالعلوم ' کتبخانے ' ریلوے اشٹیشن اور اسپتالوں ہی کے سجانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اگر جیلخانوں کو بھی زینت دی جائے اور انھیں بھی خوبصورت بنادیا جائے تو پھر ہمیں جیل خانوں کی ضرورت ہي نہ رہ جائے گی "

دوسرے ادارے " کرونا منڈی " یعنی بین‌الاقوامی حسن‌کاری کے مرکز کی سنہ ۱۹۲۲ع میں بنیاد پڑی ' اسکے مقولے یا اصول کار سے حسن‌کار کے تصور حسن کا یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی مسائل کا ایک بہت بڑا ذریعۂ حل ہے :—

" انسانیت کا سامنا عالم کے عظیم‌الشان واقعات سے ہو رہا ہے انسانیت اس امر کی تحقیق و تصدیق کرتی جا رہی ہے کہ تمام واقعات و حوادث اتفاقي نہیں ہیں - تہذیب مستقبل کی تعمیر کا وقت بالکل قریب ہے — حسن اور عمل کے آثار تمام مقدس ابواب کو کھول دینگے - حسن کے زیر سایہ ہم مسرت کے ساتھہ چلتے پھرتے ہیں - حسن و عمل کے ذریعہ ہم فتوحات حاصل کرتے ہیں - حسن کے ذریعہ ہماری دعاؤں کی رسائی ہے ' حسن ہي کے ساتھہ ہم متحد ہوتے ہیں - اور اب ہم ان الفاظ کي تصدیق کرتے ہیں نہ صرف برفستانی بلندیوں پر بلکہ شہر کے شور اور ہنگاموں میں بھی - اور اصلی صداقت کی راہوں کي تحقیق و تصدیق کرکے ہم ایک پُر مسرت توسم کے ساتھہ مستقبل کا خیر مقدم کرتے ہیں " -

سنہ ۱۹۲۳ع میں امریکن آداروں نے روورک عجائب خانے کی بنیاد قائم کی - اسکا افتتاح مارچ سنہ ۱۹۲۴ع میں ہوا - یہ عجائب خانہ

نیویارک کے ایک ۲۴ منزل کی سر بفلک عمارت میں ھے جو اکتوبر ۱۹۲۹ع میں درجۂ تکمیل کو پہونچا اور کھولا گیا - اس عمارت میں '' ماسٹر انسٹیٹوٹ آف یونائٹڈ آرٹس'' اور '' کرونامنڈی '' یعنی' بین الاقوامی حسن کاری کے مرکز بھی شامل ھیں - اس کے علاوہ اسی میں رورک عجائب خانے کا پریس ھے اور اسی کے ساتھہ '' اورسوتی ھمالین ریسرچ انسٹیٹوٹ '' (The Urusvati Himalayan Research Institute) بھی -

(۴)

رورک جس طرح ایک بہت بڑا مصوّر ھے اسی طرح وہ ایک بڑا مکتشف بھی ھے ' چنانچہ نیویارک کے عجائب خانے کے قائم ھونے کے بعد ھی اسکی حرکت و بیداری کا منظر پھر تبدیل ھو جاتا ھے اور وہ وسط ایشیا میں تحقیقات و اکتشافات کے کاموں میں مصروف نظر آتا ھے - رورک عجائب خانے اور دیگر امریکن اداروں کی جانب سے سنہ ۱۹۲۲ع میں وہ '' رورک امریکن وسط ایشیائی مہم '' کے سر گروہ کی حیثیت سے امریکہ سے روانہ ھوا - اس مہم سے اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایشیائی موضوعات کی تصویروں کے ذریعہ مشرق کی اسپرٹ کو مغرب کے سامنے پیش کر سکے اور مشرق کی تہذیب و حسن کاری کا مطالعہ کرے -

رورک سنہ ۱۹۲۴ع سے ھندوستان میں مقیم ھے ' کوچک تبت اور درۂ کاراکورم سے لیکر چینی ترکستان اور منگولیہ و تبت تک غرض کہ ناف ایشیا تک پورے ایک دائرے میں اسکی سیاحت رھی ھے - اسکی سیاحت کے حالات ان کتابوں سے معلوم ھو سکتے ھیں جو اسنے اور اُس کے فاضل فرزند ڈاکٹر جارجز رورک نے لکھی ھیں - '' الٹائی ھمالیہ '' رورک کی اور '' تریلس تو ان موسٹ ایشیا '' اسکے لڑکے کی تصنیف ھے - یہ کتابیں وسط ایشیا کے مہمات پر قابل قدر ادبی صداقتیں ھیں - یہ مہم وسط

ایشیا کے بہت سے غیر معروف مقامات سے گذری ہے ' جس سے اُن مقامات کے بارے میں ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے - اسکے علاوہ ان کے ذریعہ حسن کاری و تہذیب کے متعلق بہت کچھ مواد تصویروں مخطوطوں اور دیگر قدیم چیزوں کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتا ہے -

اس مہم کو اکثر خطروں سے بھی سابقہ ہوا ' چنانچہ شرکاے مہم ایک مرتبہ ترکستان میں قید کر لئے گئے ' یہاں ان کی زندگی سخت خطرے میں پڑگئی ' ان کے ہتھیار ضبط کر لئے گئے اور اس طرح وہ حفاظت خود اختیاری کے ذرایعے سے بھی محروم کردئےگئے - وہ پانچ مہینے تک تبت کے پہاڑوں میں تقریباً پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایسی خوفناک آب و ہوا میں اور ایسی شدید جسمانی تکلیف کےساتھ مقید رہے کہ ان میں سے پانچ آدمی اور نوے جانور جان سے جاتے رہے - اس مہم کو ملک کے بہت ہی خوفناک حصوں سے گذرنا پڑا جو ڈاکوؤں سے بھرے ہوے تھے - اس مہم کی پانچ برس کی مدت میں اخبارات نے ایک سے زائد بار رورک کو گمشدگی و مفقود الخبری کے گڑھے میں دفن کر دیا - باوجود ان تمام موانعات کے رورک نے تین سوپچاس سے زائد زائد تصویریں تیار کر لیں جو ایشیا کے حقیقی مظاہر یعنی اسکی قدرتی خوبصورتی اور اُسکی تعلیمات و روایات کی ترجمان ہیں ' جنکی آرائش میں ایک حسن کار کی نظر ' ایک فلسفی کی روح اور ایک سائنٹسٹ کے تجربات کارفرما ہیں - رورک سے زیادہ شاید ہی کوئی ایشیا کا نبض شناس ہو اور اس کی خوبصورتی ' اس کے قدیم تہذیب اور اس کے آئندہ امکانات و توقعات کو سمجھتا ہو -

گزشتہ دس برسوں میں رورک نے نہ صرف ایشیا بلکہ تمام دنیا کی سیاحی کی ہے - اس دوران میں اس نے چھہ مرتبہ بحرِ اٹلانٹک کو

اور پانچ مرتبہ بحر ہند کو عبور کیا ۔ کشمیر ' لداخ ' سائبیریا ' منگولیا ' اور تبت وغیرہ کی ہزارہا میل کی ' سیاحت کی - تقریباً تیس ایسے دروں سے گزرا جو پندرہ ہزار اور پچیس ہزار فٹ تک بلند تھے اور اس طرح وسط ایشیا کے بے شمار شاہکار جو حسن‌کاری اور سائنٹفک معلومات کے بلند ترین نمونے ہیں اپنے ساتھ لایا - اس کے علاوہ اس نے مختلف زبانوں میں بہت سے مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں - اور تمام دنیا میں تہذیب و حسن کاری کے بیسیوں مرکزوں کے قائم کرنے میں امداد دی ہے جو ایک فوق‌الانساں کے شایان شان اور تخلیقی قابلیت کی ایک بین شہادت ہے -

روورک کے گزشتہ برسوں کی تصانیف یہ ہیں :—" فلاور آف موریا " (Flower of Morya) " اڈامنٹ " (Adamant) " پاتھس آف بلیسنگ " (Paths of Blessing) " آلتائے ہمالیہ " (Altai Himalaya) - " ہارٹ آف ایشیا " (Heart of Asia) " شمبلا " (Shambala) " ریلم آف لائٹ " (The Realm of Light) اور " فایری اسٹرانگ ہولڈ " (Fiery Stronghold) - ان تمام کتابوں سے یکساں طور پر اس اعلیٰ شخصیت کی وسیع زندگی و بیداری کا اظہار ہوتا ہے -

(۵)

روورک کے وسط ایشیا کی مہم کے فوراً بعد ہی یعنی ۱۲ جولائی ۱۹۲۸ کو روورک عجائب‌خانے کا " اُروسوتی ہمالیں ریسرچ انسٹیٹوٹ " قائم ہوا - اس ادارے کے بانیوں نے یہ محسوس کیا کہ ایشیا کے اس خطے کی علمی تحقیقات کے لئے ایک مستقل ادارے کے قیام کی فوری ضرورت ہے - تخصیص فن کی ترقی کنان ضرورت کو دیکھتے ہوے یہ بالکل ناممکن تھا کہ کوئی ایک آدمی اتنے بے شمار مسایل کو جو اس مکتشف کے سامنے

نور ظلمت پر فتح پا رہا ہے
(میونیسپل میوزئم - الہ‌آباد)

مقدس چرواہا
(میونیسپل میوزئم - الہ‌آباد)

وہ جو رہنمائی کرتی ہے
(میونیسپل میوزئم - الہ آباد)

آرھے ھیں تنہا اپنے ھاتھوں میں لے سکے - اس لئے اختصاصین کی ایک ایسی جماعت کی شرکت کار ضروری سمجھی گئی جس کے ھر فرد کو اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و تلاش کی خدمت سپرد کی جائے - چنانچہ " ھمالین ریسرچ انسٹیٹیوٹ " (جس کا مستقر نگر ' کولو پنجاب میں ھے) عالم وجود میں آیا -

یہ ادارہ آثار قدیمہ ' لسانیات اور نیچرل سائنس کے میدان میں علمی تحقیقات کی رہ نمائی کرتا ھے ' اور کیمیاوی تجربات کے لئے معمل یا تجربہ خانے کا انتظام رکھتا ھے - اس وقت تک اس نے قدیم ایور ویدک ادویات اور تبتی طریقۂ علاج کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ تفتیش و تلاش کا کام جاری رکھا ھے - ھمالیہ کی جڑی بوٹیوں کے تجزئے اور تحلیل کے لئے ایک بہت بڑا تجربہ خانہ قائم کیا ھے - ایک عجائب خانہ اور ایک کتب خانہ بھی اس ادارے سے متعلق ھے - ادارے کی جانب سے ایک سالانہ رسالہ " اُروسوتی جرنل " نکلتا ھے جس میں زیادہ تر تجربات و تحقیقات پر تازہ ترین مقالے شایع ھوتے ھیں اور اس کے مختلف شعبوں کے سالانہ کارناموں کی رپورٹ ھوتی ھے -

ادارے کی گزشتہ سال کی رپورٹ سے معلوم ھوتا ھے کہ لاھول یا مغربی تبت کی مہم و تحقیقات پر خاص توجہ صرف کی گئی - ڈاکٹر جیارجز رورک نے خطۂ لاھول کی زبان کا غایر مطالعہ کیا ھے - انھوں نے ایک نہایت ھی اھم لسانیاتی خدمت لاھول کی مروجہ بول چال کے متعلق کی ھے - ' تبتکا ' کے نام سے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ھے جس میں تبتی ادبیات کی ترتیب و تدوین کی گئی ھے اور ایک لغت تبتی زبان سے انگریزی زبان میں زیر ترتیب ھے - اس خطےکی جڑی

بوٹیاں اور نباتاتی نمونے کثرت سے جمع کئے گئے ہیں - ان چیزوں کی امریکہ میں نمائش کی گئی تھی ' جس سے وہاں سائنس کی دنیا میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا گیا -

اس ادارے کا خاص مقصد وسط ایشیا کے خطّوں کی تحقیقات و تفتیش ہے ' اس برّاعظم کے دوسرے حصّے بھی اس میں شامل ہیں ہندوستان کے بارے میں بھی تحقیق و تلاش اس کے مقاصد میں داخل ہے - رورک نے اپنے کاموں میں اس ملک اور اس کی تہذیب کے بارے میں بہت توجہ و محبت کا اظہار کیا ہے - یہ امر بہت ہی شکرئے اور مسرت کے قابل ہے کہ یہ ادارہ اس ملک کے حدود میں واقع ہوا ہے -

خود رورک اس ادارے کا صدر ہے ' اُس نے اور اس کی بیوی میڈم ہلنا رورک نے اس ادارے کی زمین اور عمارت کے لئے چندہ بھی دیا ہے - ادارے کے اخراجات رورک عجائب خانے اور شخصی امداد کی بدولت چلتے ہیں -

(۲)

رورک کی تیار کی ہوئی تصویریں اس کثرت سے ہیں اور اپنے تخلیقی نقطۂ نظر سے اتنے زمانے کو محیط کئے ہوئے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی وسیع و جامع رائے پیش کرنا مشکل ہے - لیکن لایق و قابل ناقدین فن ' جنہوں نے اس کی حسن کاری کا غایر مطالعہ کیا ہے ' اس فیصلے پر متفق ہیں کہ رورک کا درجہ نہ صرف روس کے بلکہ تمام دنیا کے حسن‌کاروں میں ایک بہت بلند و ممتاز حیثیت رکھتا ہے - گو ' رورک روس کا رہنے والا ہے لیکن اس کی تصویریں روسی روایات کی تقلید میں نہیں ہیں - وہ در اصل اپنے طرز خاص کا آپ خالق و موجد ہے جس کا علم لوگوں کو بعد میں ہوا - سرج آرنسٹ نے رورک پر اپنی کتاب میں

لکھا ھے :—'' معاصر روسی حسن کاری کی تاریخ میں رورک کی انفرادیت اس شعبے کی رسائیوں اور تحقیقاتوں کے مقابلے میں قطعاً اوروں سے بےنیاز ھے - اُس کی جدت شاید کسی حد تک غیر متوقع بھی ھے '' اسپین کا مصور زولواگا رورک کی حسن کاری کی صرف جدت ھی سے متاثر نہیں ھوا بلکہ وہ اس کی زبردست قوت کا بھی معترف ھے ' وہ کہتا ھے کہ ' '' حسن کار اعظم ! یہ ھے شہادت اس امر کی کہ روس کی طرف سے کوئی قوت دنیا پر کام کر رھی ھے - یہ کیا ھے ؟ میں نہ اس کا درجہ متعین کرسکتا ھوں اور نہ تجزیہ بس یہ موجود ھے اور ' میں اِسے دیکھتا ھوں '' کارتیوز امریکہ کا ناقد فن کہتا ھے کہ '' اس کی حسن کاری کی اصل رعنائی قوت متخیلہ کے عمق سے پیدا ھوتی ھے - اس کی موجدانہ تپش و حرارت حیرت انگیز ھے - رورک عالم خواب سے حقیقتوں کی طرف گزرتا ھے اور پھر واپس جاتا ھے '' -

اگر رورک کی مصوّری کی پہلی صفت جدّت ھے تو دوسری بلا شبہ اس کی ھمہ گیری ھے ' تصویروں کے بارے میں عموماً یہ کہا جاتا ھے کہ ان کی زبان عام اور ھمہ گیر ھے ' رورک کی تصویروں پر یہ عامیانہ مفہوم صادق نہیں آتا - اگر کوئی شخص ان تصویروں کے بارے میں انکے عنوانات سے واقفیت حاصل کرلے تو اسے معلوم ھوگا کہ یہ کسی خاص ملک ' خاص جماعت یا خاص نسل سے تعلق نہیں رکھتیں - اس کے موضوعات دنیا کے تمام حصوں سے لئے گئے ھیں ' وہ تمام انسانوں کے مذاھب کی گہری عظمت اپنے دل میں رکھتا ھے - وسط ایشیا کی مہم کے زمانے میں اس نے جو تصویریں تیار کیں ان کے سلسلے کا نام '' مشرق کا ساگا '' رکھا ھے - اس کے بعض اور سلسلوں کے نام حسب ذیل ھیں :—'' مشرق کے جھنڈے '' '' فراست '' '' چنگیز خاں '' '' بنات الارض '' '' اُس کا ملک '' - '' فراست ''—مشرق کے جھنڈے کے سلسلوں کے کچھ عنوانات سے اس کے

عالمگیر موضوعات کا اندازہ ہوگا وہ یہ ہیں :۔"غنچہ آتشیں" - "چلتا منی" "وہ جو رہنمائی کرتی ہے" "سوز ظلمت" "مادر عالم" "فاتح بودہ" "آثار مسیح" "لاوتسی" "موسیٰ ھادی" "پدم سمبھوا" (کنول سے نکلی ہوئی) "محمد کوہ حرا پر" - "منصف کنفیوشیش" اور "ناگارجن 'فاتح ماراں" ان تمام تصویروں سے حسن کاری کی گہری نگاہ اور سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے -

رورک کی ہمہ گیری کی اصلی کلید اس کی روحانیت ہے ایک ناقد فن نے کہا ہے کہ " جہاں بعض لوگوں میں اس کی تصویریں رنگ و صورت کے لحاظ سے حیرت و قدرشناسی کی دعوت دیتی ہیں وہیں دوسرے لوگوں میں وہ روحانی غور و تعمق کی تحریک کرتی ہیں " - اولن ڈاونس لکھتا ہے کہ :۔" رورک کی تصویریں اس لئے عظیم‌الشان ہیں کہ ان ایام اضطراب میں وہ بہت بڑا یقین و اعتماد پیدا کرتی ہیں - اس کے کارنامے مجھے ریلن کے اس طرز اظہار کی یاد دلاتے ہیں کہ دنیا کی تمام مقدس ہستیاں میرے قلب کے گرد متمکن ہیں " -

اس کے رنگوں کے عجیب و غریب نظام پر یہاں زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ وہ رنگوں کا فسوں ساز کہلاتا ہے - چھاپے کے ھاف ٹون نمونوں سے اصل تصویر کی تازگی و پختگی ظاہر نہیں کیجاسکتی - پیکنگ کے نیشنل ہسٹاریکل عجائب خانے کی جانب سے جو ایڈرس رورک کی خدمت میں پیش کیا گیا اس میں " آواز اور سائے کے نمایاں کرنے کی قابلیت " کا ذکر کیا گیا ہے ' دوسرے ناقدین فن نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اسکے عمل میں بعد چہارم کے اوصاف بھی موجود ہیں - اسمیں شک نہیں کہ رورک ان تمام اُمور کے اظہار کی قابلیت رکھتا ہے اسلئے کہ رنگوں کے امتزاج باھمی کا اسے کمال حاصل ہے۔

ویاس کنڈ
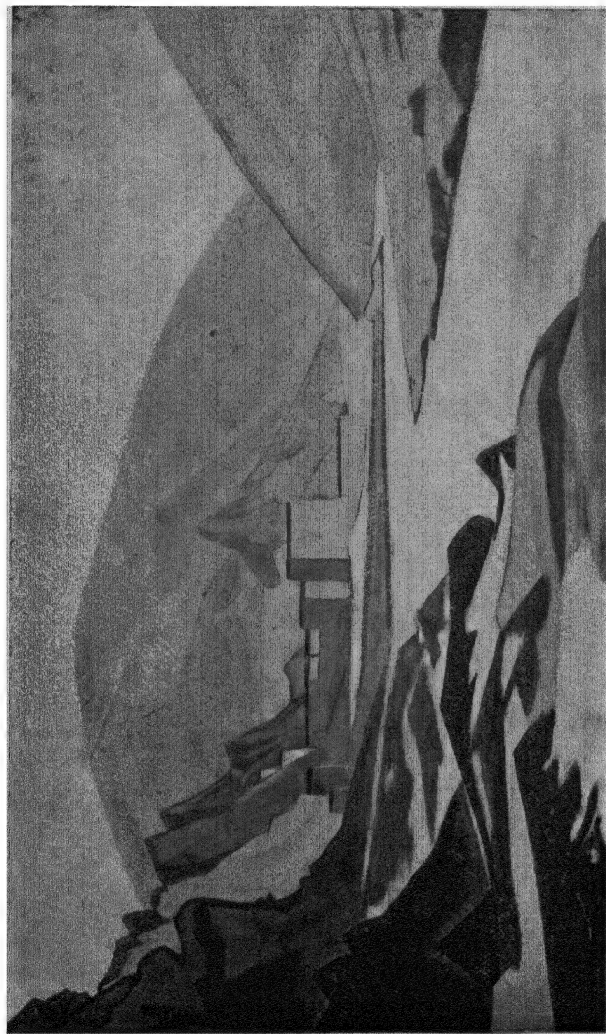
(میونیسپل میوزئم - الہ آباد)
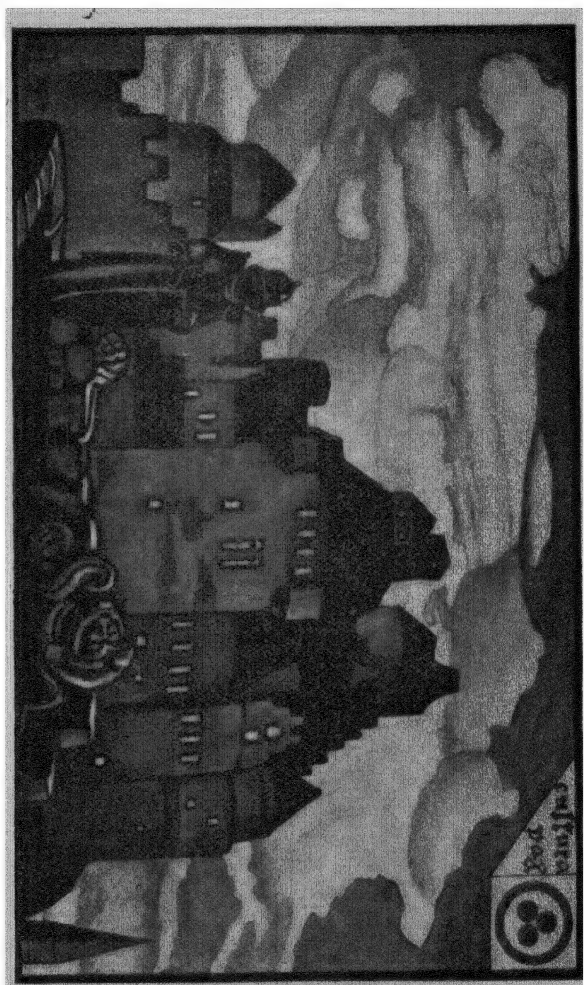
شعلۂ جنگ

(بہ اجازت پروفیسر رورک)

رورک کی معلومات فنی حیثیت سے بہت ہی وسیع ہے ' اس نے ہر طرح کی تصویروں پر کام کیا ہے ' اُسے بیشمار رنگوں کا تجربہ ہے - اور مصوری کے وسیع تجربے سے اسے یہ کمال حاصل ہے کہ اس کے مجموعے کا مناسب استعمال کرسکے لیکن اُسے نئے نئے وسائل اور نئے نئے اسالیب کے تجربے کا شوق ہے ' چنانچہ تبت کے دوران سفر میں اسنے تبتی حسن‌کاروں کے فنی و صنعتی عمل سے بھی واقفیت و دلچسپی پیدا کر لی -

رورک کی تصویروں کی ایک عظیم‌الشان اھمیت ان کی پیشین گوئی ہے - کچھہ لوگ ھیں جو اس امر کے منتظر رھتے ھیں کہ آجکل رورک کس طرح کی تصویریں بنانے میں مصروف ہے ان کے نزدیک رورک کی تصویریں نشانِ منزل کا پتہ دیتی ھیں جن کی حیثیت مثل پیشین گوئی کی ھوتی ہے - ادبیات میں بھی رورک کے بارے میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اس حسن‌کار نے جو تصویریں سنہ ۱۹۱۳ع میں اور سنہ ۱۹۱۴ع کے اوائل میں طیار کی تھیں ان میں ایک طرح سے پیشین گوئی کی شان موجود تھی - رورک کی حسن‌کاری کے مطالعہ کرنے والوں نے اس کے کارناموں کے عنوانات کی فہرست سنہ ۱۸۹۷ع سے لیکر ۱۹۳۲ع تک اس طرح مرتب کی ہے ' کہ دنیا کے آنے والے واقعات کی ایک تمثیلی پیشین گوئی ھمیں ھر ھر قدم پر معلوم ھوتی ہے -

اس کی حال کی تصویر " سانسکتا پروتکٹرس " اور اسی طرح ھمالیہ کی تصویروں سے یہ معلوم ھوتا ہے کہ دنیا پر کوئی مصیبت آنے والی ہے' اور اس سے حسن‌کاری اور تہذیب کے قیمتی ذخیروں کے بارے میں اس حسن‌کار کے دل میں خوف پیدا ھوا ہے کہ مبادا وہ تباہ و برباد نہ ھو جائیں اس خطرے کو دور کرنے کے لئے رورک نے اپنا مشہور " پرچم امن " نکالا اور اپنے " پر امن اتحاد " کی تجویز پیش کی -

رورک کی تصویروں کا بڑا حصہ تمثیلی و تشبیہی ھے ' انکی عظمت اس امر پر منحصر ھے کہ وہ صداقت ' خیر اور خوبصورتی ' کا پرانا سبق نئے انداز سے ھمارے سامنے پیش کرتی ھیں - یہ تصویریں اگرچہ ھمیں ایک آنے والے خطرے سے آگاہ کرتی ھیں تاھم وہ ھمیں مایوس نہیں بناتیں بلا شبہہ ان تصویروں میں ھمیں امید و ثبات کی جھلک بھی ملتی ھے - اور اس امر کا بھی اِشارہ ملتا ھے کہ یہ خطرہ وقتی و عارضی ھے اور یہ کہ مستقبل ' دنیا کے لئے محفوظ اور پُر امن ھے -

(۷)

یہ امر ایک سچی مسرّت کا باعث ھے کہ صوبۂ متحدہ میں دو ھال بنارس اور الہ آباد میں کھولے گئے ھیں جن کا انتساب اس مشہور حسن‌کار کے نام کیا گیا ھے ' اور جن میں رورک کے موقلم کے شاھکاروں کی نمائش کیگئی ھے - یہ ھال نیویارک کے رورک عجائب خانے کی شاخیں ھیں - بنارس میں رائے کرشن داس کے مساعی سے کلا بھون میں بارہ تصویریں اس حسن‌کار کی بہم پہونچائی گئی ھیں - الہ آباد میں بھي اتنی ھی تصویریں میونیسپل عجائب خانے میں پنڈت برجموھن ویاس کي کوششوں سے مہیا کی گئی ھیں - اگر ھم ان تصویروں پر ایک نظر ڈالیں تو ھم اس حسن‌کار کے طرز خاص سے پوري طرح آشنا ھو سکتے ھیں - دونوں مقامات کے ذخیروں کو ملاکر ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ یہ رورک کے جدید تریں تصویروں کے نمونے ھیں - بنارس کی تصویروں میں سے چند کے عنوانات یہ ھیں :—

" بہادر کا ستارہ " - " سخی بدھا " " پاک بھگوان " - " چرک " " کلکي اوتار " اور " میتریا " - انکے علاوہ ایک اور سلسلۂ تصاویر کا ھے جسے ھمالیہ اور تبت کے تاثّرات کہنا چاھئے -

" بہادر کے ستارے " میں ہم رات کے گہرے رنگ میں ایک لڑکے کو دیکھتے ہیں جو انتہائی شرق میں آسمان کے ایک بڑے شہاب ثاقب کو دیکھ رہا ہے، جو دور دراز عالم کا ایک پیغامبر ہے ۔

" سخی بدھ " ایک نیلے اور سرخ ' غروب آفتاب کے رنگ میں ہے' اسمیں بہت ہی پُر تاثیر طریقے سے ایک جاتری کا بدھ سے ملنا دکھایا گیا ہے ۔

" پاک یا مبارک بھگوان " یہ سری کرشن پرمہنس کے نام سے معنون ہے ' اس میں دکھایا گیا ہے کہ موصوف ایک برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی بلندی سے " اوم" کا نشان لئے ہوئے مصیبت زدہ دنیا کی طرف تشریف لارہے ہیں ۔

" کلکی اوتار " میں گہرے اور پُر قوت رنگ میں خدا کے آیندہ اوتار کو دکھایا گیا ہے جو ہمالیہ کی بلندي کے قریب ایک بڑے اور شاندار بادل سے اتر رہا ہے ۔

" چرکؔ " مشہور و معروف ایورویدک جراح ہے ' اسے دکھایا گیا ہے کہ ہمالیہ کي بلندیوں پر جڑی بوٹی کے جمع کرنے میں مصروف ہے ۔ تصویر پر ایک خاص نیلے رنگ کی چمک پیدا کي گئی ہے ۔

" میٹریا " کي ایک ڈرامائی شبیہ دکھائي گئی ہے ' یہ مغربی تبت کے ماحول کے روایات کے مطابق مستقبل کا مالک ہے ۔

" تری رتنا " یہ تانبے اور کانسے کے رنگ کا ہے ۔ اس میں اُس زخمی ہرن کي (جسنے ایک رشي کے دامن میں جاکر پناہ لي تھی) ۔ غیر فانی روایت دکھائی گئی ہے ۔

الہ آباد کي تصویروں کے ذخیرے میں بھی بہ استثنائے چند ' همالیہ ھی کا منظر ھے - ان کے عنوانات حسب ذیل ھیں:— '' مقدس چرواھا '' '' شمبالا کا پیام '' '' نور ظلمت کو فتح کر رھا ھے '' '' ارھت '' '' ویاس کنڈ '' '' گوگا چوھان اور نرسنگھہ '' - ''میتریا '' '' وہ جو رھنمائی کر رھي ھے ''

'' مقدس چرواھا '' قدیم سائیوانک روایات میں داخل ھے ' یہ بہت کچھہ سري کرشن جي کے حالات سے مشابہ ھے - اس میں اسکے دو مصاحب ' کوپاوا ' اور سنیگورو چکا ھیں جو سری کرشن کی گوپیوں کی جگہہ پر ھیں - ان دونوں تصورات میں ایک حیرت انگیز مماثلت ھے ' صرف گایوں کی جگہ اس میں بھیڑ ھیں - کھڑے ھونے کا انداز اور بانسري دونوں حالتوں میں یکساں ھے - تصویر پر دیہاتي زندگی کا نقشہ اور شام کا وقت صاف صاف نمایاں ھے -

'' شمبالے ڈانک یا شمبالا کا پیام '' حال کي تصویروں سے بالکل مختلف ھے - تصویر پر طلوع آفتاب کا رنگ دکھایا گیا ھے - ایک نامعلوم پیغام رساں ایک بیکراں گھرائی سے پہاڑ کی ایک خانقاہ پر تیر چلا رھا ھے جس پر طلوع آفتاب کی شعاعیں پڑ رھی ھیں - اس تیر میں ایک پیغام لپٹا ھوا ھے - اس قسم کی تصویر بنانے کے لئے ضرورت ھے کہ انسان نے اپنا بڑا وقت تبت میں صرف کیا ھو اور وھاں کی روایات کا پورا پورا علم رکھتا ھو -

'' نور ظلمت کو فتح کررھا ھے '' اسکا تعلق نور و ظلمت کی قوتوں کے قدیم معرکے سے ھے - اس میں غیر فانی نور کے ھیرو کو ظلمت کے دیوزاد پر فتح پاتے ھوے دکھایا گیا ھے - روشن چمکیلے رنگ پر سرخی کی زیادتی سے مجادلے اور معرکے کي فضا پیدا کی گئی ھے ' یہ تصویر

اس حسن‌کار کی اور تصویروں کے مانند تشبیہی و تمثیلی ہے اور اسکی ساخت ایک دائرے میں ہے -

''ارھت'' یہ بھی ایک تشبیہی تصویر ہے ' موضوع ' فضا اور رنگوں کی ترتیب بہت ہی مختلف ہے ' تصویر گویا ایک عنبرین اور زرنگار تجلّی میں غرق ہے - ایک کھوہ میں ارھت ایک عظیم‌الشان تخلیقی تصوّر میں مستغرق ہے ' لیکن اگے پہاڑی کی پشت پر ایک دیو تاک میں لگا ہوا ہے ' یہ دیو ' یہ مثالی سانپ خود ارھت کو بھی نگل جانے کے لئے تیار بیٹھا ہے ' لیکن یہ رشی اس سانپ سے واقف ہے ' اس کا ناگزیر ہونا بھی اسے معلوم ہے ' تاہم وہ اس سے غیر متعلق اور بے پروا بھی ہے - اُسکی روح سرمدی لذت میں محو اور غیر متزلزل ہے - پوری تصویر پر اسی قسم کا اطمینان و سکون طاری ہے -

'' ویاس کنڈ '' درۂ روھتنگ کے سلسلے پر جو سخت دشوار گذار ہے ویاس کنڈ واقع ہے ' یہ مہابھارت کے مشہور مولف رشی ویاس کے رھنے کا مقام ہے - یہ حسن‌کار گرمیوں کے زمانے میں ھمالیہ کی بلندیوں پر جاکر مختلف مقدّس مقامات کی زیارت کرتا ہے جن میں سے ایک اس تصویر کا موضوع ہے —

'' گوگا چوھان اور نرسنگھ '' وادی کولو کے محافظ ہیں یہ وہ مقام ہے ' جہاں عظیم‌الشان دیودار کے درختوں کے بیچ میں اس حسن کار نے اپنا اورسوتی ھمالین ریسرچ اِنسٹیٹوٹ قائم کیا ہے - یہی وہ تاریخی وادی ہے جو پانڈو ارجن اور منو کے ناموں سے متعلق ہے - اسکے آگے نیلے آسمان کے نیچے درۂ روتھنگ کے حاشیے چمک رہے ہیں - یہیں سے تبت اور کیلاش وغیرہ مقدس مقامات کے راستے شروع ہوتے ہیں -

" میتریا " یہ رورک کا محبوب تریں تصور ہے ' رورک نے " مستقبل کے مالک " کی متعدد تصویریں بنائی ہیں ' انہیں میں سے ایک بنارس کے ذخیرے میں بھی موجود ہے - پہاڑ کے دروں پر جو برف کی سی سرد ہواؤں سے گھرے ہوے ہیں " متیریا " کا بلند و عظیم‌الشان منقش مجسمہ دکھایا گیا ہے -

" وہ جو رہنمائی کرتی ہے " اس میں مسافر کو روحانی منازل کی تشبیہی بلندیوں کی طرف رہنمائی کی جارہی ہے - گلیشیر ' سفید چمکدار ہلکے نیلمین رنگ کے دکھائے گئے ہیں - چٹانیں نیچی ہیں - اس برف اور روشنی کی دنیا میں یہ دیوی تھکے ہوے جاتریوں کی رہنمائی کرتی ہے اور ان کا دل حوصلہ افزائیوں سے لبریز کر دیتی ہے - اس کا ہلکا سرخ رنگ برف کی سفیدی (مائل بہ سبزی) میں چمک رہا ہے - یہ تصویر اگرچہ چھوٹی ہے مگر ایک مخصوص ساخت کے اعتبار سے اس میں بڑی رفعت پیدا ہو گئی ہے -

جب ہم یکے بعد دیگرے ان تصویروں کو دیکھتے ہیں تو ہمارا دل ہمالیہ کی عظمت سے لبریز ہو جاتا ہے اور ہم اس قدرت اکتشاف سے جو صداقت کے بارے میں ظاہر کی گئی ہے اور مستقبل کی اس کوشش تحقیق سے جس پر تشبیہی رنگ دیا گیا ہے بے حد متاثر ہوتے ہیں -

(۸)

رورک کی ان تصویروں کے بارے میں جو ہمالیہ سے متعلق ہیں یہ صحیح فیصلہ کیا گیا ہے کہ فنّی حیثیت اور وسعت نظارہ کے اعتبار سے کسی مصور کی تصویر کو ان پر ترجیح و سبقت حاصل نہیں ہے - جب ہم زمین و آسمان کی ایسی وسیع فضا دیکھتے ہیں جو بے شمار سلسلوں میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کی

اصل روح ہماری ہستی میں داخل ہوئی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان تصویروں پر ایک روحانی غلاف بھی معنویت کا چڑھا ہوا ہے ' جو ہمارے تخیل کو رفیع کر دیتا ہے اور ہمیں شوق و اشتیاق سے لبریز کر دیتا ہے -

مسٹر است کمار ہلدار نے یہ کہکر گویا صحیح نقطے پر انگلی رکھدی ہے :—

'' مشرق کا صحیح تخیل جو ہمالیہ کی تمثیل و تشبیہ سے پیدا ہوتا ہے بلا شبہ اس کی تحقیق و تصدیق دنیا کے بہت بڑے تخلیقی حکیم ماسٹر نکولس رورک نے کرلی ہے - اس نے فطرت اور انسانیت کے رموز صاف کر کے رکھدئے ہیں اور پردے سے گزر کر حیات جاوید کا نظارہ کر لیا ہے - اس نے زندگی کے اندر کامل '' آنندم '' کو دیکھا ہے ' وہ '' آنندم '' نہیں جو دنیاوی مخلوق ہے بلکہ جو '' بھوما '' یا لا محدودیت کی چیز ہے اسے عظیم‌الشان تصورات اور روحانی تحریکات کا ایک خزانہ کہنا چاہئے ' ایک نادر زندہ طاقت جو سنجیدہ خیالات و تہذیب کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو '' -

جو لوگ رورک کی زندگی سے واقف ہیں اور جنہوں نے اس کے کاموں کا مطالعہ کیا ہے ' اس خراج تحسین کو بہت ہی بجا و معقول پائنگے - برفستانی چوٹیوں سے جو شیفتگی رورک کو ہے وہ اس کے متعدد بیانات سے واضح ہوتی ہے - اسکا ایک ٹکڑا یہاں پیش کیا جاتا ہے -

'' سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ مقدس لوگوں کے رہنے کے مقامات پہاڑوں کی جوٹیاں ہیں - انہیں چوٹیوں سے ان پر الہامات نازل ہوتے ہیں - گپھاؤں اور پہاڑوں کے چوٹیوں میں رشی لوگ رہتے تھے - جہاں دریاؤں کا سرچشمہ ہے ' جہاں دوامی برف نے ہوا کی صفائی محفوظ رکھی ہے

اور جہاں شہاب ثاقب کا غبار دور دراز عالم سے ایک مصفا زرہ اپنے ساتھ لاتا ہے یہیں سے طلوع کی دمک بھی نمایاں ہوتی ہے ' اسی طرف انسانی روح کا اضطراب رہنمائی کرتا ہے ' کوہستانی راستے باوجود دشوار گزار ہونے کے کس قدر کشش رکھتے ہیں - یہیں غیر متوقع امور واقع ہوتے ہیں - یہیں لوگوں کے خیالات اس آخری و بے پایاں ہستی کیطرف جذبش میں آنے لگتے ہیں " -

اُن غیر متناہی تاثرات کا جن کا اکتساب وہ ہمالیہ سے کیا کرتا ہے اس حسن کار کے سطور بالا سے ہمیں صاف صاف اندازہ ہو سکتا ہے - اُس نے بے شمار رنگوں میں ہمالیہ کے شاندار جلووں اور اسکے نمناک سناٹے کی تصویریں تیار کی ہیں -

(۹)

رورک کے حالات اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتے جب تک اسکے شہرۂ آفاق " پرچم امن " کا ذکر نہ کیا جاے اس حسن‌کار کی یہ سعی کہ تمام عالم میں امن قائم ہو اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس کے حسن‌کارانہ کمال اور سر گرمیوں میں وسعت و ہمہ گیری پیدا ہوگئی ہے - عالم انسانی کی تہذیب کے خزانوں کی حفاظت کا خیال اسے ابتداے کار ہی میں پیدا ہوا تھا ' اس نے ۱۹۰۴ ع میں سوسائٹی آف ارکیٹک اینڈ آرٹ کے سامنے اپنے اس خیال اور تجویز کو پیش کیا تھا اور اکثر ریاستوں کی یادگاروں کی قابل افسوس حالت کی جانب توجہ دلائی تھی - قدیم خانقاہوں کو دیکھکر اور تاریخی مقامات کی بے شمار سیاحتوں سے اسکے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ تہذیب و شایستگی کے ان قابل قدر ذخیروں کی حفاظت نہایت ضروری ہے - ۱۹۱۴ ع میں جب کہ بہت سی تاریخی یادگاریں نیست و نابود ہوگئیں اس نے ایک رپورٹ گرینڈ ڈیوک

نکولس کی خدمت میں پیش کی لیکن اس کے بارے میں جنگ کے باعث کوئی قابل ذکر تدبیر عمل میں نہ آسکی - آخر کار وسط ایشیا کی مہم کے بعد ۱۹۲۹ع میں اس نے اقوام عالم کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دنیا کے علوم و حسن‌کاری کے خزانوں کے تحفظ کے لئے ایک بین‌الاقوامی اتحاد کی بنیاد قائم کی جائے " اس تجویز کو قانونی شکل میں ڈاکٹر جارجز کلمور ڈاکٹر آف لاز پیرس یونیورسٹی نے پیش کیا -

۱۹۳۰ ع میں بین الاقوامی اتحاد کی یہ تجویز لیگ آف نیشن جنیوا کی میوزیم کمیٹی میں پیش ہوکر منظور ہوگئی رورک نے ایک " پرچم امن " تیار کیا جس میں تین کروں کا ایک دائرے میں مظاہرہ کیا گیا ہے ' پس منظر سفید ہے ' یہ پرچم اسلئے تیار کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے خزانۂ شائستگی کی ' جنگ و صلح کے زمانے میں حفاظت کی جائے - جس عمارت پر یہ پرچم لہرا رہا ہو وہ صلح کی اصطلاح میں غیر جانبدارا حصۂ ملک سمجھا جائے اور یہ کہ لڑنے والوں کا یہ فرض ہے کہ اُسے محفوظ رکھیں -

صرف زمانۂ جنگ ہی میں نہیں بلکہ زمانۂ امن میں بھی ان خزانوں کو محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس طرح کی بے شمار یادگاریں لوگوں کی غفلت و بے پروائی سے نیست و نابود ہوگئیں -

اس مفاہمے یا اس صلح نامے پر بیس سے زیادہ قوموں نے اپنے دستخط کردئے ہیں اور اس بلند و شریفانہ غرض کی حوصلہ افزائی کی ہے - تین بین‌الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوچکی ہیں اور رورک کی اس تجویز صلح سے معاون ہو چکی ہیں ' صلح کی یہ غرض ' یہی نہیں کہ صرف ترقی کر رہی ہے بلکہ اس ترقی سے ہمارے قلوب ' امیدوں اور

مسرتوں سے لبریز ہوے جاتے ہیں - پہلی ' دو کانفرنسیں بلجیم کے مقام بروگس میں ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۲ع میں منعقد ہوئیں - آخری کانفرنس گذشتہ نومبر میں ممالک متحدہ امریکہ کے شہر واشنگٹن میں منعقد ہوئی اور بتیس قوموں کے نمائندے اس میں شریک تھے جو یا تو اس صلح نامے پر دستخط کرنے والے تھے یا اس مسئلہ پر غور و مطالعہ کرنے والے -

اپنے اس پیام امن پر روورک کا یقین روز بروز بڑھتا جاتا ہے جیسا کہ ذیل کی اِن سطروں سے جو اسلے واشنگٹن کانفرنس میں بحیثیت پیام روانہ کی تھیں ظاہر ہوتا ہے -

" اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانیت اب تردید اور مشغلۂ تخریب و وحشت سے تنگ آگئی ہے - حقیقی تخلیق ' انسانی روح کی بنیادی صفت ہے ' ہماری زندگی میں ہر ایسی چیز کو جو روح کو رفیع و شریف بنانے میں معین ہو ایک مقتدر درجہ ملنا چاہئے صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ تہذیب کے لئے غیر نزاعی اور ضروری جہد و سعی راستبازی ہے ' بلکہ ہمیں چاہئے کہ تمام عالم کے امن و صلح کے لئے ایک بار دست دعا بھی بلند کریں - جس طرح ہلال احمر انسان کی جسمانی صحت کا معین ہے اسی طرح انسان کی روحانی صحت کا " پرچم امن " حامی ہو " -

(۱۰)

جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے ' روورک کے حالات اور اسکے کارنامے یقیناً نامکمل رہینگے ' صرف اسلئےنہیں کہ اسکا تخلیقی عمل اس درجہ مختلف ' متنوع اور اتنا کثیر ہے بلکہ اسلئے بھی کہ روزانہ اسمیں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اسطرح بلند سے بلند تر مقامات پر پہونچتا جارہا ہے ' کلاؤس بریگڈن مشہور امریکن مصنف لکھتا ہے کہ :-

روس کا صاحب خدمت بزرگ.

(بہ اجازت پروفیسر رورک)

مادر امن .

(بہ اجازت پروفیسر رورک)

" فنون لطیفہ کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً ایسی شخصیتیں نمودار ہوتی رہی ہیں جنکا عمل بے نظیر و عمیق ہوا ہے اور اُس میں دراصل اعجوبگی کے صفات موجود تھے ۔ اور یہی چیز تھی جس نے انکو اپنے معاصرین میں ممتاز بنادیا - ایسے لوگوں کو کسی قسم معلوم میں داخل کرنا یا کسی خاص اسکول سے نامزد کرنا ناممکن ہوتا ہے ' اسلئے کہ وہ اپنے خود (یا صرف باہم) ہی مماثل و مشابہ ہوتے ہیں - ان میں لیونارڈو ڈاونسی ' رمبرنیڈت ' ڈیورر ' اور بلیک تھے اور دوسرے میدانوں میں بیتھوون اور بالزک تھے روورک نے اپنی زندگی ' اپنی حیثیت اور حسن کاري کے لحاظ سے یہ نمایاں کردیا کہ وہ اسی برادری کا ایک فرد ہے - "

روورک مستقبل کے متعلق ایک غیر محدود یقین و اعتماد رکھتا ہے ' وہ لکھتا ہے :

" مستقبل کا وجود ہے ' اور اسی لئے ہم لوگ یہاں آئے ہیں ' ہم لوگ یہاں ایک دوسرے کی توہین یا تخویف کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ ادھر سے ادھر نے کی غرض یہ ہے کہ باہم مل کر کام کریں ' اور علم و روشنخیالی حاصل کریں " -

کوئی شک نہیں کہ مستقبل میں یہ انعامات پوشیدہ ہیں ' اور یہ اُمید کیجا سکتی ہے ' کہ جو تخم روورک نے اسوقت بویا ہے وہ وقت پورا ہونے پر ضرور برگ و بار لائیگا اور بونے والے کی شان و عظمت میں ازدیاد و اضافہ کریگا -

---

تعلیم تمدن اور مدرسہ[1]

(از خواجہ غلام السیدین - ایم - اے - ڈی)

فرد اور معاشرے کا تعلق

چونکہ تعلیم کا موضوع انسان کی سیرت اور اس کی زندگی کی تشکیل ھے اس لئے اسکے مطالعے کے لئے وسعت نظر کی خاص طور پر ضرورت ھے - انسان کی زندگی کی مثال سمندر کی سی ھے جسکو لکیریں کھینچکر یا لکڑی کے تختے لگا کر مختلف حصوں میں اسطرح تقسیم نہیں کیا جاسکتا کہ ایک حصہ کا دوسرے سے کوئی تعلق نہ ھو - جس طرح سمندر کی ھر موج اٹھتی ھے اور روانی کے ساتھہ پانی کی سطح پر کھیلتی ھوئی کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ھے' کہیں دوسری موجوں کے ساتھہ ملکر طوفان بپا کر دیتی ھے اور کہیں ھلکے سے تھپیڑے سے کشتی کو آگے بڑھا دیتی ھے ' اسی طرح جو اثر انسان کی شخصیت یا سیرت پر ڈالا جاتا ھے اس کے حدود متعین نہیں کئے جا سکتے - اول تو خود انسان کی شخصیت میں جسم اور دماغ عقل و روح اور حیوانی جبلتیں وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھہ وابستہ ھیں اور گرد و پیش کے حالات سے ایک ساتھہ متاثر ھوتی ھیں - دوسرے انسان تنہا بطور ایک فرد واحد کے زندگی بسر نہیں کرسکتا بلکہ اور افراد کے ساتھ مل جل کر رھتا ھے اور معاشری کاروبار اور مشاغل میں حصہ لیتا ھے - معاشرت کا تعلق ھماری زندگی سے اس قدر گہرا اور لازمی ھے کہ انسانوں کی وہ حالت جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے کی شکل میں وابستہ نہ ھوں ھمارے تصور سے باھر ھے - سچ پوچھئے تو

---

۱ - خواجہ صاحب کی ایک کتاب ' اصول تعلیم ' کے نام سے اکیڈیمی کی طرف سے شایع ھو رھی ھے - یہ مضمون اسی کا ایک ٹکڑا ھے - مدیر

معاشرے کا رکن ہونا ہی انسان کو انسان بناتا ہے - اس کے بغیر اس کی ذہنی اور روحانی قوتوں کی پوری نشو و نما ہو ہی نہیں سکتی - اگر ہم اپنے مشاغل کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن کا مقصد اور معنی سمجھنے کے لئے ہمیں ہر قدم پر معاشرے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ہماری تجارت، ہماری صنعت و حرفت ، ہمارا نقل و حمل غرض وہ تمام کام جنکے ذریعے ہم اپنی زندگی کی ضروریات بہم پہونچاتے ہیں افراد کے اشتراک عمل پر منحصر ہیں - اگر لوگ مل جل کر ان کاموں کو انجام نہ دیں تو ایک دن میں معاشرے کا بنا بنایا نظام درہم برہم ہو جائے - کارخانے کے مزدوروں کی ایک معمولی سی ہڑتال اس حقیقت کو نہایت موثر انداز میں ہم پر واضح کر دیتی ہے - لیکن فرد اور جماعت کا تعلق اس سے بھی زیادہ گہرا ہے - انسان کی ذہنی اور روحانی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جسکے لحاظ سے بہ ظاہر وہ بالکل تنہا ہوتا ہے اور صرف اپنے ذاتی خیالات ، جذبات اور عقائد کی دنیا میں رہتا ہے جہاں کسی دوسرے شخص کا گذر نہیں - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو '' روح کی اس خوفناک تنہائی '' میں بھی ہم حقیقت میں تنہا نہیں ہوتے - ہماری اندرونی زندگی بھی اپنی تشکیل کے لئے دوسرے لوگوں کے خیالات ، جذبات اور معاشری تعلقات کی محتاج ہے اور ہمارے دل کے پوشیدہ ترین خیالات کا نظام بھی محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر ان تجربات اور احساسات سے وابستہ ہے جن کو ہم بغیر دوسرے لوگوں کی مدد کے حاصل نہیں کرسکتے - اسی وجہ سے شاعر نے کہا ہے کہ :

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھہ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھہ نہیں

معاشری زندگی کا مفہوم

ہم نے مندرجہ بالا عبارت میں " افراد کی زندگی اور معاشرے کی زندگی " کے الفاظ استعمال کئے ہیں یہ الفاظ کسی قدر تشریح طلب ہیں - زندگی سے یہاں ہماری مراد صرف وہ جسمانی زندگی نہیں جس کا مدار سانس کی آمد و رفت پر ہے جو ہم میں اور تمام حیوانوں میں مشترک ہے - یہاں ان الفاظ کے مفہوم میں افراد اور جماعتوں کے وہ تمام تجربات ' کارنامے ' ذہنی اور علمی کمالات اور سیرت کی خصوصیات شامل ہیں جو ہر فرد اور ہر جماعت کو باقی تمام افراد اور جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں - اس لئے جب ہم کسی خاص معاشرے یا کسی جماعت کی زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو اُس سے ہماری مراد ہوتی ہے اُس کا رسم و رواج ' مذہب ' علوم و فنون ' اقتصادی اور سیاسی مشاغل ' خانگی زندگی کے اصول اور قاعدے جن پر نہ صرف اس کی حیات محض کا دار و مدار ہے بلکہ وسیع تر معنی میں اُس کی زندگی کی تکمیل اور ترقی کا بھی انحصار ہے - ہر جماعت باوجود افراد کے فنا ہوجانے کے اس طرح قائم رہتی ہے کہ معینہ تدبیروں کے ذریعے سے اپنے سارے ذہنی اور تمدنی سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی رہے - اس کی روز افزوں ترقی کا راز یہی ہے کہ ایک تو وہ اپنے تمام علمی اور عملی مشاغل میں پوری جدوجہد سے کام لے اور دوسری طرف ایسے ادارے ترتیب دے جن کے ذریعے سے ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسلوں کے خزانوں پر قابض ہو کر ان کی مدد سے ترقی کے میدان میں اور آگے قدم بڑھا سکے -

غرض معاشرے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے قیام اور اپنی بقا کے لئے ایسی تدابیر عمل میں لائے جن سے افراد سہولت اور کامیابی کے ساتھ اتفاق

و اتحاد کی زندگی بسر کر سکیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف ایسے نظام اور ادارے قائم ہیں جن میں شریک ہوکر ہم اپنی قوتوں کو مناسب اور موثر طریقے پر استعمال کرتے ہیں اور اپنی محنت اور جد و جہد کے نتائج کو مستقل شکلوں میں محفوظ رکھتے ہیں - یہ ادارے کسی عارضی مقصد یا مصلحت کی خاطر قائم نہیں ہوے بلکہ انسان کی فطری ضرورتوں پر مبنی ہیں - اس میں شک نہیں کہ بہت سی مصلحتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو ان کی اہمیت کو اور نمایاں کر دیتی ہیں - لیکن بغیر فطرت انسانی کے تقاضے کے یہ انتظامات ' اگر کئے بھی جاتے ' تو قائم نہ رہتے - مثال کے طور پر خاندان کو لیجئے جو تمام عمرانی جماعتوں میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ پائدار جماعت ہے ' اس کی ابتدا یوں نہیں ہوئی کہ افراد نے تجربے سے معلوم کیا ہو کہ خاندان کی زندگی بسر کرنے میں خاص فوائد اور آسائشیں ہیں جو تنہائی کی زندگی میں ممکن نہیں اور اس تجربے کی بنا پر انہوں نے اپنی تنظیم ' خاندانوں کی شکل میں کر لی ہو - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خاندان کی بنیاد اس فطری محبت پر قائم ہے جو قدرتاً والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور جس کا اظہار حیوانوں کی زندگی میں بھی ہوتا ہے - ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو بالکل بے کس اور بے بس ہوتا ہے - اس کی زندگی ہر قدم پر والدین کی خبر گیری اور نگہداشت کی محتاج ہے - اس خبر گیری کا مستقل انتظام کرنے کے لئے قدرت نے والدین میں محبت کا جذبہ ودیعت کیا ہے - جو ان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ بچے کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں اور خود تکلیفیں جھیل کر اس کو آرام پہونچائیں بنی نوع انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے قدرت کا یہ انتظام لازم تھا - اس کے بغیر انسانی زندگی اور تمدن کی موجودہ تشکیل ممکن ہی نہیں

تھی - لیکن خاندانی زندگی کا محض یہی فائدہ نہیں کہ بچوں کی پرورش کی جائے اور ایک نسل دوسری نسل کو زندہ رکھنے کا انتظام کرے - عمرانی زندگی کا ایک عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی ادارہ کسی خاص مقصد کے لئے قائم ہوتا ہے تو اس کی جد و جہد کے دوران میں بہت سے نئے اور ضمنی لیکن نہایت اہم نتائج پیدا ہو جاتے ہیں - یہی خاندان جو ابتدا میں محض بچوں کی جسمانی خبر گیری کا کام کرتا تھا رفتہ رفتہ ان کی تمدنی ' اخلاقی اور اقتصادی تربیت کا گہوارہ بن جاتا ہے - اس کے مقاصد زیادہ وسیع ' اس کے باہمی روابط زیادہ مستحکم اور اس کے فرائض زیادہ متنوع ہوجاتے ہیں - اس کا کام محض یہی نہیں رہتا کہ حیات موجودہ کو قائم رکھا جائے بلکہ اسے یہ آرزو پیدا ہوتی ہےکہ حیات برتر کی بنیاد ڈالی جائے - خاندان کے افراد آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں اور کاموں کو تقسیم کر کے اپنی کار کردگی کو بڑھاتے ہیں - وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لیتے ہیں اور ان کو نہ صرف وہ کام اور وہ عادتیں سکھاتے ہیں جن کی مدد سے انہیں آئندہ چل کر اپنی روزی کمانی ہوگی - بلکہ عمل مثال اور زبانی تعلیم کے ذریعہ ان اصول اور اخلاق سے بھی آگاہ کرتے ہیں جو اس خاندان میں چلے آتے اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کے عمدہ رسوم و روایات اور پسندیدہ اصول زندگی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو کر مستقل صورت اختیار کرلیں - اسی وجہ سے خاندان تعلیم و تربیت کا سب سے قدیم اور غالباً سب سے زیادہ اثر آفریں مرکز ہے اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کی اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ضروری ہے - ہم اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئندہ میں بحث کرینگے - یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح ایک

معاشری ادارے کا ' جو کسي محدود اور مخصوص مقصد کے لئے قایم ہوتا ہے ' حلقۂ عمل وسیع ہوجاتا ہے - بعض لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ انسان بالطبع معاشرت پسند ہے اور دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنا اس کي فطرت کا اٹل قانون ہے - ان کا خیال ہے کہ ابتدا میں انسان بھی بعض جانوروں کي طرح تنہائي کي زندگی بسر کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کو عقل اور تجربے کي مدد سے معاشری زندگی کے فوائد کا احساس ہوا اور انہوں نے مختلف معاشرتی ادارے قایم کیے - اس نقطہ نظر کو امریکہ کے دو مفکرین ڈیلے (Dealey) اور وارڈ (Word) نے اپنی کتاب " درس عمرانیات " (Text Book of Sociology) میں پیش کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" انسان بالطبع معاشرت پسند نہیں ہے - معاشرہ اس کی عقل کي جد و جہد کا نتیجہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کے دماغي ارتقا کے ساتھ صورت پذیر ہوا - بہ الفاظ دیگر ' معاشرے کي بنیاد اس طرح پڑی کہ انسان نے اُس کے فوائد کو محسوس کیا اور جوں جوں یہ فوائد عقل پر ظاہر ہوتے گئے (عقل ہي ایسي قوت ہے جو ان کو سمجھ سکتی ہے) معاشرے کا نظام ظہور میں آتا گیا "

اگر ہم اس خیال کو صحیح مانیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ ایک عارضي گروہ بندي کا نام ہے جو چند مخصوص فوائد کے حصول کے لئے قایم ہے اگر ان فوائد کا حاصل کرنا انسانوں کے لئے ضروری نہ رہے تو اس کا شیرازہ بکھر جائیگا اور انسان پھر اسی اِنفرادی زندگی کی طرف رجوع کریںگے جو اس خیال کے مطابق شروع میں تھي - اس نقطہ نظر

میں بڑی غلطی یہ ہے کہ اس میں عمرانی زندگی کے اصل اصول اور اُس کی تشکیل کے مختلف طریقوں میں تمیز نہیں کی گئی - ان دونوں مصنفوں نے یہ نہیں سمجھا کہ عمرانی زندگی کی بنیاد انسانی فطرت کے اس جذبے پر قائم ہے جس کے اظہار کی سب سے زیادہ پائدار اور سادہ شکل ماں اور بچے کی محبت ہے اور جو وسیع ہوکر تمام عالم کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیتی ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ مخصوص طرز جو عمرانی زندگی اختیار کرتی ہے مختلف حالات کا نتیجہ اور مختلف فوائد کے حصول کا ذریعہ ہیں -

معاشری ماحول میں تربیت نفس

بہر حال خواہ سوسائٹی کی ابتدا کسی طرح بھی ہوئی ہو اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی بنیاد نہایت مضبوطی کے ساتھ عمرانی زندگی پر قائم ہے - اور انسان بچپن ہی سے مختلف تمدنی اداروں اور نظاموں کا رکن بن جاتا ہے - کامیاب زندگی کا بڑا معیار یہی ہے کہ انسان پر ان تمام اداروں کی رکنیت کی وجہ سے جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو عمدگی کے ساتھ ادا کرے اور جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان سے پورا فائدہ اُٹھائے - ان اداروں میں شرکت کرکے اسے اپنی قوتوں کے اظہار اور نشو و نما کا موقع ملتا ہے اور وہ حقیقی معنی میں انسان بن جاتا ہے - پیدائش کے وقت آدمی محض جسمانی شکل و صورت اور جبلتوں کے اعتبار سے انسان ہوتا ہے - عمرانی اور اخلاقی اعتبار سے انسانیت کے مرتبے تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر شخص ایک مسلسل اور منظم جد و جہد کے ذریعے اپنی شخصیت کی تشکیل و تربیت کرے - اس جد و جہد کی نگرانی بچپن اور نوجوانی میں والدین

لور استاد اور معاشرے کے مختلف ادارے کرتے ہیں اور بلوغ کے بعد خود انسان اپنا رہنما اور محتسب بن جاتا ہے ۔ انسانی شخصیت کوئی بنی بنائی چیز نہیں جو قدرت کی طرف سے ہر شخص کو ملتی ہو بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا تخلیقی کارنامہ ہے جس کو انجام دینے کے لیے فرد اور جماعت کی قوتوں میں اشتراک عمل کی ضرورت ہے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) جو امریکہ کے سب سے بڑے تعلیمی مفکر ہیں ' اپنی کتاب ''فلسفہ کی تعمیر نو'' (Reconstruction in Philosophy) میں لکھتے ہیں کہ :

> '' انفرادی سیرت سے مراد ہے جدت ' ایجاد ' تدبیر کا مادہ اور اعمال و عقائد کے معاملے میں ذاتی انتخاب کی ذمہ داری اور یہ سب چیزیں فطرت کا عطیہ نہیں ہیں انہیں حاصل کرنا پڑتا ہے'' [1]

اس کا آخری جملہ قابل غور ہے - شخصیت کے حصول کے لئے پیہم اور مستقل کوشش کی ضرورت ہے اور یہ اسی حد تک حاصل ہوتی جاتی ہے جس حد تک انسان کوشش کرکے اپنی جبلتوں اور صلاحیتوں کو تربیت دیتا ہے اور ان کو ہم آہنگ کرکے اپنی ذات میں قوت اور سکون اور توازن پیدا کرتا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ انسان یہ کوشش تنہائی میں رہ کر نہیں کر سکتا - اس کی کوششوں کی جولان گاہ بننے اور ان میں معنی اور مقصد پیدا کرنے کے لئے عمرانی زندگی کی ضرورت ہے کیونکہ اسی میں وہ مختلف قسم کے مواقع پیدا ہوسکتے ہیں جو افراد کی قوتوں کو ابھارتے ہیں اور ان کو دعوت عمل دیتے ہیں - بچہ کی جبلتوں کی ابتدائی شکل بالکل غیر معین ہوتی ہے - ان کو اظہار کی خواہش

۱-صفحہ ۹ -

ہوتی ہے لیکن فطرت کی طرف سے اُن کے لئے کوئي خاص طریقے اظہار کے معین نہیں ہوتے - یہ بچہ کے ماحول اور مشاغل پر منحصر ہے کہ وہ اپني کسی خاص جبلت ' مثلاً تجسس یا ملکیت کو کسي طریقے پر ظاہر کرتا ہے - ممکن ہے کہ وہ بڑا ہوکر تجسس کا اظہار اس طرح کرے کہ دوسرے لوگوں کے بھید معلوم کرنے کي فکر میں رہے اور غیر متعلق اور فضول افواہوں سے دلچسپي لے - یا عمدہ نگراني اور ہدایت کے ذریعہ اس قوت کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ بڑا ہو کر علمی' تحقیق و تفتیش اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے اپنی اس جبلت کو تسکین دے - اس کا انحصار زیادہ تو اس امر پر ہے کہ گھر اور مدرسے میں بچے کو ایسے مشاغل میسر آتے ہیں یا نہیں جن کے ذریعے وہ ان جبلتوں سے عمدہ اور معاشرتی نقطہ نظر سے مفید طریقے پر کام لے سکے - برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) اپنی کتاب " تعلیم " میں بچوں کی جبلت کی تربیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" غرض تعلیم کا گر جہاں تک اسکا تعلق سیرت کي تشکیل سے ہے یہی ہے کہ طلبہ کو ایسے کام اور ہنر سکھائے جائیں جن کے ذریعے سے وہ اپنی جبلتوں کو بطریق احسن استعمال کر سکیں - اظہار قوت کی جبلت جس کو بچہ نو عمری میں بھونڈے طریقے سے نیل ریش[1] کي نقل اتار کر ظاہر کرتا ہے بڑی عمر میں زیادہ موزوں اور معقول صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً سائنس کی تحقیقات میں ' آرٹ کي تخلیق میں یا بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت

---

[1] - Bluebeard - ایک فرضی شخص جسکی کہانی مشہور ہے کہ وہ بہت سی عورتوں سے شادی کرتا تھا اور انہیں قتل کر دیتا تھا -

میں یا اسی قسم کے اور ہزاروں مشغلوں میں سے کسی
ایک میں - اگر کسی شخص کو لڑنے کے سوا اور کچھہ بھی
نہیں آتا تو اس کے عزم للقوۃ کی تسکین صرف جنگ و
جدل ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے - برخلاف اس کے اگر اس
کو اور بھی بہت سے کام آتے ہیں تو اسے ان میں اظہار
خودی کرکے مسرت حاصل ہوگی......اگر موقع ملے تو
میں مدرسے کے لڑکوں اور لڑکیوں کو طوفانی سمندروں میں
جہاز چلانا ' بلندی سے پانی میں غوطہ لگانا ' موٹر اور
ہوائی جہاز چلانا سکھاؤں - میں انہیں اونڈل کے پبلک
اسکول کے ہیڈ ماسٹر سینڈرسن (Sanderson) کی
طرح مشینیں بنانا اور سائنس کے تجربات کی خاطر اپنی
جان خطرے میں ڈالنا سکھاؤں اور جہانتک ممکن ہو
فطرت کی قوتوں کو اُن کے سامنے حریف مقابل بناکر
پیش کروں[1] "

اس مقولے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ افراد کی نشو و
نما میں جماعت کا حصہ کس قدر زیادہ ہے اور وہ اپنی قوتوں کو مناسب
شکل اسی وقت دے سکتے ہیں جب یہ قوتیں عمرانی مقاصد کو پیش
نظر رکھہ کر استعمال کی جائیں - نظریہ تعلیم میں اس اصول کی بڑی
اہمیت ہے اور ہم کسی آئندہ موقع پر اس کے نتائج سے بحث کرینگے اور
بتائینگے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے مدرسے کی علمی تعلیم میں کیسی
انقلاب انگیز تبدیلیاں لازم آتی ہیں اور نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں
کن بنیادی تغیرات کی ضرورت پڑتی ہے - یہاں اتنا بتادینا کافی ہے کہ اگر

---

۱ - صفحہ ۱۰۵ -

کسی جماعت کو مختلف قسم کے مشاغل کے مواقع حاصل نہ ہونگے تو اس کی عمرانی زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہوگا اور اس کے افراد کی نشو و نما بھی محدود رہے گی - انسانوں کا باهمی تعلق اور ان کی جماعت بندی خواہ کسی مقصد سے اور کسی شکل میں ہو ان کے ارتقاء پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتی - جس حد تک ہم ان تعلقات کو جو کسی جماعت کی رکنیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں منظم کرینگے یہ اثر زیادہ نتیجہ خیز اور بہتر ہوگا اور جس قدر ان کے افراد میں باهمی اشتراک عمل ہوگا اتنی ہی ان کی زندگی میں خیال اور عمل کی آزادی زیادہ ہوگی -

نتیجہ یہ نکلا کہ تمام عمرانی اداروں کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ افراد کو وسیع ترین معنوں میں تعلیم دیں اور ان کی شخصیت کی تشکیل کریں تاکہ وہ اپنی مختلف فطری قوتوں کو اس طرح استعمال کرسکیں کہ خود ان کو بھی فائدہ پہنچے اور معاشرے کو بھی - لیکن یہ ان اداروں کا ''مقصد اعلیٰ'' ہے جس کا ہمیشہ ان کے اراکین کے پیش نظر رہنا ضروری نہیں - ان کے فوری مقاصد جو ان کے عمل پر زیادہ موثر ہوتے ہیں بالعموم دوسرے ہوا کرتے ہیں - مثلاً انسان جو پیشہ اختیار کرتا ہے اس سے اس کی طبیعت اور مزاج پر اثر پڑتا ہے اور اس کی شخصیت پر ایک خاص رنگ چڑھ جاتا ہے - یہ بھی وسیع معنوں میں تربیت کا ایک جزو ہے لیکن یہ اثر بالعموم ان مشاغل کا ایک ضمنی نتیجہ ہوتا ہے - ممکن ہے اس اثر کا عام رجحان یہ ہو کہ وہ شخصیت کو زیادہ مکمل اور موثر بنائے - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی امکان ہے کہ اس سے پیشہ‌ور کی دلچسپیاں زیادہ تنگ اور محدود ہوکر رہ جائیں - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اکثر صنعت و حرفت کے کاموں میں تقسیم عمل اتنی زیادہ ہوگئی ہے اور

مشینوں کو اس قدر غلبہ حاصل ہوگیا ہے کہ کارخانوں کے مزدوروں میں تنگ نظری ' اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف سے بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے - پیشے کی طرح مذہب بھی وسیع معنی میں تربیت انسانی کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس تعلق کو جو خدا کے اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے واضح اور مستحکم کرتا ہے - غرض ان تمام اداروں میں تعلیم کا نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جو بلا واسطہ اور بالقصد اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی جسمانی اور دماغی قوتوں کی نشو و نما اور ان کی اخلاقی اور معاشرتی رجحانات کی تشکیل کا انتظام کرے - اور اس کی صورت یہ قرار دی گئی ہے کہ ان کو بچپن اور بلوغ کے زمانے میں ایسے ماحول میں رکھا جائے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو فعل میں لاکر دنیا کی زندگی میں کامیابی اور عمدگی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اسی نظام تعلیم کی مدد سے ہر نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو اپنے گوناگوں تجربات اور معلومات میں شریک کرتی رہے اور اسے آیندہ فرائض کی ادائگی کے قابل بنائے -

ماحول کی تخلیق میں انسان کا حصہ

هم دیکھتے ہیں کہ افراد کی زندگی کی طرح جماعتوں کی زندگی میں بھی ایک تسلسل قائم ہے - جس طرح حیات حیوانی کا سلسلہ توالد و تناسل کے ذریعے سے جاری رہتا ہے اسی طرح معاشرے کی زندگی کا تسلسل اس پیچیدہ نظام کے ذریعہ قائم رہتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جس سے ایک نسل اپنے تمام عملی اور اخلاقی کمالات اور فنون لطیفہ کے خزانوں کو دوسری نسل کی طرف منتقل کرتی ہے - ہم اپنے چاروں طرف جو ماحول دیکھتے ہیں وہ ہمارا عمرانی ورثہ ہے

اور ہمیں اپنی پیشرو نسلوں سے ملا ھے - اس ماحول کے بہت سے ادارے اور عناصر تو صریحاً ایسے ھیں جو انسانی صناعی اور خلاقی کا نتیجہ ھیں - مثلاً علم و ادب کے شاھکار ' فنون لطیفہ کے نمونے ' عمارتیں ' کارخانے اور اسی قسم کی تمام چیزیں جو انسان نے اپنی دماغی کاوش سے ترتیب دی ھیں یا ایجاد کی ھیں - لیکن وہ چیزیں بھی جو بظاھر فطرت کا عطیہ ھیں - ایک حد تک انہیں انسانی کوششوں کی مرھون منت ھیں اور ان کو بھی اسی عمرانی ورثے میں شمار کرنا چاھئے - ھم اپنے گرد و پیش جو دریا اور پہاڑ کھیت اور سڑکیں وغیرہ دیکھتے ھیں یہ سب بھی اپنی ابتدائی فطری حالت میں نہیں ھیں بلکہ انسان کی قوت تخلیق و تسخیر کے کارنامے ھیں جس نے زمین کی شکل و صورت تک کو بدل دیا ھے اور اس کی تمام پوشیدہ اور زبردست قوتوں کو ' جو ایک زمانے میں ضعیف انسان سے نبرد آزما رھتی تھیں ' قابو میں لاکر انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ھے -

اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان مکالمے کی شکل میں انسانی کوششوں کے اس اعجاز کو نہایت خوبی سے بیان کیا ھے - انسان خدا کو مخاطب کرکے کہتا ھے -

تو شب آفریدی ' چراغ آفریدم
سفال آفریدی ' ایاغ آفریدم
بیابان و کوهسار و راغ آفریدي
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم * من آنم کہ از زهر نوشینہ سازم

غرض اس ماحول سے جو ہمیں گویا ورثہ میں ملا ہے ' ہماری مراد ایک طرف تو مظاہر فطرت کی جامد دنیا ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف علوم و فنون ' اخلاق و سیاست کی نمو پذیر دنیا جو گذشتہ نسلوں کی دماغی جد و جہد اور تخلیقی کوششوں کا نتیجہ ہے اور جس کی ترقی ہماری اپنی مسلسل کاوشوں پر منحصر ہے - ہماری موجودہ زندگی کا ہر پہلو خواہ وہ عملی ہو یا نظری تمام تر اسی معاشرتی ورثے کا مرہون منت ہے جو ہم نے اپنے پیش رووں سے پایا ہے - ہمارے علوم اور ادب ہماری موسیقی اور مصوری ' ہمارا قانون اور سیاست ' ہمارے مدرسے ' ہماری صنعت و حرفت ؛ غرض ہر چیز اس منتظم اور تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے جس میں بے شمار افراد اور جماعتیں گذشتہ زمانوں میں حصہ لے چکی ہیں ' جن میں سے بعض کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اور اکثر کی کوششیں گمنامی کے پردے میں پوشیدہ ہیں - اس لحاظ سے یقیناً ہماری موجودہ نسل ان تمام نسلوں کے ترکے کی حامل ہے جو ہم سے پہلے گذر چکی ہیں اور ہم تہذیب و تمدن کے ارتقائے پیہم میں اپنی کوششیں اس منزل سے شروع کرتے ہیں جہاں سے گذشتہ نسل نے اس کو چھوڑا ہے - اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ ہر بچہ تمام گذشتہ زمانوں کا وارث ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کبھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ حال کا ایک جز و لازم بن کر مستقبل کی تعمیر میں نہایت اہم حصہ لیتا ہے - ہم ماضی کے بوجھ کو اپنے شانوں سے اُٹھا کر اس طرح نہیں پھینک سکتے جس طرح ایک مزدور اپنے بوجھ کو پھینک دیتا ہے کیوں کہ اس کا اثر ہمارے رگ و ریشے میں ' ہمارے قلب و دماغ میں خوں کی طرح سرایت کرچکا ہے - یہ اور بات ہے کہ ہم گذشتہ زمانے کے خیالات یا رسم و رواج کی مخالفت کریں ' اس کی برائیوں کے خلاف جنگ کریں اور

اپنے لئے نئی شاہراہ عمل کی بنیاد ڈالنا چاہیں - لیکن اس جنگ میں ہم جس قدر ذہنی اور مادی آلات اور وسائل کا استعمال کرتے ہیں وہ بھی تمام تر اسی زمانہ ماضی کا عطیہ ہوتے ہیں ! قدامت پسندی اور جدت پسندی میں یہ فرق نہیں کہ قدامت پسند ماضی کے ساتھہ وابستہ ہوتا ہے اور جدت پسند اس سے آزاد - وابستہ دونوں ہوتے ہیں اور اس سے مدد لئے اور فائدہ اُٹھائے بغیر دونوں کو چارہ نہیں - فرق صرف نقطہ نظر کا ہوتا ہے کہ اس معاشرتی ورثے کو جو انہیں ملا ہے کس طرح استعمال کریں - آیا اپنی علمی اور عملی قوتوں کو محض اپنے بزرگوں کے کارناموں کی تشریح اور تفسیر اور حفاظت میں صرف کریں - یا ان کارناموں پر خود اپنے ارتقاء پذیر تجربے کی بنیاد رکھیں اور ان میں اپنی عقل سے اپنے زمانے کی روز افزوں ضروریات کے مطابق ترمیم اور تبدیلی عمل میں لائیں - بڑے سے بڑا سائنس داں ' فلسفی اور موجد بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا کہ دنیا کی پچھلی معلومات اور واقفیت سے فائدہ اٹھاکر مادی یا ذہنی مظاہر میں سے بعض کو لیکر انہیں ایک نئی ترتیب کے ساتھہ پیش کردے یا اُن کے مشاہدے سے ایسے قانون دریافت کرے جن کے سمجھنے سے اس سے پہلے کے صاحبان فکر سے قاصر رہے ہوں - اس لئے گو اسکی ایجاد یا دریافت کی قدر کتنی ہی زیادہ ہو لیکن وہ اپنی کامیابی کے لئے سراسر متقدمین کا محتاج ہوتا ہے - ایک انگریز مصنف اپنی کتاب[1] میں لکھتا ہے کہ :—

" اگر ہم کسی قابل ترین شخص کے کارناموں کا مقابلہ اس علمی دولت سے کریں جو اس کو ماضی سے وراثتاً ملی ہے اور جس کی وجہ سے وہ اپنا کام کر پایا تو اس کے کارنامے مقابلتاً بالکل ہیچ معلوم ہوتے ہیں -

---

1 - Brown Underlying Principles of Modern legislation صفحہ ۲۱۱

تعلیم و تہذیب کے نقطۂ نظر سے یہ تمدنی ورثہ بھی ہمارے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا وہ جسمانی اور نفسی ورثہ جو ہم اپنے آبا و اجداد سے براہ راست حاصل کرتے ہیں ہماری دماغی نشو و نما کے لئے یہ دماغی عطیہ اسي قدر ضروري ہے جس قدر جسمانی صحت کے لئے تازہ ہوا اور صاف پاني بالڈون (Baldwin) اس مسلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

" بچہ بالکل اسی طرح معاشرتی تعلقات کے نظام کے اندر پیدا ہوتا ہے جس طرح وہ کرہ ہوا کے اندر پیدا ہوتا ہے - جس طرح ہوا میں سانس لے کر اُس کا جسم بڑھتا ہے اسی طرح اس عمرانی ورثے کو جذب کرنے سے اس کی دماغی نشو و نما ہوتی ہے[1] "

معاشرتی ورثے سے مستفید ہونے کے لئے تعلیم کی ضرورت

لیکن انفرادي جسمانی اور اجتماعی تمدني ورثے میں ایک نہایت اہم فرق ہے جن کو ذہن نشین کرنا فلسفۂ تعلیم کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے - جسمانی ورثہ بھی تمدنی ورثہ کی طرح ہر انسان کو ملتا ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے یا اس پر قابو پانے کے لئے کسي خاص جد و جہد کی ضرورت نہیں - وہ خصوصیتیں اور جبلتیں جو بچے کو اپنے ابا و اجداد کی طرف سے وراثتاً ملتی ہیں رفتہ رفتہ طبعی حالات میں ، خود بخود ظاہر اور پختہ ہوتي جاتی ہیں - یہ سچ ہے کہ جبلت کے اظہار کے لئے کسی تحریک کي ضرورت ہوتی ہے لیکن اس قسم کی مناسب تحریکیں ہر حیوان کے ماحول میں موجود ہوتي

---

1 - ملاحظہ ہو : Social and Ethical Interpretations

ہیں - بچے میں غذا حاصل کرنے کی جبلت ہوتی ہے چنانچہ وہ بغیر کسی دقت اور پس و پیش کے ماں کا دودھ پینے لگتا ہے - اس کو نقل و حرکت کرنے ' کھیلنے ' چیزیں بنانے اور بگاڑنے ' انھیں اپنی ملک بنانے کی جبلی خواہش ہوتی ہے اور وہ اُن خواہشوں کو مناسب وقت پر اپنے ماحول کے اشیا کے ذریعے پورا کرتا ہے - لیکن تمدنی ورثے کا معاملہ زیادہ نازک ہے - یہاں محض قبضے کا نام ملکیت نہیں - اس کی تشریح ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتی ہے - کوئی کتاب اس وقت تک واقعی طور پر ہماری نہیں ہو سکتی جب تک ہم اپنی دماغی کاوش سے اس کا مطالعہ کرکے اس کے مضمون پر عبور حاصل نہ کر لیں - محض قیمت ادا کرنے سے وہ ہماری حقیقی ملک نہیں بن سکتی - وہ ایک خارجی چیز رہتی ہے اور صرف اسی معنی میں ہماری ملکیت ہے جس معنی میں مثلاً کوئی میز یا کرسی ہماری ملکیت ہوتی ہے - بلکہ میز کرسی پر بھی صحیح طور پر ملکیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس کا مناسب استعمال جانتے ہوں اور کرتے ہوں - جب معمولی مادی اشیا پر تصرف کے لیے خاص قسم کی اہلیت درکار ہے تو ظاہر ہے کہ وہ قیمتی اور گوناگوں ورثہ حاصل کرنے کے لیئے ' جس کا تعلق مادی اور ذہنی دنیا دونوں سے ہے ' ہم پر اور زیادہ سخت شرائط عائد ہوتے ہیں - ایک لحاظ سے یہ ورثہ ہر وقت ہمارے پاس ہے ' ہمارے چاروں طرف موجود ہے - ہم ہر قدم پر اُس کے اثرات دیکھتے ہیں - سائنس نے فطرت کی بیشتر قوتوں کو مسخر کرکے اُنھیں ہمارا غلام بنا دیا ہے ' ادب فلسفہ اور تاریخ نے ماضی ' حال اور مستقبل کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں ' فنون لطیفہ کے شاہکار ہر طرف نظر کو کھینچتے ہیں - معاشرتی زندگی کا وسیع اور پیچیدہ نظام ہمیں اس طرح گھیرے ہوئے ہے جیسے کرۂ ہوا -

لیکن یہ تمام چیزیں ہمارے لیے ایک مضمون سربستہ کے مانند ہیں جب تک ہم اس کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا نہ کریں - دنیا میں بہت سے آدمی ایسے ہیں جن کی آنکھیں ہیں مگر اندھے ہیں - یعنی بہت سی چیزوں پر اُن کی نظر پڑتی ہے - لیکن نہ وہ انھیں دیکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اُن سے کام لے سکتے ہیں - عالم رنگ اُن کے لیے کوئی وجود نہیں رکھتا - اسی طرح بہت سے آدمی ہوتے ہیں جن کے کان موسیقی سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں - اُن کے لیے بہترین نغمہ بھی خواہ وہ عالم فطرت میں پایا جائے یا انسانی تخلیق کا نتیجہ ہو ' بالکل بے معنی ہے - اسی طرح جس شخص کے ذوق حسن کی تربیت نہیں ہوئی وہ نہ مناظر فطرت کی خوبصورتی سے لطف اُٹھا سکتا ہے نہ مصوری اور فن تعمیر کے شاہکاروں سے محظوظ ہو سکتا ہے - یہی حال عمرانی زندگی کے نظام کا ہے جو صدیوں کی کوششوں اور تجربے سے وجود میں آیا ہے - اُس کے حقوق و فرائض سے آگاہی کے بغیر کوئی شخص اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا - مثلاً نظام بلدیہ کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے ہر شہری اپنی زندگی کو بہت آرام دہ اور مفید بنا سکتا ہے - لیکن ہندوستان میں کتنے فی صدی لوگ ایسے ہیں جو اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں یا اُٹھا سکتے ہیں ؟ ان کے لئے اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - متمدن ممالک میں جا بجا کتب خانے ' عجائب خانے ' مختلف قسم کے علمی جلسے اور نمائشیں منعقد ہوتی ہیں لیکن بہت کم لوگ وہاں جاکر اپنے علم ' ذوق اور تجربے میں اضافہ کرتے ہیں - لہذا اُن کے لیے یہ تمام چیزیں کوئی معنی نہیں رکھتیں - یہ سب اسی بیش بہا تمدنی خزانے کے اجزا ہیں جو ماضی نے حال کو وراثتاً دیا ہے اور جس میں ہماری کوشش اور ذہنی اجتہاد سے

روز بروز اضافہ ہو رہا ہے - لیکن جیسا کہ مندرجۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ تمام ورثہ باوجود اس کے کہ ہر وقت ہمارے سامنے موجود ہے در اصل گویا ایک سنگین عمارت میں بند ہے جس کے دروازے اس وقت تک نہیں کھل سکتے جب تک افراد کی دماغی اور معاشرتی نشو و نما مناسب طریقہ پر نہ کی جائے اور اُن میں اُن چیزوں کی قدردانی کی صلاحیت اور اُن کے استعمال کی قابلیت پیدا نہ ہو -

بچپن کے زمانے کی تعلیمی اہمیت

اس تمام بحث سے تعلیم کے معنی اور اس کی عمرانی اغراض پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب تک افراد کی تعلیم اور اُن کے فطری قوتوں کی نشو و نما کے لیے کوئی مناسب انتظام نہ کیا جائیگا وہ اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس سے کام لینے سے قاصر رہینگے اور زندگی کے کاروبار میں عمدگی کے ساتھ حصہ نہ لے سکیں گے - اگر ہم اسی مسئلے کے دوسرے پہلو کو دیکھیں یعنی بچے کی نفسی زندگی کا مطالعہ کریں تب بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کیونکہ تعلیم کا عمل افراد اور جماعت کے باہمی ربط اور تعلق پر منحصر ہے اور اُس کا کوئی نظریہ اُس وقت تک صحیح نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ اُس ترازو کے دونوں پلوں پر برابر نہ اُترے - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ تمام انسانی ادارں اور نظاموں کی بنیاد انسان کی فطرت اور جبلت پر ہے - یہی حال تعلیم کا ہے - اگر بچے میں شوق اور تجربہ حاصل کرنے اور اُسے برتنے کی قابلیت نہ ہوتی تو سرے سے تعلیم دینا ناممکن تھا - لیکن انسان کو تعلیم دینے کے لیے محض یہ جبلی قوتیں کافی نہیں - حیوانوں کے لیے اُن کی جبلت اور اُن کے گرد و پیش کی مفید اور مضر قوتیں معلم کا کام دیتی

هیں اور اُنھیں کی مدد سے وہ اپنی مقابلتاً محدود اور سادہ زندگی کا کار و بار انجام دینے کے قابل ہو جاتے ہیں - وہ کھیل کود کے ذریعے ' زیادہ تجربہ کار حیوانوں کی تھوڑی سی ہدایت سے اور زیادہ تر اُن جبلتوں کی بدولت جو انسانوں اور حیوانوں دونوں کے لیے محرک عمل ہوتی ہیں ' ضرورت کے مطابق اپنے ماحول کو سمجھ لیتے ہیں ' خوراک تلاش کرنا ' رہنے کے لیے کسی قسم کا گھر بنانا یا ڈھونڈنا ' اپنے دشمنوں اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے بچنا بقائے نسل کے فرائض ادا کرنا یہی چند چیزیں بالعموم اُن کا شغل زندگی ہوتی ہیں - اور اُن سب کو وہ آدمی کے بچے کی نسبت بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور بچپن کا زمانہ ختم کرکے اپنی نوعی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں - برخلاف اُس کے انسانوں کی تعلیم میں دو مشکلات ہیں - اول تو یہ کہ بچہ پیدائش کے وقت بالکل بے بس اور بے کس ہوتا ہے - وہ اپنی حفاظت اور پرورش کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور ہر بات میں ماں کا یا دوسرے لوگوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس کے بچپن کا زمانہ اور تمام حیوانات کے مقابلے میں زیادہ طویل ہوتا ہے - یہاں بچپن سے مراد وہ تمام زمانہ ہے جب تک مرد میں اِس قدر جسمانی اور دماغی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ خود اپنی زندگی کا رہنما بن سکے اور بحیثیت ایک آزاد شہری کے معاشرے کے مشاغل میں شریک ہو کر اپنے فرائض پورے کر سکے - انسانی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ انسان کا بچپن اور تمام حیوانات کی نسبت کیوں زیادہ مدت تک رہتا ہے - بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ' اور بعض لوگوں کا سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ہے ' کہ بچپن کا یہ تمام زمانہ ایک طرح سے اکارت جاتا ہے کیونکہ اس سارے عرصے میں بچہ اپنا

وقت اُن اهم انسانی مشاغل میں صرف نہیں کرسکتا جو اس کے شایان شان هیں- جارج برنارڈ شا (G. B. Shaw) اپنے ڈرامے " رجوع به میتھوسلا " (Back to Methuselah) میں ایک ایسے زمانے کی پیشین گوئی کرتا هے جب پیدائش هی کے وقت بچوں کی عمر سترہ سال کی هوگی یعنی وہ اُس زمانے سے گذر چکے هونگے جو اب نابالغی اور خام کاری کا سمجھا جاتا هے اور وہ تمام باتیں سیکھے سکھائے پیدا هونگے جو اب بہت مشکل اور محنت سے سیکھنا پڑتی هیں - اِس تخیل کے لطیفه سے قطع نظر کرکے 'جس کا اگر امکان بھی هوتا تو هرگز مفید نه هوتا ' غور کرنے سے یه معلوم هوتا هے که آدمی کے بچپن کا طویل هونا عین مصلحت هے - جانوروں کے لئے بہت مختصر سا بچپن کا زمانه ان تمام مشاغل کو سیکھنے کے لئے کافی هوتا هے جن سے اُن کو آئندہ سابقه پڑنے والا هے اور اس عرصه میں وہ اپنے کم و بیش محدود اور معین ماحول کی ضروری چیزوں سے واقف هوجاتے هیں - انسان کی حالت اُس سے مختلف هے اُس کا ماحول نه معین هے نه محدود - جوں جوں زمانه گذرتا گیا هے اُس نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی هے ' علوم و فنون میں کمال حاصل کیا هے ' مادی اور ذهنی نظام قائم کیے هیں - اس کی وجه یه هے که اس میں اور تمام حیوانات کی نسبت یه صلاحیت بہت زیادہ هے که گذشته تجربات سے فائدہ اٹھا کر نئے کاموں اور نئے مواقع سے زیادہ عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ هو سکے اپنی سیرت کو ضرورت کے مطابق ڈھالے اور اپنے طرز عمل اور طرز زندگی میں ترمیم اور اصلاح کرے - اس صلاحیت کی وجه سے ابتدائے آفرینش سے اب تک انسان کی ترقی جاری رهی هے اور اُس نے گذشته تجربات کے نتائج کو آئندہ کامیابی کے لئے استعمال کیا هے اس طرح هر نسل نے ' جیسا که هم دیکھ چکے هیں ' علوم و فنون

میں اضافہ کیا ہے اور تمدن کی مجسم یادگاریں چھوڑی ہیں - اس لئے انسان کے بچوں کو اپنے غیر محدود ' تغیر پذیر ' نمو پذیر ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے گذشتہ نسلوں کے صدیوں کے تجربات کو سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لئے خاص اہتمام کی اور طویل مدت کی ضرورت ہے - یہی خاص اہتمام تعلیم کہلاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے قدرت نے بچپن کا زمانہ جو تعلیم کا بہترین زمانہ ہے مقابلتاً طویل رکھا ہے - تعلیم کا مسئلہ در اصل ایک نسل سے دوسری نسل کو مفید تجربات منتقل کرنے کا مسئلہ ہے - معاشرے کی تمدنی اور اخلاقی زندگی کے بقا کے لئے ضروری ہے کہ انسان جو کچھ تجربے سے سیکھتا ہے اس کو آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتا رہے - اگر یہ علمی خزانے اور علمی وسائل مناسب طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک نہ پہنچائے جائیں تو تھوڑے سے عرصہ میں نہایت متمدن اور تہذیب یافتہ جماعتیں بھی وحشی اور جاہل افراد کا مجموعہ بن کر رہ جائیں - واقعہ یہ ہے کہ عمرانی زندگی کا انحصار ہی ان چیزوں پر ہے جو اس کے تمام افراد میں مشترک ہوتی ہیں اور جن کو وہ اسی طرح حاصل کرتے ہیں کہ اُن میں مبادلۂ خیالات اور داد و ستد ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات سے مستفید ہوتے ہیں - اگر اس تعامل اور داد و ستد کا سلسلہ بند ہوجائے تو جماعت کی ایک جہتی کا فوراً خاتمہ ہو جائے کیوں کہ جماعت محض افراد کے ایک جگہ اکٹھا ہو جانے سے نہیں بنتی بلکہ اُن کے اتحاد خیالات اور اتحاد اغراض و مقاصد سے وجود میں آتی ہے - یہ ممکن ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوں لیکن اُن میں باہمی مراسلت وغیرہ کے ذریعے سے وہ تعلقات قائم ہوں جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں اور اُنھیں صحیح معنوں میں ایک زندہ جماعت بناتے ہیں -

" ایک کتاب یا ایک خط کے ذریعے سے اُن لوگوں میں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں ایسے قریبی مراسم اور تعلقات قائم ہو سکتے ہیں جو ممکن ہے ایک ہی گھر میں رہنے والوں کے درمیان نہ پائے جائیں......افراد کو ایک جماعت یا سوسائٹی کی شکل میں منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے مقاصد، اُن کے عقائد، اُن کی خواہشات، ان کا علم مشترک ہو، ان میں یک جہتی اور باہمی مفاہمت ہو - اس قسم کی چیزوں کو مادی حیثیت سے، اینٹ پتھروں کی طرح ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں کیا جاسکتا - ان میں لوگ اس طرح شریک نہیں ہو سکتے جس طرح کسی کھانے کی چیز کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ سکتے ہیں - وہ باہمی داد و ستد جس سے یک جہتی پیدا ہوتی ہے - ایسی ہونی چاہئے جس سے ذہنی اور جذباتی میلانات میں یکسانیت پیدا ہو اور افراد توقعات اور ضروریات کو ایک ہی طرح پورا کریں " ۱ -

افراد کی باہمی اثر پذیری

ابھی ہم تعلیم کے محدود اور مسلمہ معنی سے بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ افراد کی عام تربیت اور تاثیر و تاثر کو اس وسیع تر نظام کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں جو معاشرے کی زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور جس میں مدرسہ کی تعلیم کو ایک اہم لیکن جزوی حیثیت حاصل ہے - بیشک مدرسوں کا کام بھی یہی ہے، جیسا کہ ہم آئندہ چل کر زیادہ تفصیل کے ساتھ دکھائینگے کہ وہ گذشتہ اور موجودہ نسلوں کے تجربات کو منظم اور مرتب کر کے بچوں اور نوجوانوں کے سامنے پیش کریں اور اُن کے افکار اور اعمال پر معاشری مقاصد اور اغراض کے مطابق

---

۱ - Dewey : Democracy and Education صفحہ ٥ -

اثر ڈالیں - لیکن اس کام کی پوری اهمیت اور اُس کے حدود کو هم اُس وقت تک اچھی طرح نهیں سمجھ سکتے جب تک یه نه معلوم هوجائے که وہ مستقل اور بنیادی طریقے کیا هیں جن کے ذریعے معاشرہ خود بخود افراد کی تربیت کرتا هے اور جس کی تکمیل اور تنظیم کے لئے مدرسے کا مخصوص ماحول ترتیب دیا گیا هے - هم نے ابھی بیان کیا هے که معاشرے میں زندگی بسر کرنے سے افراد کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربات سے متاثر هونے کا موقع ملتا هے - یعنی اس کی وجه سے ان کے خیالات میں وسعت اور کارکردگی میں اضافه هوتا رهتا هے - جو تربیت کا مرادف هے - اس داد و ستد میں صرف اسي شخص کو فائدہ نهیں پهنچتا جو شاگرد کی حیثیت سے استاد سے کچھ سیکھتا هے بلکه تجربے میں شرکت ایسی چیز هے جو دونوں فریقوں کے لئے مفید هے - جب کوئي بچه کسی کام میں شریک هو کر اپنے والدین کے خیالات اور جذبات سے واقفیت حاصل کرتا هے تو ایک حد تک اس کا طرز عمل اور نقطه نظر تبدیل هو جاتا هے - اس کی طبیعت اور اس کے علم میں ایک نئے عنصر کا اضافه هو جاتا هے جس کی وجه سے وہ گویا ایک نئی هستی بن جاتا هے - اسی طرح جب وہ اپنے هم عمروں میں کھیلتا هے ؛ ان کی نقل اُتارتا هے ' ان کے ساتھ مقابله یا تعاون کرتا هے تو اس کے تجربے میں وسعت اور وضاحت پیدا هوتي هے - اُسے اپنے تخیل سے کام لینا پڑتا هے - اپنے خیالات کو ' اپنی گفتگو کو' اپنے سارے طرز عمل کو ذمه داری کے ساتھ معین اور مرتب کرنا پڑتا هے تاکه وہ دوسروں کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکے - عمرانی زندگی هي کی بدولت وہ تمام مواقع حاصل هوتے هیں - جو انسان کو غور و فکر اور محاسبه نفس کرنے پر مجبور کرتے هیں اور اس کے تجربے کو منظم اور نمو پذیر بناتے هیں - بالکل تنهائی کی زندگی میں تو انسان کو اس سے زیادہ غور و فکر

اور تگ و دو کی ضرورت نہ پڑتی کہ وہ اپنی حیوانی ضروریات کو کس طرح پورا
کرلے - اسی طرح اسی اشتراک عمل سے وہ بالغ افراد بھی مستفید ہوتے ھیں
جو نوعمر بچوں کو اپنے تجربات میں شریک کرکے ان کی تربیت کرنا چاھتے
ھیں ان کے تجربات اکثر ان کے عمل کا جزو بن جاتے ھیں اور عادت کی
شکل اختیار کر لیتے ھیں - جب وہ کسی بات کو ایک دفعہ سیکھہ لیتے ھیں
تو انھیں یہ ضرورت نہیں رھتی کہ اس کی منطقی یا نفسیاتی تحلیل
کریں - اور اپنی معلومات کو معین اور واضح شکل میں ترتیب دیں - لیکن
جب انھیں نوعمر بچوں سے سابقہ پڑتا ھے تو ان کے لئے ضروری ھو جاتا ھے
کہ وہ اپنے تجربے کو اس طرح مرتب کریں کہ بچے اس سے مستفید ھوسکیں
یعنی ان کے پختہ اور مکمل تجربے اور بچوں کے نامکمل اور آزمائشی تجربات
کے درمیان رابطہ قائم ھوجائے - اس مقصد کے لئے انھیں بہت کچھہ دماغی کاوش
کرنی پڑتی ھے جو خود ان کی ذات کے لئے مفید ھوتی ھے - فرض بالغوں کے
نقطہ نظر سے فن تعلیم کے معنی یہی ھیں کہ معاشرے کے تجربات کو ایسی
شکل میں منتقل کیا جائے کہ وہ بچوں کے خیالات جذبات اور دلچسپیوں
کے ساتھہ ھم آھنگ ھوجائیں - اور ان کو ایسے مشاغل میں لگایا جائے کہ وہ
رفتہ رفتہ اپنے نامکمل اور مبہم تجربات کی تکمیل اور تنظیم کرکے تہذیب
و تمدن کے حامل بن جائیں - جو لوگ فن تعلیم سے پوری واقفیت رکھتے ھیں
انھیں اندازہ ھے کہ یہ کام کس درجہ مشکل اور کتنی ذمہ داری کا ھے -
اس کو انجام دینے کے لئے کسی قدر علمی قابلیت اور سمجھہ بوجھہ کی ضرورت
ھے اور اگر یہ ایمانداری اور خلوص کے ساتھہ کیا جائے تو اس سے خود معلموں
کی قابلیت میں کتنا اضافہ ھوتا ھے - پروفیسر ڈیوئی (Dewey) اس
مسئلہ پر بحث کرتے ھوئے لکھتے ھیں -

"ذرا اس بات کی کوشش کیجئے کہ کسی تجربے کو وضاحت اور صحت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو سمجھایا جائے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ خود آپ کا نقطۂ نظر اس کے متعلق بدل گیا ہے - بالخصوص اس صورت میں کہ وہ تجربہ ذرا پیچیدہ اور مشکل ہو........کسی تجربے کو منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کو ایک مخصوص شکل میں مرتب کیا جائے - اور ترتیب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم بے تعلقی سے اس پر غور کریں ' اسے دوسرے شخص کے نقطۂ نظر سے دیکھیں ' یہ سوچیں کہ اس تجربے میں اور دوسرے کی زندگی میں کس طرح رابطہ قائم ہوسکتا ہے - اور یہ اُس کے سامنے کس شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ اِسے آسانی سے سمجھ لے - سوائے اس صورت کے کہ ہم بالکل پیش پاافتادہ اور جانی بوجھی باتیں سکھانا چاہیں ہمیشہ اِس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے تجربے کو موثر طور پر کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کرنے کے لئے ہم ایک حد تک ' اپنی قوت تخیل سے اُس کے تجربات کو اپنے تجربات بنا لیں" - ۱

نظام تمدن کا ارتقا

انسان نے جوں جوں ترقی کی ہے ' انتقال تجربات کے وسائل بھی بڑھ گئے ہیں اور زیادہ مکمل ہوگئے ہیں - سب سے قدیم اور موثر ذریعہ و یہی ہے کہ لوگوں کو ایسے مشاغل میں شریک کیا جائے کہ وہ براہ

---

۱ - Dewey : Democracy and Education صفحہ ۷ -

واسطے اُن تجربات کو حاصل کریں جن کو منتقل کرنا مقصود ہے ۔ اور تعلیم کی ابتدا بھی اسی طرح ہوئی کہ بالغوں نے بچوں کو اپنی روز مرہ زندگی میں شریک ہونے کا موقع دیا اور اس طرح اُن کو وہ ضروری فنون اور رسوم و روایات سکھائیں جو معاشرے کے نزدیک قائم رکھنے کے قابل تھیں - لیکن اس کے ساتھ ہی خود بالغ افراد کے روز افزوں تجربات کو محفوظ رکھنے کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا تھا - اول اول اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے محض حافظے سے کام لیا جاتا تھا - اور اُن کو منتقل کرنے کے لیے زبانی الفاظ سے - چنانچہ قدیم ترین ادب اور شاعری کے شاہکار ہم تک اِسی طرح سینہ بسینہ پہنچے ہیں - مگر انسان کا دماغ اِس ناقابل اعتبار اور محدود انتظام پر قناعت نہیں کر سکتا - اُس کی قوت اِختراع نے اپنے تجربات کی حفاظت کے لیے بہت سے نئے ذرائع اِیجاد کر لیے - فن تحریر نے انسانی خیالات کو حیات دوام بخش دیا اور ہمیں حافظہ کے فریب سے آزاد کر دیا - آوازوں کو قائم رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے آلات ، گراموفون وغیرہ بنائے گئے - صورتیں مصوری اور عکاسی کے ذریعہ فنا ہونے سے بچا لی گئیں - یہ تمام ذرایع اِنسانی تجربات کو منتقل کرنے کے کام میں آنے لگے ہیں اور اُن میں آئے دن نت نئی اِیجادیں اور اضافے ہوتے رہتے ہیں - چنانچہ آج ہر متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں خیالات کو منتقل کرنے کے ذرائع اِس کثرت سے موجود ہیں کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر علوم و فنون کے کسی شعبے میں کام کرتے ہیں ایک دوسرے کی کوششوں ، کامیابیوں ، اور ناکامیوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - زمان و مکان کی قیود سے انسان بڑی حد تک آزاد ہو گیا ہے اور خیال کے گویا پر لگ گئے ہیں کہ جہاں ضرورت ہو وہاں پہنچ سکتا ہے - اخباروں کے ذریعے تمام ملکوں

کی خبریں روز کے روز معلوم ہوتی جاتی ہیں - گراموفوں کے ذریعے ہم حال اور ماضی کے بڑے بڑے موسیقی دانوں اور مقرروں کی آواز سن سکتے ہیں - تیلیفون ، سنیما ، لاسلکی ، وغیرہ خیالات کو سرعت کے ساتھہ پھیلاتی ہیں اور اشتراک عمل کے امکانات کو زیادہ کرتی ہیں - اُن تمام چیزوں کی مدد سے تہذیب و تمدن کا نظام ، جس کی بنیاد وحشیوں اور نیم شائستہ جماعتوں نے ڈالی تھی ، نہایت تیزی کے ساتھہ پھیلتا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے -

اب تعلیم کا مسئلہ اِس صورت میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے کہ ایک طرف تو نو عمر بچہ ہے جو نہ جسمانی نقل و حرکت کے قابل ہے ، نہ اپنے ماحول سے واقف ہے ، نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتا ہے اور دوسری طرف یہ عظیم‌الشان نظام تمدن اور علوم و فنون کی دنیا جس کا ہم نے ذکر کیا ہے - کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی کا بچہ بھی بغیر کسی خارجی امداد کے ، محض اپنی جبلت اور ماحول کی قوتوں کی رہنمائی میں ، جانوروں کے بچوں کی طرح تھوڑے سے عرصہ میں اس نظام کے تمام عناصر پر حاوی ہو کر اپنے فرائض کو ادا کرنے کے قابل ہو جائے ؟ ظاہر ہے کہ یہ بات امکان سے خارج ہے -

تعلیم کے ذریعہ نظام تمدن کا قیام

انسانوں اور جانوروں کے ماحول میں اب تو زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن تمدن کے ابتدائی مدارج میں بھی یہ تفاوت نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا - ممکن ہے کہ بالکل ابتدائی مدارج میں انسانی تمدن اس درجہ سادہ اور واضح ہو کہ اُس وقت کے بچے بغیر کسی خاص بیرونی امداد کے چھوٹی سی عمر میں "بالغ" ہو جاتے ہوں یعنی بالغوں کی

زندگی میں شریک هو کر تمدنی کاربار میں حصه لیتے هوں - لیکن جوں جوں یه نظام زیادہ متنوع اور پیچیدہ هوتا گیا بچوں کو تمدنی زندگی کے لئے تیار کرنا بھی ایک مشکل اور اهم ذمهداري هو گئی - جس کے لیے زیادہ مدت درکار هونے لگی - بچپن جسکو " تیاري کے زمانے " سے تعبیر کیا جا سکتا هے - کوئي معین مدت نہیں بلکه اُس کی میعاد ضرورت کے مطابق خود بخود بڑھتی جاتي هے - تاکه بچے اس عرصه میں کم از کم ان وسائل پر قابو پا سکیں جن کی مدد سے وہ نظام تمدن کو سمجھه لیں اور ان کی جسماني اور دماغي نشو و نما صحیح راہ پر لگ جائے - تعلیم کي تاریخ کا مطالعه کرنے سے معلوم هوتا هے که نظام تمدن کے ارتقا کے ساتھه ساتھه بچوں کي تعلیم کا زمانه واقعی زیادہ طویل هوتا گیا هے - گذشته صدی کی تعلیمی جد و جهد کا ایک اهم باب وہ کوششیں هیں جو بچوں کي لازمی تعلیم کی مدت کو بڑھانے کے لئے کی گئی هیں - اکثر مغربی ممالک میں صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد سے برابر یه کوششیں هو رهی هیں که نه صرف بچپن کے زمانے میں بلکه زمانۂ بلوغ میں بھی طلبه تعلیمی ماحول اور تعلیمی اثرات میں رهیں کیونکه ماهرین تعلیم محسوس کرتے هیں که دور حاضرہ کے تمدن کے بہت سے اصول اور فرائض ایسے هیں جن کو طلبا بچپن کے زمانے میں نهیں سمجھه سکتے - اُن کو عمدگی کے ساتھه سمجھنے کے لئے زیادہ پخته تجربے کي ضرورت هے جو بلوغ کے زمانے میں حاصل هوتا هے جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عمرانی زندگی کے حقوق اور فرائض کو خود اپنے عملی تجربه کی بدولت پہچانتی هیں - اسی وجه سے امریکه میں ثانوی تعلیم کو بھی تمام طلبه کے لئے مفت اور لازمی قرار دیا گیا هے اور جرمني میں هر طالب علم کو ابتدائی تعلیم کے مدارج ختم کرنے کے

بعد اتھارہ سال کی عمر تک "تعلیم مزید" کے کسی شعبے میں داخل ہونا پڑتا ہے - انگلستان میں چند سال ہوئے ایک مشورتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس نے تعلیم بالغان کے مسئلہ پر غور کر کے ایک نہایت قابل قدر رپورٹ پیش کی ہے [1] اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ عہد بلوغ کے شروع ہوتے ہی بچوں کو مدرسے سے نکال کر زندگی کی کشمکش اور آزمائشوں میں ڈالدینا اور ان کو تعلیمی ہدایت اور رہنمائی سے محروم رکھنا ' بہت خطرناک چیز ہے - شہری زندگی کے فرائض اور اصولوں کو سمجھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ عمر کی اس اہم اور نازک منزل میں ان کے لئے مناسب تعلیمی ماحول اور سہولتیں فراہم کی جائیں - اقتصادی اور تمدنی مشکلات اور ایک حد تک انفرادی اختلافات کا خیال کرتے ہوے وہ اس بات کو مناسب نہیں سمجھتے کہ تمام نوجوان ثانوی تعلیم کے کل مدارج مدرسوں میں طے کریں - اس لئے انہوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ تعلیم مزید کے موجودہ نظام کو مرتب اور مکمل کیا جائے اور وہ تمام طلبہ جو باقاعدہ ثانوی مدارس میں تعلیم نہیں پا سکتے اپنے وقت کا ایک حصہ ' جو ان کے اقتصادی مشاغل سے بچایا جائے ' ان مدرسوں میں صرف کریں اور وہاں انکو تعلیم ایسی دیجائے کہ وہ نہ صرف اپنے مخصوص اقتصادی کار و بار میں زیادہ قابلیت کے ساتھہ حصہ لے سکیں بلکہ اپنے عمرانی وظائف کو بھی اچھی طرح سمجھہ کر ادا کریں -

اب یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ انسانی تمدن کے نظام میں تعلیم کی ابتدا کس طرح ہوئی - بچہ اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہہ سے

---

[1] Report of the Consultative Committee on the Education of the Adolescent.

اپنے گھر والوں کا ' خصوصاً اپنے والدین کا سہارا لیتا ہے - محض اسی بات سے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اپنے سے زیادہ عمر اور تجربہ کے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے - اور ان سے تعلقات پیدا کرتا ہے اس کی تعلیم کی ابتدا ہو جاتی ہے - شروع میں اس "تعلیم" کا مقصد علم سکھانا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا قائم رکھنا ہوتا ہے - والدین اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن کا منشا اس کی جسمانی صحت کو بر قرار رکھنا اور اس کی نشو و نما کرنا ہوتا ہے - اگر اس کے لیے یہ انتظام نہ ہو تو زندگی محال ہوجائے - اب جوں جوں اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت اور دماغ میں آدمیوں اور چیزوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے انسانی اور طبیعی ماحول سے تعلقات پیدا کرتا ہے - اپنے والدین ' عزیزوں اور دوستوں کی ہمت افزائی اور روک تھام ' اور ایک حد تک قدرتی تادیب کے ذریعے اس کی عمرانی اور اخلاقی تعلیم بھی شروع ہوجاتی ہے - خاندان کے افراد اور متعلقین جو تعلیمی اثر بچے پر ڈالتے ہیں اس کی تفصیل ہم ایک آئندہ باب میں کریں گے لیکن اس کی ابتدائی تربیت میں قدرتی تادیب کی اہمیت کا سمجھ لینا ضروری ہے - اکثر محبت اور احتیاط کرنے والے والدین اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بچے اس تکلیف سے بالکل محفوظ رہیں جو غلط اور نا مناسب حرکات کی وجہ سے انہیں پہونچنی چاہئے - لیکن مشہور انگریزی مفکر ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نے شد و مد اور قابلیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اخلاقی تعلیم کے لئے وہ تادیب بہت موثر ہوتی ہے جو بچے اپنے افعال کا قدرتی خمیازہ بھگتنے سے حاصل کرتے ہیں - وہ اپنی معرکتہ‌الآرا تصنیف "فلسفہ تعلیم" میں لکھتا ہے :-

"یہ قدرتی سزائیں جو بچے کے بے جا کاموں کا نتیجہ ہیں مستقل، بلا واسطہ اور یقینی ہیں اور ان سے چھٹکارا نہیں ہوسکتا - یہاں زجر و توبیخ کا کچھ کام نہیں - بلکہ چپ چاپ سختی سے کام لیا جاتا ہے - اگر بچہ اپنی انگلی میں سوئی چبھو لے تو نتیجہ یہ ہے کہ اس کو تکلیف ہوتی ہے - اگر دوبارہ ایسا کرتا ہے تو پھر یہی نتیجہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہتا ہے - بچہ موجودات غیر روح کے ساتھ اپنے تمام معاملات میں یہ بات معلوم کرتا ہے کہ وہ اپنی خاصیت سے منحرف نہیں ہوتے - کوئی عذر نہیں سنتے اور ان کی نہ داد ہے نہ فریاد - اس سخت مگر فیض پہنچانے والی تربیت کو پہچان کر بچہ نہایت ہی ہوشیار ہو جاتا ہے کہ آئندہ ان کی خلاف ورزی نہ کرے ....معاشرتی تربیت اور بچوں کی ابتدائی تربیت جو قدرت کرتی ہے ان دونوں تربیتوں کی باہمی مشابہت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے - اور کنایتاً اس بات کا بھی یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہی تربیت سب سے زیادہ موثر ہے " ۱

اس تمام بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تعلیم اور تمدن ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں - تعلیم کوئی ایسا نظام نہیں جس کو بعض ضروریات سے مجبور ہو کر انسان نے قائم کر لیا ہو اور نہ وہ ایسا شغل ہے جس کو انسانی زندگی کے لیے محض زینت کا باعث سمجھا جائے - وہ تو تمدنی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہے اور جسم

---

۱ - ہربرٹ سپنسر : فلسفۂ تعلیم (مترجمہ خواجہ غلام الحسنین)

اجتماعي میں جان بن کر سمائی ہوئی ہے - لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر دکھایا ہے اُس کا مقصد اب محض اتنا نہیں کہ وہ تسلسل حیات کو قائم رکھے بلکہ وہ '' حیات برتر '' کا ایک وسیلہ بن گئی ہے جس کے ذریعہ ہم ناواقف اور ناتجربہ کار بچے کو بہترین اخلاقی اور معاشرتی اقدار ا اور اصولوں سے روشناس کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے ورثے کے اُن عناصر کو جو بہترین تعلمی قدر رکھتے ہیں بچے کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں خود بخود ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ڈالنے کي اہلیت پیدا ہو جائے ' اس طرح تعلیم ایک طرف بچے کی شخصیت کی تکمیل کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف اوسے تمدنی زندگی بسر کرنے کے قابل بناتی ہے - بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ شخصیت کی نشو و نما ھی ان مشاغل کے ذریعہ کر تی ہے جو تمدنی زندگي کا اہم جزو ہیں اور جن کے ذریعے سے بچہ رفتہ رفتہ اسے سمجھنے اور اس میں شرکت کرنے کے قابل ہو جاتا ہے - لیکن یہ نظریہ تعلیم کا صرف ایک رخ ہے - یعنی اگر ہم عمل تعلیم کو معاشرے یا بالغ افراد کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ھمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے بچوں کو تمدنی زندگی کے لئے تیار کر رہے ہیں -

تبصرے

<u>خیام</u>—مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی—مطبع معارف اعظم‌گڑہ

قیمت مجلد چار روپئے غیر مجلد تین روپئے آٹھہ آنے -

حکیم عمر خیام کو آج مشرق و مغرب میں جو شہرت حاصل ھے وہ محتاج بیاں نہیں، لیکن کتنی عجیب بات ھے کہ با وجود اس شہرت کے اس کے حالات و معتقدات پر بہت ھی سنگین پردے پڑے ہوئے ھیں، عوام تو ایک طرف خواص میں بھی، اسکے بارے میں سخت سے سخت غلط فہمیاں پھیلی ھوئی ھیں؛ انتہا یہ کہ اس کا سن ولادت و وفات بھی آج کوئی قطعی طور پر متعیں نہیں کرسکتا - ایک عام خیال یہ ھے کہ خیام، حسن صباح اور نظام‌الملک ھم‌مکتب تھے اور اُن میں یہ عہد ھوا تھا کہ اگر ان میں سے کوئي منصب جلیلہ پر قابز ھو تو وہ دوسرے دوستوں کي بھي مدد کریگا - یہ قصہ مولوي عبدالرزاق نے بھي اپني کتاب نظام‌الملک میں درج کیا ھے - یہ خیال مغرب میں بھي پھیلا ھوا تھا مگر سب سے پہلے فرنچ مستشرق پروفیسر ھوتسما نے جب زبدۃالنصر وعصرۃ کو شایع کیا اور اس پر مقدمہ فرنچ زبان میں لکھا تو یہ داستان مشکوک و مشتبہ ھو گئي اور لوگ خیام کے حالات کي تحقیق کی جانب یکایک مائل ھو گئے - اسي طرح اسکے خمریات اور فلسفیانہ مضامین سے اسکي، آزادی و بے دیني پر قیاس کیا جانے لگا، یہ اور اس قسم کی اکثر غلط فہمیاں ھیں جو خیام کي زندگي کے بارے میں مشرق و مغرب میں یکساں طور پر رائج ھیں؛ اسلئے ضرورت تھي کہ ایک مبسوط تحقیقی مقالہ لکھکر ان تمام خیالات کا جایزہ لیا جائے اور خیام کی اصلي شکل و صورت سے لوگوں کو روشناس کیا جائے - چنانچہ یہ امر غائت

مسرت کا باعث ہے - کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بصیرت افروز اور ناقدانہ قلم نے ایدھر توجہ کی اور آپ نے خیام کے نام سے تقریباً ۵۰۰ صفحہ کی ایک کتاب لکھکر اسکی شاعری اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوں کو روشن اور آشکارا کردیا -

خیام کے مأخذ کے سلسلے میں سید صاحب نے سب سے پہلے فضلاے مغرب کے اقوال سے بحث کی ہے، اس میں ہوتسما' زوکو وسکی' راس بروّن' ڈینی سن راس اور براؤن وغیرہ سب آجاتے ہیں اسکے بعد قدیم مأخذوں کا تذکرہ اور اُن پر بحث ہے ' پھر اُن حکایات و روایات پر جرح و تنقید ہے جو اسکے بارے میں عام طور پر مشہور ہیں - اسکے بعد خیام کے سال وفات و ولادت کی بحثیں اور اسکی زندگی کے دوسرے حالات ہیں - پھر اسکے تلامذہ ' اسکی تصانیف کا ذکر اور اُن تصانیف پر تبصرہ ہے - اس سلسلے میں مولانا نے خیام کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست دی ہے اور اسکے بعض رسالوں کے پہلے صفحہ کی نقل بھی شایع کی ہے - اور ان میں سے اکثر فارسی اور عربي کے فلسفیانہ رسائل پر علحدہ علحدہ تبصرہ بھی کیا ہے ' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کی حیثیت شاعر ہونے سے کہیں زیادہ ایک مفکر اور فلسفی کی ہے ' ان مباحث کے بعد خیام کی رباعیوں میں دوسرے شعرا کی رباعیوں کی بحث ہے اور اس تخلیط کے اسباب بیان کئے گئے ہیں ' پھر خیام کے مذہب ' اس کی شراب اور اس کے معتقدات کی بحثیں ہیں اور آخیر میں خیام کے اصل رسالے الکون و التکلیف' الرسالتہ الثانیہ فی الوجود' رسالۂ فی کلیات الوجود اور میزان الحکم ارر نسخۂ جدیدۂ خیام ہے -

رباعیات کے ذکر میں رباعی کی تاریخ بڑی شرح و بسط کے ساتھہ لکھی گئی ہے ' پھر خیام کی رباعیات کے قدیم نسخوں کا ذکر ہے ' اس سلسلے میں یہ دکھا یا گیا ہے کہ جوںسے جوںسے زمانہ بڑھتا جاتا ہے خیام کی رباعیوں

کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے ' فضلاے مغرب نے بھی خیام کی رباعیوں میں الحاقی رباعیوں کی تحقیق کی ہے مگر سید صاحب نے الحاقی رباعیوں کو مدلل طور پر ثابت بھی کیا ہے - جو زائد رباعیاں خیام کے نام سے منسوب ہوگئی ہیں اُن کی حیثیت یہ ہے کہ یاتو وہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود ہیں ' یا اُن رباعیوں میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو خیام کے وقت میں رائج نہ تھے یا پھر یہ کہ وہ خیام کے فلسفے اور اس کے معتقدات سے متعارض ہیں - ظاہر ہے کہ یہ بالکل صحیح اور مبصرانہ طرز تنقید ہے -

مذکورہ مباحث کی تحت میں جو تفصیلی و ذیلی باتیں آگئی ہیں وہ سب دلچسپ ہیں لیکن رباعیات کی تنقید ' خیام کی شراب اور اس کے مذہب و معتقدات کی بحث خصوصیت کے ساتھہ نہایت پرلطف ہے - خیام کی زندگی کے حالات اور اس کے حکیمانہ معتقدات کی تحقیقات سے اصل رباعیوں کے جایزے اور تنقید میں بھی بہت مدد ملی ہے -

خیام کے مذہب کے بارے میں حکمت و تصوف کی تقسیم در تقسیم بحثوں کے بعد سید صاحب کا فیصلہ ہے کہ خیام کا تصوف مذہبی نہیں بلکہ حکیمانہ ہے - سید صاحب کے نزدیک " مذہبی تصوف سے مراد مذہبی روح یعنی اخلاص و محبت ' زہد ' تقوی ' عبادت اور شریعت پر سنت نبوی کے مطابق عمل ہے اور حکیمانہ تصوف سے مقصودالہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا — پہلے تصوف کا مرکز خیال نبوت ہے اور اس میں انبیا کے احوال کی پیروی ہوتی ہے اور دوسرے تصوف کا مرکز حکمت ہے اور اس میں فلاسفہ اور حکما کے احوال کی پیروی کیجاتی ہے " پھر لکھتے ہیں کہ " خیام کا تصوف مذہبی نہیں بلکہ حکیمانہ تھا یعنی اس کے سامنے انبیا کے احوال نہیں بلکہ حکما کے حالات تھے " -

لیکن خیام کے بارے میں اگر شروع ھي میں یہ تسلیم کر لیا گیا ھے کہ "وہ مسلمان تھا ، خدا و رسول کا قائل تھا ، نماز پڑھتا تھا ، اسنے حج بھی کیا تھا ، وہ گوشہ نشین ھوکر ریاضت و عبادت میں مصروف رھنے لگا تھا ، اس نے بعثت رسول کی ضرورت پر دلیل پیش کی ھے " وغیرہ وغیرہ تو اس کے لئے یہ لکھنا کہاں تک مناسب ھو سکتا ھے کہ " خیام کا تصوف مذھبي نہیں بلکہ حکیمانہ تھا ، یعنی اس کے سامنے انبیا کے احوال نہیں بلکہ حکما کے حالات تھے " - " شریعت اور سنت نبوي پر عمل" (بشرطیکہ خشک ، سطحی اور رسمي نہ ھو) اور " حکمت " جس میں فسق و بیدینی کے بجائے عمل بالاسلام کي شان موجود ھو ، باھم مختلف نہیں بلکہ معناً ایک ھیں - " کتاب و حکمت" دونوں کو قران میں مذھب ھی کے ذیل میں رکھا گیا ھے - سید صاحب فلسفیانہ تصوف (مذھب ؟) کو فلسفے سے باھر نہیں سمجھتے ، یہ صرف طرز بیان کا دھوکا ھے - یوں تو خود مذھب بھي ایک طرح کا فلسفہ ھے اور ھم اس فقرے کو الٹ کر یوں بھی کہ سکتے ھیں کہ فلسفیانہ تصوف کو مذھب سے باھر نہ سمجھنا چاھئے - خیام اگر بقول سید صاحب مسلمان' تھا ، خدا اور ' رسول کا قائل تھا نماز پڑھتا تھا اس نے حج کیا تھا وغیرہ وغیرہ تو " شریعت " اور سنت نبوی کی پیروی " کسے کہتے ھیں اور وہ اس سے علحدہ کیا شے ھے ، اور کیا ایسے شخص کے سامنے انبیا کے احوال نہیں بلکہ حکما کے حالات ھوسکتے تھے ؟ البتہ مسائل الھیات پر تدبر و تفکر کے باعث ایک طرح کا ذھنی علو جو عام طور پر " شریعت و سنت " کے نام لینے والوں کو حاصل نہیں ھوتا اُسے میسر تھا ، لیکن کیا تدبر و تفکر پر خود قران میں زور نہیں دیا گیا ھے ، اور انبیا و صالحین امت برابر تدبر و تفکر میں نہیں بسر کرتے آے ھیں ؟ ایک مسلمان اگر وقت کے علوم سے با خبر ھے اور ان پر غور و فکر کر سکتا ھے تو کیا اسے " پیروان نبوت " کے گروہ سے خارج کر کے " پیروان حکما " کے گروہ میں

داخل کیا جائیگا ؟ اگر اصول میں یہی تنگی رہی تو مسائل الٰہیات پر غور و فکر بلکہ، علوم فکریہ کی تحصیل و تدریس تک یک لخت قابل اعتراض ہو جائیگی - اس کے بعد پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو کیا کہا جائیگا -

اگر اس بیان کا منشا یہ ہے کہ خیام کا شمار صرف اہل علم کی جماعت میں ہونا چاہئے ' اس لئے کہ تعلیم و تعلّم اور انہماک علمی کے باعث اسے صوفیاے کرام اور مقدس ہستیوں سے اکتساب روحانی اور استفادۂ باطنی کا موقع نہیں ملا تو یہ بالکل دوسری بات ہوگی اور اس لحاظ سے بیچارہ خیام تو ایک طرف اکثر '' سنت و شریعت '' کا نام رکھنے والے بھی محروم رہے ہیں -

خیام کی شراب کے بارے میں علامہ شبلی مرحوم نے شعرالعجم میں یہ لکھا تھا کہ '' خیام فلسفی اور حکیم تھا ' ورنہ یہی شراب حافظ کی طرح '' شراب معرفت '' بن جاتی - '' سید صاحب نے حافظ کی طرح '' شراب معرفت'' نہ سہی مگر ایک شراب حکمت '' تو ایجاد کر ہی دی ایک رند یہ کہہ سکتا ہے کہ '' شراب حکمت '' کہا '' شراب الصالحین '' سہی مگر ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سنہ ۱۹۲۴ع میں پروفیسر محمود شیرانی کی طرف سے ڈاکٹر محمد اقبال (سر اقبال نہیں) کی شعرالعجم پر تنقید رسالہ اردو میں شایع ہوئی تھی اس میں خیام کے تذکرۂ مندرجۂ شعرالعجم میں بہت سی خامیاں بتائی گئی تھیں - سید صاحب کے اس زبردست تحقیقی مقالے سے نہ صرف ' یہ کہ وہ تمام خامیاں پوری ہو گئیں بلکہ خیام پر ایک مبسوط

معاکے اور تبصرے کے لحاظ سے مشرق و مغرب کے لئے ایک مستقل راہ بصیرت و ہدایت پیدا ہوگئی - (ا)

داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی
تصنیف سید انشااللہ خاں انشا

شایع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد دکن ۵۱ صفحات قیمت ۴ آنہ

اردو ادب نے گذشتہ دو تین برس میں جو چند عظیم‌الشان شخصیتیں پیدا کیں ہیں سید انشا کا شمار بھی ان میں ہے - وہ ایک غیر معمولی دماغ اور نہایت گہری نظر لیکر آئے تھے - دریائے لطافت میں اُنہوں نے ادب کو پرکھنے کے لئے جو اصول وضع کئے ہیں وہ زبان کے ہر جوہری کے لئے آج بھی شمع راہ کا کام دیتے ہیں - عربی ' فارسی ' ترکی ' ہندی ' کے علاوہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کافی دستگاہ رکھتے تھے - ان کے غرور علم کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ ایک دوست کے کہنے سے اُنہوں نے ایک قصہ ایسا لکھا جس میں شروع سے آخیر تک سوائے ہندی بول چال کے دوسری زبان کا لفظ نہ آنے پائے - اس قصہ کا نام رانی کیتکی کی کہانی رکھا - اس میں شک نہیں کہ سید انشا نے کمال خوبی کے ساتھہ اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا مگر یہ بات بھی بالکل صحیح ہے جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "قصہ کہانی میں تو یہ زبان نبھہ جاتی ہے مگر علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کے لئے اس میں سکت نہیں " - اس کا اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ انشا ایسا بےنظیر زباندان اور ہمہ‌گیر دماغ کا آدمی دریائے لطافت کو فارسی میں ادا کرتا ہے - ایک انگریزی شاعر ورڈسورتھہ نے دعویٰ کیا تھا کہ شاعری کی زبان عام بول

چال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی لیکن وہ خود اُسے اس دعوی کو اچھی طرح پورا نہ کر سکا - علمی اور ادبی زبان کیسی ہونی چاہئے اس بیان کا یہاں موقع نہیں - تاہم داستان رانی کیتکی میں جو الفاظ اور محاورے ہیں اُن میں بہت سے ایسے ہیں جن کو وسعت زبان کے لئے زندہ کرنے کی اشد ضرورت ہے - یقین ہے کہ ہر صاحب ذوق اس قصہ کو پڑھکر آج بھی لطف اُٹھائیگا اگر سرخی میں داستان کے بجائے کہانی یا اور کوئی لفظ کارکنان انجمن رکھدیتے تو سید انشا کا التزام بھی باقی رہتا اور لطف بھی دوبالا ہو جاتا - (ر)

جنگنامہ عالم علی خاں

مصنفہ غضنفر حسین مرحوم

شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن، ۶۸ صفحات، قیمت ۱ آنہ

اس جنگنامہ میں نواب آصفجاہ نظام الملک اور سید عالم علی خاں صوبہ‌دار دکن کی جنگ کا حال ہے سید عالم علی خاں سادات بارہ میں سے تھے اور سید عبداللہ قطب الملک وزیر فرخ سیر کے بھتیجے تھے - دکن کے صوبہ‌دار مقرر کئے گئے اور اسی سلسلہ میں نظام الملک سے معرکہ آرائی ہوئی - یہ معرکہ سنہ ۱۷۲۰ع میں اورنگ آباد کے قریب واقع ہوا جس میں سید عالم علی کو شکست فاش ہوئی اور وہ مارے گئے - ایک دکھنی شاعر غضنفر حسین مرحوم تھے انہوں نے اس واقعہ کو کئی سال بعد نظم کا جامہ پہنایا - مولوی عبدالحق صاحب نے جنگنامہ کے تین نسخوں سے مقابلہ کرکے اس کی صحت کی ہے اور شروع میں ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے -

---

نیرنگ خیال

ہندوستان کا مقبول ترین علمی اور ادبی
ماہوار مجلہ - دس سال سے برابر شائع
ہو رہا ہے - سال بھر میں قریباً
--- ایک ہزار (۱۰۰۰) صفحات ---
اور
کئی درجن رنگین تصاویر
-- شائع ہوتی ہیں --

ملک کی کئی ہزار تعلیم یافتہ خواتین اُسے پڑھتی ہیں - نیرنگ خیال کی اشاعت ہندوستان بھر کے تمام علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ ہے ہر ماہ تقریباً ایک لاکھ تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ میں رہتا ہے - نیرنگ خیال کی مقبولیت کا راز صرف یہ ہے کہ اس میں تمام بڑے بڑے اہل قلم مضامین لکھتے ہیں اور اس کا چندہ بے حد قلیل ہے -

چندہ سالانہ : تین روپئے چار آنے - سالانہ سمیت چار روپئے بارہ آنے - سالانہ دسمبر کے پرچے کے علاوہ بطور زائد خاص نمبر علىحدہ شائع ہوتے ہیں ' جس کی جدا گانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے -

نیرنگ خیال میں اِشتہار دینا ہندوستان کی تمام متمول پبلک تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ ہے -

منیجر

نیرنگ خیال

شاہی محلہ ' لاہور -

اُردو

انجمن ترقی اُردو ، اورنگ آباد (دکن) کا خالص

ادبی سہ ماہی رسالہ

جو

جنوری ، اپریل ، جولائی ، اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

جس میں

ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -

اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب ، بی - اے -
سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو ، جامعہ عثمانیہ ،
حیدرآباد (دکن) -

سالانہ چندہ : سات روپیے - ایک نسخے کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو ، اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ ، الہ آباد -

سائینس

انجمن ترقی اُردو ' اورنگ‌آباد (دکن)

کا خالص

سائینس کا سہ ماھی رسالہ

جو

جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شائع ھوتا ھے

جس میں

سائینس کی جدید ترین ایجادات '

انکشافات اور اختراعات پر بحث ھوتی ھے

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی محمد نصیرالدین احمد عثمانی صاحب '

ایم - اے ' بی ایس سی - معلم طبیعات ' کلیہ جامعہ عثمانیہ '

سالانہ چندہ : آٹھہ روپیہ - ایک نسخہ کی قیمت دو روپیہ -

انجمن ترقی اُردو ' اورنگ‌آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ ' الہ‌آباد سے

طلب کیجئے

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۴ } جولائی سنہ ۱۹۳۴ع { حصہ ۳

اردو ، هندی ، هندستانی

از رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو - کے - سی - ایس - آئی - پی سی

آج کل میں اکثر رسالوں ، اور اردو کی تصنیفات میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی یا پنجاب میں یا کہیں اور - تاریخی نقطۂ نظر سے اگرچہ یہ بحث نہایت دلچسپ ہے لیکن زبان اور ادب کی ترقی پر مجھے اس کا اثر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا - علماے ادب کو اختیار ہے کہ اپنی تحقیقات سے اِس کا مولد خواہ دکن قرار دیں خواہ دہلی مگر اس واقعے سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس تیرہ دو سو برس کے عرصے میں جو کچھ ترقی اردو زبان یا اردو ادب میں ہوئی ہے وہ دہلی یا لکھنؤ میں ہوئی ہے ، گو مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ پچھلے بیس سال میں حیدرآباد نے اردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے - پچیس برس پیشتر تک جب کوئی شخص اردو کا تذکرہ کرتا تھا تو اُس سے مراد زیادہ تر اردو شاعری

سے ہوتی تھی لیکن اس پچیس برس میں شاعری کے علاوہ اور اصناف میں بھی اردو میں خاصی ترقی ہوئی ہے ' اب کچھہ کتابیں تاریخ یا فلسفے یا اور مضامین پر اردو میں نکل گئی ہیں اور اُن کو پڑھہ کر اردو کی وسعت کا کچھہ اندازہ ہو سکتا ہے ' اسی طور پر ہمارے شاعروں کا بھی کچھہ ڈھنگ بدل رہا ہے ' پہلے تو اُن کو موے میاں ' چاہ زنخداں اور گل و بلبل وغیرہ کی بہت تلاش رہتی تھی اور اسی تلاش میں اُن کی عمر صرف ہو جاتی تھی ' لیکن اب شکر ہے کہ ہمارے شاعروں کی توجہ اور طرف بھی مبذول ہوئی ہے ' ایران میں ' اس تیس چالیس برس کے اندر شاعری کا ڈھنگ بالکل بدل گیا ' اور عصر جدید کے شعرا نے پرانی زنجیروں کو توڑ کر اپنے تخیل میں آزادی حاصل کرلی ہے ' اپنے ملک کی اصلاح میں اور اپنے وطن کی حوصلہ افزائی میں جو ایران کے شعرا نے حصہ لیا ہے اس سے کسی شخص کو جو عصر جدید کی شاعری سے واقف ہو انکار نہیں ہو سکتا ' اگرچہ ابھی تک اردو شعرا پر تغزل کا رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہے لیکن بتدریج وہ بھی بدل رہے ہیں - غالب نے ستر آسی برس پیشتر اِنہیں قیود کو محسوس کرکے غالباً یہ شعر لکھا تھا -

بقدر شوق نہیں ظرف تنگناے غزل
کچھہ اور چاہئے وسعت مری زباں کے لئے

اگر وسعت زباں کی ہماری طرف سے سمجھہ بوجھہ کر کوشش کی گئی تو میرے خیال میں بیس پچیس برس کے اندر اردو ادب میں کافی ذخیرہ پیدا ہو جائیگا جس کے ذریعہ سے ابتدا سے انتہا تک اسی زبان میں تعلیم دینا ممکن ہو جائے گا - میرا عرصے سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک کی تعلیم غیر زبان میں نہیں ہو سکتی ' نہ کوئی شخص

غیر زبان میں کمال حاصل کر سکتا ہے - ملٹن کے سے شاعر نے جو لاطینی زبان کا استاد تھا جب پراڈائز لسٹ (Paradise lost) لکھنے کا ارادہ کیا تو آخرکار اس نے یہی تجویز کیا کہ اپنی ہی زبان یعنی انگریزی میں اُسے نظم کرنا چاہئے ' چنانچہ جو شہرت ملٹن کو اپنی زبان میں '' پراڈائز لاسٹ '' لکھنے کی وجہ سے ہوئی وہ اظہر من‌الشمس ہے -

انگریزی تعلیم یافتہ ہندستانیوں کی تعداد تیس یا پینتیس کرور آدمیوں میں صرف چند لاکھہ کی ہے ' لیکن بڑے سے بڑے ہندستانی کو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ انگریزی بولنے یا لکھنے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے - ایسے شخص ہندستانیوں میں جن کو انگریزی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو ' یا جو محاورے اور ترتیب و بندش الفاظ میں غلطی نہ کرتے ہوں ' بہت کم ہیں اور ہمیشہ کم رہیں گے - ہر زبان کا تعلق سوسائٹی کے نظام سے ہوتا ہے ' جب ہمارا طرز و طریق زندگی ہندوستانی ہے تو بہت سے الفاظ اور محاورے انگریزی زبان کے ایسے ہیں جن کا اثر ہم پر ویسا نہیں ہو سکتا جو انگریزوں پر ہوتا ہے ' اسی طرح اگر بجائے انگریزی کے ہندستان میں فارسی یا عربی کا عام طور پر رواج ہوتا تو اُس کا بھی ویسا اثر ہندستانی طبیعت پر نہ ہوتا جیسا ایرانیوں اور عربوں پر ہوا کرتا ہے ' چنانچہ اس کا تجربہ ہندستان کو ہو چکا ہے -

اسلامی عہد حکومت میں فارسی اور عربی کا بہت کچھہ زور ہندستان میں رہا ' لیکن ہندستانی مسلمانوں کو بھی بہ‌حیثیت زبان دانی کے کبھی وہ رتبہ حاصل نہیں ہوا جو ایرانی اور عرب ادیبوں کو ہوا ہے - ایک مرتبہ اس مضمون پر مجھہ سے پروفیسر براؤن سے کیمبرج میں گفتگو ہوئی تھی ' میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اُن سے یہ پوچھا کہ آپ کے

تجربے میں ایران میں کس ہندستانی شاعر کی قدر کی گئی ہے ' اُنھوں نے صرف خسرو کا نام بتایا اور اُس پر بھی یہ کہا کہ گو خسرو ہندستانی تھے یعنی یہ کہ ہندستان میں رہے اور وہیں اُنھوں نے انتقال کیا لیکن نسل اُن کی ہندستانی نہ تھی - مگر فارسی اور عربی کو چھوڑ کر جب سے اردو کی بنیاد پڑی ' ہندستانیوں نے جو اردو میں کمال حاصل کیا ہے اس پر کسی غیر ملک والے کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے - میر ' سودا ' ذوق ' غالب و مومن ' آتش و ناسخ ' انیس و دبیر اردو کے مالک تھے ' انھوں نے جن ترکیبوں اور محاوروں کی بنیاد ڈال دی خواہ وہ فارسی اور عربی کے لحاظ سے صحیح ہوں یا غلط ' وہ اردو میں مروج ہو گئے ' بہ حیثیت بانیاں زبان اُن کو یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہتے اردو ترکیبوں کو قائم کرتے ' ان کی زبان ٹکسالی زبان ہو گئی - اُن کے محاورے یا ترکیبوں سے اختلاف کرنا یا تجاوز کرنا غلطی میں شمار ہوتا ہے - اسی طریقے سے عصر موجودہ کے جو اساتذہ ہیں اُن کو بھی پورا اختیار ہے کہ نئے خیالات و محسوسات کو مناسب طریقے سے اردو میں ادا کریں ' ممکن ہے کہ بعض اوقات اُن پر بھی نکتہ چینی ہوتی ہو مگر رفتہ رفتہ ہم اُن کی ایجادوں کے بھی عادی ہو جائیں گے - اور اُن کی ترکیبیں بھی زباں میں داخل ہو جائیں گی -

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زبان اپنی ملکیت ہے اس کو جس طرح ہم چاہیں استعمال کر سکتے ہیں اور اُس میں حسب ضرورت جو ترقی چاہیں ' کر سکتے ہیں ' کسی شخص غیر کی رائے یا اجازت کے ہم محتاج نہیں - ہماری زبان ہمارے محسوسات و جذبات کی ترجمان ہے ' جو نہ انگریزی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی دوسری زبان - میں اسی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوشاں رہا کہ اردو کی ترقی ہو ' مگر

میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ جب اردو کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندی کی کیوں نہ ترقی ہو ؟ میں نہ ہندی کا بدخواہ ہوں اور نہ دشمن ' گو اکثر ہندو اصحاب کا یہ خیال ہے کہ مجھ پر اردو یا فارسی کا اس قدر رنگ جما ہوا ہے کہ میں قریب قریب نیم مسلمان ہوں ' میں نے نہ کبھی یہ کہا اور نہ اُس کی کوشش کی کہ ہندی کی ترقی نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ پانچ برس کی عمر سے جب کہ میری تعلیم شروع ہوئی ہے مجھے اردو اور فارسی کا شوق رہا ہے اور اکثر انھیں زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں - اٹھاون برس کی عمر میں نئے نئے شوق ذرا پیدا ہونے دشوار ہوتے ہیں - اگر کسی کو یہ شکایت ہے کہ میں نے ہندی اور سنسکرت کیوں نہیں پڑھی تو اس کا جواب جہاں تک کہ میرے عالم طفولیت کا زمانہ ہے میں نہیں بلکہ میرے بزرگ ہو سکتے تھے - اور میرا خیال یہ ہے کہ میری عمر کے اکثر ہندوؤں کی یہی کیفیت ہے ' پچاس برس پیشتر اس صوبے میں کم سے کم اُن اطراف میں جہاں میں پیدا ہوا اور میری تعلیم ہوئی ' متوسط درجے کے ہندوؤں میں عام طور پر یہی رواج تھا کہ اردو اور فارسی میں اُن کی تعلیم شروع ہوتی تھی خواہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اردو اور فارسی زبان ذریعۂ معاش تھی ' خواہ کوئی اور وجہ ہو ' لیکن واقعہ یہی ہے کہ دہلی میں جہاں میرے بزرگ رہتے تھے اور اس کے قرب و جوار میں جہاں میری تعلیم ہوئی یہی رواج تھا - اُسی رواج کے مطابق میری بھی تعلیم ہوئی مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ہندو ادب سے بالکل ناواقف ہوں یا میں نے واقفیت حاصل کرنے کی اپنے فرصت کے اوقات میں کوشش نہیں کی ' میرا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی ہندستانی اپنے تئیں ہندستانی کہنے کا مستحق نہیں ہے تاوقتیکہ وہ ہندو اور اسلامی تہذیب و ادب سے تھوڑی بہت

واقفیت نہ رکھتا ہو - میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی اکثر یہ شکایت کرتا ہوں کہ انہوں نے ہندو تاریخ اور ہندو تہذیب و تمدن سے واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی - اگرچہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد مل سکتی تھی جنہوں نے ہندو ادب میں بھی ایک خاصہ درجہ پیدا کرلیا تھا - تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ ایک مسلمان نو جوان مجھسے ملنے آئے انہوں نے تاریخ میں ایم - اے ، پاس کیا تھا - یونان ، روم اور یورپ کی تاریخ سے انہیں خاصی واقفیت تھی لیکن ہندو زمانے سے وہ بالکل ناواقف تھے اور اس کا انہوں نے اقبال بھی کیا - اسی طرح اکثر ہندو ایم - اے بھی ایسے ملینگے جن کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن سے مطلق واقفیت نہیں -

جب ایک معمولی تعلیم یافتہ ہندو کو یہ تعلیم دی گئی ہو کہ مسلمان ہندوستان کو لوٹنے کے لئیے آئے تھے ، محمود غزنوی نے سترہ حملے کئیے ، مسلمان بت شکن تھے ، انہوں نے آکر جابرانہ طور پر یہاں ۶۰۰ برس تک حکومت کی تو کسی کو کیوں تعجب ہو کہ وہ مسلمانوں سے دل میں نفرت رکھتا ہے ، اسی طرح اگر کسی مسلمان بچے کو شروع سے یہ تعلیم دی جائے کہ ہندو جتنے ہیں سب بت پرست ہیں ، ان کے دینیات میں بجز تعصبات کے اور کچھہ نہیں ہے ؛ اور یہ مسلمانوں کے زیر حکومت ۶۰۰ برس تک رہ چکے ہیں اور اب مسلمانوں سے تاریخی انتقام لینا چاھتے ہیں تو کیا تعجب ہے اگر مسلمان ہندو سے نفرت کرے - اس چالیس برس کے اندر جس طرح کے بیج ہم نے بوئے ہیں اُسی طرح کے درخت اور اُسی طرح کے پھل ہمارے سامنے آرہے ہیں - اور اس پر ہر شخص کو دعویٰ نیشنلزم کا ہے -

آج کل یہ تماشہ ہورہا ہے کہ ہندؤں کے تعلیم یافتہ طبقے میں کھانے پینے کی تو عام طور پر قیدیں اٹھ گئی ہیں ' بلا تکلف ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھہ عام جلسوں میں یہاں ؛ یا غیر ملکوں میں جب جاتے ہیں تو خورو نوش جائیز رکھتے ہیں مگر یہی حضرات جب سیاسی معاملات میں گفتگو یا تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے گویا کچھہ واسطہ ہی نہ تھا - اس سے بہتر تو ہمارے بزرگ تھے جو پابند قیود تھے لیکن چشم مروت رکھتے تھے ' آپس میں دوستی اور اخلاص کا تعلق رکھتے تھے - ممکن ہے کہ یہ بے اعتمادی اُس آزادی اور پولیٹکل طاقت کا پیش خیمہ ہو جس کا ہم سب دم بھرتے ہیں - جہاں اور نزاعات کی باتیں ہیں وہیں ایک زبان کا بھی مسئلہ ہے ' اپنے دل کے بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی کے لفظ ہندستانی استعمال کرنا چاہئیے ؛ ممکن ہے کہ چالیس یا پچاس برس پیشتر اس لفظ ہندستانی کا استعمال جائیز ہوتا لیکن اس وقت تو میرے خیال میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کو بہلانا مقصود ہے یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا - واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جارہی ہیں ' اردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کردیں ' اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دئے جائیں - پس میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے کہ ایسی اردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندستانی کا لقب دے سکتے ہیں - مجھہ کو تو اس کا خوف

ھے کہ اگر یہی لیل و نہار رھے تو وہ زمانہ دور نہیں جب کہ اردو داں
کو ھندی داں سے گفتگو کے وقت ایک ترجمان کی ضرورت ھوگی
اور اسی طرح اس کا بر عکس - اگر واقعی ھم لوگوں نے یہ طے کر
لیا ھے کہ اسی طریقے سے اردو اور ھندی کی علحدہ علحدہ ترقی ھو
اور جو کچھہ نتائج ھوں برداشت کریں تو کیوں نہ جرائت کے ساتھہ
ھم اس کو مان لیں کہ اردو دانوں کو اردو کی ترقی کا استحقاق حاصل
ھے اور ھندی دانوں کو ھندی کی ترقی کا - میرے خیال میں اگرچہ
یہ بہتر ھوتا کہ ھندستانی یعنی ایسی مشترکہ زبان جس کو عام
طور پر ھندو اور مسلمان سمجھہ جاتے رائج ھوتی' لیکن اب اگر یہ نا ممکن
ھوگیا ھے تو ھم کم از کم یہ کر سکتے ھیں کہ غیر مانوس عربی
اور فارسی کے الفاظ اردو سے اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ ھندی
سے خارج کرنے کی کوشش کریں - کچھہ عرصہ ھوا کہ ایک وصیت
ایک ھندو صاحب نے ایک وکیل صاحب کی معرفت میرے پاس
بھیجی - میں نے اُسے دو مرتبہ سنا ' ھندی میں لکھی ھوئی تھی -
ستر فیصدی الفاظ میں نہیں سمجھہ سکا - ایسے ایسے قانونی
الفاظ سنسکرت کے اس میں لکھے گئے تھے جو میں نے اپنے اڑتیس برس
کے تجربے میں کبھی نہیں سنے تھے - آخرکار جب اُس کا ترجمہ انگریزی
میں میرے سامنے پیش کیا گیا اس وقت میں قانونی رائے دے سکا
اب ایسی دستاویز کو میں کیا کہوں ' اردو ' ھندی یا ھندستانی ؟ -

میں اگرچہ سیاسی معاملات کے متعلق بہت کم عرض کرنا چاھتا
ھوں لیکن جو کچھہ میں نے اوپر اشارہ کیا ھے وہ محض اس وجہ سے
کہ زبان کا بہت کچھہ تعلق سیاسی نظام سے ھوتا ھے - یورپ کے بعض
ممالک میں مثلاً پولینڈ یا السیس لورین میں جو زبان کے متعلق آپس

میں جھگڑے ہوئے ہیں اور اُن سے جو نتائج پیدا ہوئے ان سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہئے ، مگر وہاں تو یہ تھا کہ فاتح اور مفتوح کے درمیان تنازعے تھے ، یہاں یہ کیفیت ہے کہ یہ جھگڑے فاتح اور مفتوح کے درمیان نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے باشندوں میں اور اس پر لطف یہ کہ دونوں خواہاں آزادی ہیں -

میں نے رواروی میں اپنے مکرم دوست مولوی اصغر صاحب مدیر رسالۂ ہندستانی کی فرمائش اور تقاضے کی وجہ سے اپنے چند خیالات کا غیر مسلسل طور پر اظہار کیا ہے ، ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو میرے خیالات سے اختلاف ہو ، مگر میں انہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے یہ خیالات مخلصانہ ہیں -

راس لیلا

(از مولوی حبیب الرحمان شاستری)

مجھے بحیثیت مسلمان ' کرشن کی راس لیلا سے وہ تعلق نہیں ہوسکتا ' جو ایک ہندو کو ہونا چاہئے ' لیکن ایک خاص معنی کے لحاظ سے اوتار ' یا مظہر کمالات ربانی مہاراج کرشن کی اعلیٰ روحانی منزل کا یہ عجیب و غریب مظاہرہ صرف ظاہر بینی کی بنا پر آج کل قابل اعتراض خیال کیا جاتا ہے اس لئے میرے خیال میں ہر منصف شخص کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اس روحانی فعل کی للہیت کو واضح کرے -

نظر برآں ہندوستان کی مشہور روحانیت اور تصوف (ویدانیت سے ذوق رکھنے والے حضرات کی خدمت میں مضمون ہذا کے سلسلے میں خیالات ذیل کا پیش کرنا غیر مناسب نہ ہو گا -

زبان سنسکرت میں تشبیہ اور استعارہ کی بھر مار کی وجہ سے کسی حد تک یہ کہنے کا موقعہ ضرور ہوسکتا ہے ' کہ کرشن اور گوپیوں سے مراد انسان اور اُس کی خواہشات ہیں : جو اُسے طرح طرح کے ناچ نچایا کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ - اس قسم کی تاویلات سے بعض لوگوں کی تسکین ہوجاتی ہے - لیکن میرے خیال میں یہ تاویلات اس جماعت کے لئے کافی نہیں ہیں جو گہرائی میں گھسنے کی عادی ہے اور ویاس جی کے سیدھے سادے الفاظ سے ہٹنا نہیں چاہتی ' نہ اسی کو ماننے کے لئے تیار ہے کہ جناب ویاس فرضی قصوں کے پیرائے میں اپنی ہدایتیں پیش کیا کرتے تھے - نیز اس لیلا میں اگر انسان کے لئے کوئی خاص اہم ہدایت اور روحانی اسرار مضمر نہیں تھے ' تو یہ چیز کرشن جیسے

مہتمم بالشان ہستی کے ساتھہ منسوب ہی کیسے ہوگئی ' اور نہ صرف منسوب ہوگئی بلکہ آج تک نظر عقیدت سے دیکھی جاتی ہے ' اس کے علاوہ میں جانتا ہوں کہ خدا کی طرف لے جانے والا علاوہ سلوک (کرم کانڈ) کے کبیر ' سور ' اور بلبھی والا ایک راستہ عشقی بھی ہے ' اس لئے میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ کے خیال سے متفق ہو کر نہایت آزادی سے کہہ سکتا ہوں ' کہ باوجود تمامی طریقوں سے واقف ہونے کے بھی کرشن کی اپنی اصلی چال مسجد اور مندر سے الگ ' ایک نسبت عشقی تھی ' لہذا اس نسبت عشقی کی غیر معمولی کشش اور اس کے ضروری لوازم پر غور کرنے کے بعد ' میرا غالب خیال ہے کہ اگر اصلی گوپیاں ہی کرشن کی شیدائی ہوکر راس لیلا کا باعث ہوئی ہوں تو بھی کسی معترض کو اعتراض کا حق نہیں ہو سکتا ' حضرت مرزا صاحب موصوف کا خیال مذکور حسب ذیل ہے -

† " ایک دن کسی شخص نے اُن کے سامنے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آگ سے بھرا ہوا ایک جنگل ہے اور کرشن آگ کے اندر ہیں اور رام چندر اُس آگ کے کنارے پر ' ایک شخص نے اس خواب کی تعبیر میں کہا کہ کرشن اور رام چندر بڑے کافروں میں سے ہوں اس لئے دوزخ کی آگ میں عذاب پارہے ہیں - فقیر (مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ الله علیہ)

---

† روزے شخصے در حضور ایشان گفت در خوابے دیدہ ام کہ صحرائیست پُر از آتش و کشن درون آتش است و رام چندر درکنار آن آتش - شخصے در تعبیر آن خواب گفت کہ کشن و رام چندر از کبرائے کفار اند - در آتش دوزخ معذب اند - فقیر گفت ایں خواب را تعبیرے دیگر است بر شخصے معین از گزشتگان بے آن کہ کفر با واز شرع ثابت شود حکم بکفر جائز نیست - از احوال ایں ہر دو کتاب و سنت ساکت است و بہ‌اقتضائے -

" آیتہ شریفہ = وان من قریۃ الاخلافیہا نزیر " ظاہر است کہ دریں جماعۃ نیز بشیرے ونذیرے گذشتہ باشد -

نے کہا اس خواب کی تعبیر دوسری ہے ' گزرے ہوئے کسی خاص شخص پر بلا اس کے کہ اُس کا کفر آواز شرعی سے ثابت ہو حکم کفر لگانا جائز نہیں ہے ' ان کے احوال سے قرآن و حدیث دونوں خاموش ہیں اور '' کوئی بستي ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گذرا ہو '' اس اقتضائے قرانی کے مطابق اِس جماعت میں بھي بشیر و نزیر (خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا) گذرا ہوگا -

† اس حالت میں احتمال ہے کہ یہ نبی یا ولي ہوں - رام چندر چونکہ پیدائش اجلہ کے شروع میں پیدا ہوئے اور اس وقت عمریں بڑی اور قوتیں زیادہ تھیں ' اس لئے وہ زمانے کے لوگوں کو نسبت سلوکی (کرم کانڈي طولانی راستہ) سے تربیت کرتے تھے اور کرشن ان کے بزرگوں میں آخری ہیں ' اس وقت بمقابلہ پہلے کے عمریں کم اور قوتیں ضعیف ہوگئی تھیں اس لئے انہوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو نسبت جذبی (عشق یا بھگتي کي راہ) سے ہدایت کی - گانے بجانے کی زیادتی جو ان کے متعلق بیان کی جاتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے ' کہ انہیں نسبت جذبہ سے ذوق و شوق تھا - لہذا نسبت عشق و محبت کي حرارتیں آتشی جنگل کی صورت میں ظاہر ہوئیں اور کرشن چونکہ محبت کي کیفیتوں میں مستغرق تھے اس لئے آگ کے اندر ظاہر ہوئے -

---

† دریں صورت محتمل است کہ اینہا ولی یا نبی باشند - رامچندر کہ در ابتدائے خلقت جن پیدا شد - در اں وقت عمرها دراز وقوتها بسیار بود اهل زمانہ را بہ نسبت سلوکی تربیت می کرد - وکشن آخریں بزرگان اینہا است و دریں وقت نسبت بہ سابق عمرها کوتاہ وقوتها ضعیف گردید - پس اهل زمانۂ خود را بلانسبت جذبی هدایت می کرد کثرت غنا و سماع کہ ازوئے منقول است دلیل است بر ذوق و شوق نسبت جذبہ - پس حرار نہائے نسبت عشق و محبت بہ صورت صحرائے آتش نمودار شد - کشن کہ مستغرق کیفیتہائے محبت بود درون آتش ظاهر گردید -

†† اور رام چندر نے چونکہ سلوک کا راستہ رکھا ' اس لئے اس کے کنارہ پر نمودار ہوئے - زیادہ اللہ جانتا ہے - حضرت حاجی صاحب نے بہت پسند کیا اور اس تعبیر سے بہت خوش ہوئے '' -

اس مختصر تمہید کے بعد گذارش ہے کہ مہاراج کرشن چونکہ جوگیوں کے سر تاج تھے اس لئے ان کی راس لیلا (ایک روحانی کرشمہ جس کو اکثر لوگ رقص و سرود ہی تک محدود جانتے ہیں) کی اندرونی حقیقت جاننے کے لئے جوگیانہ ادراک سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے - کون نہیں جانتا کہ انسان انفرادی (اشیاء عالم میں باہمی فرق دکھانے والی نظر جس کی وجہ سے زید عمرو سے علیحدہ معلوم ہوتا ہے) اور اجتماعی (وہ باطنی نظر جس کے اثر سے عالم میں ایک ہی انا دکھائی دیتا ہے) دونوں ادراکوں کا سر چشمہ ہے ' اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ارادوں اور افعال میں بھی ان دونوں کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے ' چنانچہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جب انسان پر انفرادیت یا خود غرضی کا غلبہ ہوتا ہے ' تو اپنے ذاتی فائدہ کے لئے اس بیٹے تک کے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے جسے اس نے خود اپنا ہی خون اور پسینہ

---

†† و رامچندر کہ راہ سلوک داشت در کنارۂ آن پدیدار شد - واللہ علم حضرت حاجی صاحب رحمۃاللہ علیہ بسیار پسندیدند وازیں تعبیر خوش شدند ''

مقامات مظہری مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی صفحہ ۲۳ فصل ششم در استفادۂ از حاجی محمد افضل رحمۃاللہ علیہ -

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب نے بھی ایک استفسار کے سلسلے میں بعینہ اسی عبارت مندرجہ بالا کا ترجمہ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃاللہ علیہ سے نقل فرمایا ہے -

ارشاد رحمانی مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ در حالات حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی - صفحہ ۴۴ -

ایک کرکے پالا تھا - اس کے ساتھہ ھی ساتھہ بعض اوقات کسی غیر کے بھی شیر خوار بیکس بچے کو بھوک اور پیاس سے تڑپتا دیکھہ کر اسی انسان کا کلیجہ ھل جاتا ھے اُس کی بھوک اِس کی بھوک اُس کی پیاس اِس کی پیاس ھوجاتی ھے - اور اس اتحادی کیفیت کے سیلاب میں انفرادیت کی دیواریں متزلزل ھو جاتی ھیں - یہاں تک کہ یہی اپنے بیٹے کے قتل کا ارادہ کرنے والا انسان ' اس مصیبت زدہ کی راحت کے لئے اُس دولت کے خرچ سے بھی دریغ نہیں کرتا ' جس کے لئے خود اپنی اولاد سے بھی برسر پیکار ھوچکا تھا - غرض کہ اپنے گوشت و پوست کی روح اور جوھر اصلی سے بنے ھوئے اپنے کو غیر سمجھنے اور غیر کو اپنا جان کر گلے لگانے کا مادہ ' فطرت انسانی میں موجود ھے - ظاھر ھے کہ اُن میں سے پہلے کا سر چشمہ ' ادراک انفرادی یا خود غرضی ھے ' اور دوسرے کی بنیاد ' وہ اجتماعی یا عالمگیر باطنی انآ کا اندرونی ادراک ھے ' جس کی تحریک سے انسان موجودہ قومی رھنماؤں کی طرح ' وقتاً فوقتاً دوسروں پر قربان ھوتا ھوا نظر آتا ھے ' نیز اپنے عمل سے دنیاء مادی و انفرادی کے سب سے زود اثر ' اور ھیبت ناک اسلحہ یعنی تیر ' تلوار ' توپ اور تفنگ کو خاک کے ذروں سے بھی زیادہ بے وقعت سمجھکر ' اشیاء عالم اور ان کے اثرات کی واقعیت نما غیر واقعیت کی قلعی کھولتا ھے - پس ان دونوں ادراکوں میں سے عوام تو پہلے کو واقعی اور اصلی سمجھکر اسی پر جم جاتے ھیں ' لیکن جوگی یا صوفی اس خواب کی سی ھستی سے ابھرتا ھے اور اپنے باطن سے متحد ھونے کی وجہ سے اس کیفیت بیداری کا احساس کرتا ھے جس میں خواب آسا انفرادیت ' عالمگیریت میں محو ھو جاتی ھے - اس ساری

تحریر سے میرا مطلب یہ ہے کہ جوگی یا ولی کی اصلی حالت ، عام طالبان خدا کی حالت سے مختلف ہوتی ہے ' گیتا بھی کہتی ہے -

(۱) " سب جگہہ مساوی نظر رکھنے والا جوگی اپنے کو موجودات عالم میں اور اپنے میں موجودات عالم کو دیکھتا ہے "

(۲) "جو شخص وحدت سے وابستہ ہوکر مجھہ کل موجودات میں رہنے والے کی بندگی کرتا ہے ' وہ جوگی ہر حالت میں رہتا ہوا بھی مجھہ ہی میں رہتا ہے "

(۳) " جو رنج سے رنجیدہ نہیں ہوتا اور راحت کا آرزو مند نہیں ہوتا - نیز جو رغبت و خوف اور غصہ سے مبرا ہو چکا ہے ' وہ سلیم‌العقل ملی (جوگی) کہلاتا ہے "

(۱) تمامی جانداروں کی جو رات ہے ان میں متقی جوگی جاگتا رہتا ہے اور جس رات (لذات مادی میں غافل ہو جانے کی رات) میں تمام جاندار جاگتے ہیں وہ حقیقت میں جوگی کی رات ہے -

گیتا کے یہ اقوال جوگی کی حالت ظاہر کرتے ہیں کہ عوام سے برعکس ہے - جوگیانہ ادراک کے معنی بیان کرنے کے بعد اب میں راس لیلا کی لفظی تحقیقات کرکے ہندو شاستر کے مطابق اس کا صحیح مفہوم پیش کرنا چاہتا ہوں - اس سلسلے میں گذارش ہے

१—सर्वभूतस्थमात्मानं सर्वभूतानिचात्मनि ।
ईक्षते योगयुक्तात्मा सर्वत्रसमदर्शिनः ।। (गीता अ० ६-२९)

२—सर्वभूतस्थितं यो मां भजत्येकत्वमास्थितः ।
सर्वथावर्तमानोऽपि स योगीमयिवर्तते ।। (गी० अ० ६-३१)

३—दुःखेष्वनुद्विग्नमना सुखेषु विगतस्पृहः ।
वीतरागभयक्रोधःस्थितधीर्मुनिरुच्यते ।। (गी० अ० २-५६)

که برادران وطن کا بعض مذهبی کتب کی بنا پر یه قدیم عقیده
هے ' که اس لیلا کے دیکهنے ' سننے ' پڑهنے اور نقل کرنے سے نروان [1]
یعنی نجات کامل حاصل هوتی هے - نیز اُن کا لٹریچر یه بهی بتاتا هے -
که نجات چونکه مفروضات دنیا سے چهٹ کر واصل بالله (ब्रह्म में लय)
هونے کا نام هے ' اس لئے اس کا حصول بغیر عرفان الٰهی (ब्रह्मज्ञान)
کے ممکن نهیں - ان خیالات کے هوتے هوئے هر جویاے حقیقت کا فرض
هے ' که وه سب سے پهلے راس لیلا کے ایسے مفهوم کی جستجو کرے ' جو
خیالات مذکوره سے پورے طور پر چسپاں هوکر ' ان کے پهلو به پهلو
چلنے کی صلاحیت رکهتا هو - اور چونکه مفهوم مذکور کی تشریح سے
پهلے اوتار کا مسئله مدنظر رکهنا ضروری هے ' اس لئے مختصراً گذارش
هے که هندو محققین نے اوتار کو حسب ذیل طریقه سے سمجها هے -

خدائی طاقتیں هر ذی شعور اور غیر ذی شعور میں اپنا ظهور کرتی
هیں ' اُن طاقتوں کا باهمی تناسب سمجهنے کے لئے اُن کے سوله درجے
(कलायें) فرض کئے گئے هیں - اس کے ساتهه هی ساتهه یه بهی مانا گیا
هے که عام مخلوق میں ایک سے لیکر کمالات ربانی کے آٹهه درجے تک ظاهر
هو سکتے هیں - لیکن اس کے بعد اوتار کا مرتبه هے یعنی نو درجه سے
لیکر سوله تک کے کمالات ' جس هستی میں ظاهر هوں گے وه اصطلاحاً
اوتار ' برهم ' خدا کهی جائیگی - اس تشریح سے یه امر واضح هوگیا که
سوله درجه کے اوتار میں چونکه نو سے لیکر پندره تک یعنی سات
اوتاروں کے درجات کمالیه بهی شامل هیں ' اس لئے اس اوتار کو
مجازاً خدا ' برهم یا کامل اوتار (पूर्णावतार) بهی کها جاسکتا هے -

---

१—या निशा सर्वभूतानां तस्यां जागर्ति संयमी ।
यस्यां जाग्रति भूतानि सा निशा पश्यतो मुने : ।। (गी० २—६९)

اوتار کی اس حقیقت اور راس لیلا کے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی لفظی تحقیق یوں ہونی چاھئے ' اس لفظ کے دو ٹکڑے ھیں راس اور لیلا ' لفظ راس رس سے (तस्य समूह:) بنایا گیا ھے اور پشر کے قول (रसोवैस: ' خدارس ھے) کے مطابق ' رس ' کے معنی برھم یا خدا کے ھیں اس لئے راس کے معنی حسب تشریح بالا سولہ درجہ کے کامل اوتار یا مجموعی برھم (पूर्णावतार) مہاراج شری کرشن کے ہوئے اب لفظ لیلا پر غور فرمائیے ' لیلا مرکب ھے ؛ لی اور لا کا - 'لی' مصدر کے معنی ھیں فنا ھوجانا (लय हो जाना) اور لا کے معنی ھیں لینے کے - اس طرح یہ لفظ فنایت حاصل کرنے والے فعل یا کرشمۂ مخصوص کے معنی ظاھر کرتا ھے ' اس لئے راس لیلا کے معنی ھوئے کامل اوتار یا (पूर्णब्रह्म) میں فنایت (लयता) حاصل کرانے والا کرشمۂ مخصوص - مقصد یہ ھے کہ اِسی لیلا کے ذریعہ سے کامل اوتار یا کرشن برھم نے گوپیوں کو اپنے میں فنا کرکے درجۂ فنا فی‌اللہ تک پہنچایا -

گوپیاں کرشن میں فنا (لے) ھوکر درجۂ فنایت تک کیسے پہونچیں اس کی تشریح حسب ذیل ھے -

پرانوں کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے - کہ کرشن جی کے ساتھہ گوپیوں کی محبت کا درجہ ' عشق کامل تک پہونچ گیا تھا - اور اس درجہ کا یہ لازمی نتیجہ ھے ' کہ عاشق کا قلب ماسوا محبوب سے خالی ھوکر ' اسی میں سما جائے - کیونکہ عشق کامل کے معنی ھیں کسی چیز کی طرف پوری چاھت یا طلب کا ھونا - اور چاھت اس وقت تک پوری چاھت نہیں کہی جا سکتی ' جب تک کہ قلب ھمہ تن یکسو ھوکر اپنی پوری قوت اور توجہ ایک ھی طلب میں نہ لگادے - اور جب قلب کی پوری توجہ ایک چیز میں لگ گئی ' تو پھر اس میں سوائے

محبوب کے کسی کا گذر ھی نہیں ھوسکتا ' لہذا یہ بالکل صحیح ھے کہ عشق کامل میں عاشق کا قلب محبوب کے سوا جملہ اشیاء سے خالی ھوجاتا ھے -

در دل عاشق چو عشق آتش فروخت
ھرچہ جز معشوق بود آنرا بسوخت

اور یہی مطلب ھے " العشق نار یحرق ماسوا المحبوب " کا یعنی عشق ایک آگ ھے جو محبوب کے سواء دنیا و مافیہا کو جلا دیتی ھے ' اس حالت میں عاشق کا دل دوسری تمام چیزوں سے توٹ کر صرف ھستئی محبوب سے مربوط ھوجاتا ھے - لذات نفسانی کی تمنا کیسی ؟ جسم جسمانیات کا احساس کہاں - انسانی ھستی کی کل کائنات ھی دریاء عشق میں غرق ھوجاتی ھے - جیسا کہ شعر ھذا[1] سے ظاھر ھے - "جب میں سر سے پیر تک تیری تمنا میں خرچ ھوچکا ' تو کچھہ باقی ھی نہ رھا کہ دوسری تمنا کروں "

اس محویت تامہ کے عالم میں جب محب و محبوب کے بیچ کا پردہ اُتھہ جاتا ھے تو محب وہ محب اور محبوب وہ محبوب نہیں رھتا ھے - بلکہ اس وقت کی حالت قوت گویائی کے حدود سے بالا تر ھوجاتی ھے - جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاھر ھوتا ھے -

کہوں کیا کہ خلوت خاص میں جو حجاب بیچ سے اُتھہ گیا
نہ وہ تم رھے نہ وہ ھم رھے جو رھی سو بے خبری رھی

مصرع ثانی سے ثابت ھوتا ھے کہ عاشق کا اصلی مقصود محبوب کا جسم نہیں ھوتا بلکہ اس کا منتہاے نظر چوں و چگوں کے حدود سے

۱- چو من ز سرتا پای خود صرف تمنایت شدم * ھیچم نہ ماندہ تاز نو حرف تمنائے دگر-

باهر ' وہ گنگ کردینے والی بے صورت ' لطیف تجلی هوتی هے ' جس کے ظہور کی طرف " نہ وہ تم رهے نہ وہ هم رهے الخ " میں اشارہ کیا گیا هے اور ظاهر هے کہ یہ وهی آفتاب حسن هے جس کی کرنوں کی چمک سے مہ جبینان عالم کے چهرے دمک رهے هیں ' اور جو تمامی موجودات کے وجود سے ماورا رهکر انکو چمکا رها هے -

اسی کی شوخی شرار میں هے ' اس کی گرمی چنار میں هے
وہ آپ هر سبزہ زار میں هے ' وہ لالہ هر کوهسار میں هے

عشق کی اسی منزل کے لئے کہا گیا هے " العشق نار و اصل فی الذات رب العالمین " یعنی عشق ذات خداوندی سے ملا دینے والی ایک آگ هے - بعضوں نے تو یہانتک کہا هے کہ " العشق هو اللہ هو اللہ هو اللہ انیس العاشقین میں ارشادات حضرت مخدوم شاہ حسام الحق مانکپوری رحمۃ اللہ علیہ میں بهی اسیکی وضاحت هے اسی کو پلٹ کر بعض شعراء مغربی نے یوں کہا هے - کہ عشق خدا هے اور خدا عشق -

اس مقام پر یہ خیال پیدا هونا صحیح نہیں ' کہ هر عاشق اپنے محبوب میں فنا هوکر درجۂ فنافی اللہ تک پہونچ جاتا هے - کیونکہ یہ اسی کا درجہ هے جو جسم سے پرے دریائے وحدت بیرنگی میں غرق هوچکا هو ' یا یہ کہ گوپیونکی طرح اس کی لو کسی ایسے مظہر کامل (पूर्णावतार) سے لگی هو ' جس کے جسم مادی سے بهی آتشی شیشے کی طرح آفتاب بیرنگی کی کرنیں نکل رهی هوں - اس عینیت محبوبی کے مسئلے کو یوں بهی سمجهہ سکتے هیں ' کہ مذاهب نے روح کو متفقہ طور پر ایک انتہائی جوهر لطیف تسلیم کیا هے اور فلسفۂ طبیعہ کی تحقیقات سے بهی یہ امر ثابت هوچکا هے کہ وہ چیز جتنی زیادہ

لطیف ہوتی ہے ' اس میں اتنی ہی زیادہ نرالی طاقت بھی پائی جاتی ہے ' جیسا کہ ہوا بھاپ اور بجلی وغیرہ لطیف اشیاء کے حیرت انگیز واقعات سے ظاہر ہوتا رہتا ہے ' لہذا روح چونکہ تمام اشیاء سے زیادہ لطیف ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں طاقت بھی سب سے زیادہ تحیر خیز اور نرالی پائی جائے - پھر کیا وجہ ہے کہ روح کی اس غیر معمولی طاقت کا صدور کسی ایک متنفس سے بھی نہیں ہوتا ؟ اسکی وجہ سوا اس کے اور کچھہ نہیں ہوسکتی کہ روح غلبۂ عشق میں جسم انسانی سے مربوط ہوکر اسی طرح جسم ہوگئی ہے جسطرح قلمی پود سے بندہ کر تخمی پیڑ بھی قلمی ہوجاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ روح کی اپنی اصلی طاقت اسوقت ضرور ابھر آتی ہے جبکہ اس کے اوپر سے جسم اور جسمانیات کے خیالات کا تسلط اتھہ جاتا ہے -

جوگی یا صوفی جب دنیا و مافیہا سے مڑکر اپنی انا یا حقیقت روحانی میں ڈوب جاتا ہے تو اس کی روح کی ابھری ہوئی طاقت ہی سے وقتاً فوقتاً حیرت انگیز تماشے ہونے لگتے ہیں - ورنہ اگر انسان کی روح میں غیر معمولی طاقت پہلے سے موجود ہی نہوتی تو اب کہاں سے آکر کمالات مذکورہ کو ظاہر کرتی ؟

یوگ درشن باب ایک - مقولہ مختصر (سوتر) اکتالیس [1] سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح بلور اپنی متصل چیز کا اثر قبول کرکے اسی کے رنگ روپ میں رنگ جاتا ہے - اسی طرح وہ قلب جو دنیا و ما فیہا سے خالی ہوتا ہے جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے اس کی شکل میں ڈھل جاتا ہے - اس امر کی مفصل توضیح ہوجانے کے بعد کہ عاشق محبوب کی

१—क्षीणवृत्तेरभिजातस्येव मणेर्ग्रहीतृग्रहणग्राह्येषु तत्स्थतदञ्जनता समापत्तिः (यो० १-४१)

صفات سے متصف ہوکر عین محبوب ہوجاتا ہے ' یہ امر خود بخود صاف ہوگیا ' کہ ہر عاشق درجۂ فنافی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا - کیونکہ جب عاشق میں محبوب کی صفات کا آنا ضروری ہے : تو جو شخص کسی خواہشات نفسانی کے مجسمہ سے محبت کر کے اس کے جسم ہی کو مقصود اصلی قرار دیگا اس میں بھی لازمی طور پر نفسانیت اور انفرادیت وغیرہ اس کے ادنیٰ صفات ہی سرایت کرینگے اور ظاہر ہے کہ ان صفات سے فنایت فی اللہ کوسوں دور ہے - لیکن برخلاف اس کے گوپیوں کی لو ایک ایسے جوگیوں کے سرتاج سے لگی تھی جو کمالات ربانی کا آئینہ تھا لہذا ان کے لئے جو گیشور (جوگیوں کے سرتاج) کرشن کی صفت جوگ سے متصف ہوکر فناعت تک پہونچ جانا ایک معمولی امر تھا - گوپیوں اور کرشن کی محبت کے سلسلے میں مجھے یہ اور عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گوپیوں کو کرشن سے محبت تھی - لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کرشن کو کیا محسوس کرتی تھیں ایک محیط کل عالمگیر روحانیت (آتما) یا جسم محدود - اس کا جواب خود اُنہیں کی زباں سے سنئے -

''آپ [۱] یقیناً یشودا کے لڑکے نہیں ہیں بلکہ آپ تو تمامی ارواح میں اپنے آپ کو دیکھنے والے ہیں'' گوپیوں کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرشن کو وہی محیط کل روح آعظم یا اصلی ہستی سمجھتی تھیں جس کے بیان سے گیتا کے ابواب پُر ہیں - ایسی حالت میں غور طلب یہ مسلہ ہے کہ وہ ان کے جسم محدود سے محبت رکھتی تھیں یا ان کے اصلی اور محیط ہستی سے' جواب ظاہر ہے کہ جسے وہ کرشن سمجھتی تھیں '

१—नखलुगोपिकानन्दनोभवानखिलदेहिनामन्तरात्मदृक् । (श्रीमद्भागवत स्कं० १० अ० ३१ श्र० ४)

اسی سے محبت کرتی تھیں - نیز جب اصلیت اور صفات کمالیہ سے متصف عالمگیریت سامنے آگئی تو جسمی حدبندی اور نمایشی وجود کا گزرھی کہاں ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اصلیت کي موجودگی میں کوئی شخص فرضي یا نمایشی چیز کو پسند کرے ؟ - بلکہ واقعہ تو یہاں تک ھے کہ حقیقت اور اصلیت کھل جانے پر فرضي اور نمایشي چیز کی نوعیت کي تمام چیزیں ؛ دل سے اتر کر کالعدم ھوجاتی ھیں - چنانچہ بھاگوت کو بغور پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ گوپیوں کا دل جسم و جسمانیت کی گرفت سے کسی حد تک آزاد ھوچکا تھا - اس میں اجسام کی غیر واقعیت کا خیال اس حد تک جاگزیں ھوگیا تھا کہ بعض اوقات وہ واقعی اور غیر واقعي میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتی تھیں اور جسم واقعي کا کام غیر واقعي (خیالي) سے لینے لگي تھیں - جیسا کہ کرشن کے غائب ھوجانے پر ان کے قول " میں [1] ھي کرشن ھوں " سے ظاھر ھوتا ھے کیونکہ گوپیوں کا جسم عام نقطۂ نظر سے تو کرشن تھا ھي نہیں - لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے کو کرشن کہا - اس سے صاف نتیجہ نکلتا ھے کہ تمامی اجسام عالم کے ساتھہ کرشن کے جسم محدود کے بھي نمائشي و اعتباری ھونے کا راز کسی حد تک ان پر کھل چکا تھا اور اعتباری و خیالی چیز چونکہ ایک جگہہ کے بجائے دوسری جگہہ بھی فرض کی جا سکتی ھے - اس لئے انھوں نے اپنے میں کرشن یا کرشن میں اپنے کو دیکھا -

اے زاھد ظاھر بیں از قرب چہ می پرسي
او در من ومن در وے چوں بو بہ گلاب اندر

" اے ظاھر بیں زاھد تو نزدیکي کے متعلق کیا سوال کرتا ھے - وہ مجھہ میں اور میں اس میں اس طرح رھتا ھوں جیسے خوشبو گلاب کے

१—असावहंत्वित्यबलास्तदात्मिका न्यवेदिषुः कृष्णविहारविभ्रमाः ॥ भा० स्कं० १० अ० ३ श्लो० ३)

بھول میں'' اس واقعہ کی یہ توجیہہ صحیح نہیں ہوسکتی' کہ محض کرشن کے پوشیدہ ہو جانے کی وجہ سے گوپیوں کی یہ صرف اضطراری حرکت تھی - کیونکہ کرشن کی موجودگی میں بھی ایک گوپی کا آنکھیں کھول کر کرشن کا نظارہ کرنے کے بجائے اُنکی [1] خیالی تصویر کے تصور میں آنکھیں بند ہونے پر بھی مقشعرالاعضاء (بدن پر رونگٹے کھڑے ہونا) ہوجانے کا واقعہ بھی کسی ایسے نقطۂ نظر کا پتہ دیتا ہے کہ جہاں دنیاء واقعاتی کا بیڑا دریاء خیالی میں غرق ہو جاتا ہے - ہاں یہ سوال ضرور ہوسکتا ہے کہ جب گوپیاں عالمگیریت اور بیرنگی سے آشنا ہو چکی تھیں ' تو پھر کرشن کے جسم کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھاننے کے کیا معنی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کرشن کی عالمگیر روحانیت سے آنکھ لڑتے ہی ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی عالمگیریت سمائی کہ تشبیہ (ساکار) میں تنزیہ (نراکار) اور تنزیہ میں تشبیہہ کا تماشا دیکھنے لگی تھیں - نیز عالمگیریت کی کھڑکی کھل جانے پر بھی اس دنیا میں بالعموم جسمانیت ہی کا غلبہ رہنے کیوجہ سے بغیر کسی دقت کے لگاتار اور مسلسل مشاہدہ جسم ہی سے ہوسکتا ہے ' یہی وجہ ہے کہ اکثر طالبان بیرنگی نے بیرنگی کی کامل گرفت نہ کرسکنے کیوجہ سے جسم ظاہری ہی کو حقیقت کا زینہ بنایا ' جیسا کہ ایک عشقی نسبت کے بزرگ کو کسی چہرہ کے نظارہ میں محو دیکھکر کسی نے سوال کیا کہ یہ کیا ہے ؟ جواب ملا [2] - آفتاب کے چشمہ کو دیکھتا ہوں لیکن پانی کے طشت میں دیکھ رہا ہوں '' - اب ذرا اس طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے

१—तं काचिन्नेत्ररन्ध्रेण हृदिकृत्य निमील्य च । पुलकाङ्ग्युपगूह्यास्ते-योगीवानन्दसंप्लुता ॥ भा० स्क० १० अ० ३२ श्लो० ८)

۲—چشمۂ آفتاب می بینم * لیک در طشت آب می بینم

کہ گوپیوں کی محبت کوئی معمولی محبت نہیں تھی - بلکہ اس کی تہ میں جوگ کی اعلیٰ حقیقتیں کام کر رہی تھیں -

دیکھئے دل میں اٹھتے ہوئے خیالات کے روکنے کو یوگ درشن میں جوگ [1] کہا گیا ہے اور خیالات روکنے کی دو ترکیبیں [2] بتائی گئی ہیں - اول اشیاء دنیا کی مدلل بے حقیقتی و بے ثباتی دیکھ کر ، ان سے قلب کا برگشتہ ہوکر منحرف ہو جانا - دوسرے جس حقیقت کی تحریک نے ان چیزوں سے دل کو برگشتہ کیا ہے ، اس سے وابستگی پیدا کرنے والے ذرائع کا متواتر عملدرآمد یعنی تصور مقصود میں ڈوب جانے کی مشق - ذرائع مذکور میں سے مہاراج پتنجلی نے منظور نظر شے کے تصور اور لذات دنیا سے برگذشتہ انسان کامل کی روح سے وابستگی کو بھی بیان کیا ہے - نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جسے [3] جوگ کی دھن ہوتی ہے ، وہ جلد کامیاب ہو جاتا ہے - خیال [4] واحد میں محویت کو ، بیماری - سستی اور بے قراری وغیرہ جوگ سے روکنے والی اشیاء کا مانع قرار دیا گیا ہے - کسی [5] خاص جگہ دل کے باندھنے یا لگانے کو (بذریہ تصور) مراقبہ یا دھارنا کہتے ہیں - یہی مراقبہ مسلسل یا لگاتار قائم ہوجانے پر لفظ دھیان [6] سے موسوم کیا جاتا ہے - اور جب [7] مراقب مراقبہ میں

१—योगश्चित्तवृत्तिनिरोधः योो सूो २

२—अभ्यासवैराग्याभ्यांतन्निवृत्तिः । योो सूो १२

३—यथाभिमतध्यानाद्वा । योो सूो ३९

४—वीतरागविषयं वाचित्तम् । योो सूो ३७

५—तीव्रसवेगानामासन्नः । योो समाो सूो २१

६—तत्प्रतिषेधार्थमेकत्त्वाभ्यासः । योो समाो सूो ३२

७—देशबन्धश्चित्तस्यधारणा । योो विो सूो १

८—तत्रप्रत्ययैकतानताध्यानम् । योो विो सूो २

९—तदेवार्थमात्रनिर्भासंस्वरूपशून्यमित्रसमाधिः । योो विो सूो ३

کمال محویت کے ذریعہ شے مقصود کی شکل بن کر قائم ہو جاتا ھے تو یہ حالت جوگ کی آخری منزل یعنی سمادھی کہلاتی ھے ۔ اب ذرا جوگ کے ان بنیادی اصولوں کو ذھن میں رکھتے ھوئے گوپیوں کی حالت عشقی پر نظر ڈالئے ' تو معلوم ھوگا کہ یہ تمامی اصول اُن کے طرز عمل میں بغیر کسی کوشش کے خود بخود موجود تھے - ابھی ابھی ظاھر کیا گیا ھے کہ کرشن کی اصلی اور عالمگیر ھستی کے احساس کی وجہ سے گوپیوں کے دل سے جسم و جسمانیت کا تخیل کالعدم سا ھوکر رہ گیا تھا ' اور اشیاء دنیا سے دلچسپی کا دار و مدار اسی تخیل پر ھے ' لہذا کوئی وجہ نہیں کہ گوپیوں کے دل میں دنیا سے مکمل برگشتگی کا وجود تسلیم کر کے ان کو دنیا سے کامل کنارہ کش (पूर्णवैराग्यवती) نہ مانا جائے ' چنانچہ بھاگوت کے پڑھنے سے صاف طور پر معلوم ھوتا ھے کہ کرشن کا ادنی[۱] رابطہ بھی گوپیوں کے دل سے دیگر تمامی خواھشات کو بھلا دینے والا تھا جو کامل ویراگ کا روشن ثبوت ھے - دوسری چیز یعنی مشق تصور مقصود ' تو اس کا تو عاشق کامل کے لئے کہنا ھی کیا ھے - عاشق سے زیادہ تصور محبوب میں اور کون مستغرق ھو سکتا ھے ' اب رھا منظور نظر شے کا تصور اور انسان کامل کی روح سے وابستگی - تو ان دونوں چیزوں کی تکمیل تو گوپیوں نے کرشن ھی کے تصور کے ذریعہ سے کر لی تھی - کیونکہ کرشن گوپیوں کو محبوب بھی تھے اور کامل ویراگ کی تصویر بھی - اب باقی رھی محویت ' تو وہ عاشق سے زیادہ اور کسی میں ھوتی ھی نہیں - اور گوپیوں کا صرف کرشن ھی میں محو رھنا جوگ کی رکاوٹوں کے روکنے کے لئے بھی کافی تھا - نیز[۲] " تم ھی میں

۱—इतररागविस्मारणं नृणां वितर वीरनस्तेधरामृतम्
(भा० स्क० १० अ० ३१—श्लो० १४)
२—त्वयिधृतासव : त्वां विचिन्वते। (भा० ११० अ ३१—१)

دل رکھنے والی گوپیاں " اس جملہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گوپیوں نے کرشن میں چت (دل) لگا کر ' دھارنا (مراقبہ) کے منازل کو بھی طے کرلیا تھا - کیونکہ[1] آسو کے معنی چت (دل) کے ہیں اور چت کو کسی جگہہ (شے میں) رکھنے ہی کو دھارنا کہتے ہیں دھارنا کی ترقی یافتہ حالت ہی دھیان اور سمادھی ہوجاتی ہے - پھر کیا وجہہ ہے کہ خیالات دنیا سے کنارہ کش گوپیاں اِس عشقی جوگ کی تکمیل کرنے پر بھی کرشن میں لے ہوکر درجۂ فنایت تک نہ پہونچیں ؟ یہ ہے گوپیوں کی مذہبیت ' عشق صادق اور فنایت کی تشریح - اور یہ ہے اصلیت اس کرشمۂ عشق کی جسے دنیا راس لیلا کے نام سے یاد کرتی ہے -

---

१—शब्दार्थचिन्तामणि, पृष्ठ २२६

امیر خسرو اور تغلق نامہ

از مولوی مقبول احمد صمدنی ، صاحب "حیات جلیل"

نامور و نام آور شعرا کے تذکروں اور کارناموں پر نگاہ ڈالنے سے اِن باکمال حضرات کے مقدمتہ الجیش امیر خسرو پائے جاتے ھیں - امیر کا زمانہ شوال ۶۵۱ یا ۶۵۳ھ سے شروع ھوکر شوال ۷۲۵ھ میں ختم ھوجاتا ھے (=۱۲۵۳-۱۳۲۵ع) قدرتی طور پر یہاں دو سوال پیدا ھوتے ھیں - (۱) اس تہتر چوھتر برس کی مدت میں انھوں نے کیا کہا کیا تھا ؟ (۲) اِن کا سخنورانہ مرتبہ کیا تھا ؟ تخمیف تصدیع ، نیز گرمی محفل کے واسطے پہلی بات کا جواب بعد کو دینا چاھتا ھوں ؛ دوسری کا پہلے - اسکے لئے صرف چند ارشادات ایسے بزرگوں کے نقل کردینا کافی ھوں گے جنکی راستبازی ، درست گوئی ؛ وسیع خیالی و ژرف نگاھی دنیاے علم و فضل میں مسلم ھے ، جنکا فتوی اس بارے میں فیصلۂ قطعی کا اثر رکھتا ھے -

(۱) ملا عبدالقادر بدایوانی [۱] منتخب التواریخ [۲] میں لکھتے ھیں "کلام متقدمین بعد ظهور کوکبۂ خسرو شاعران حکم وجود ستارہا در وقت اِرتفاع اعلام نیر اعظم پیدا کردہ و مانند سبحیات هنگام وحی منزل برخیرالبشر سید عالم علیہ السلام در پردۂ تواري ماندہ ، ازین ها کم می گویند و می نویسند بلکہ نمی نمایند " -

---

۱—ولادت ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ م) - وفات ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ م) بحوالۂ ثمرات القدس -

۲—۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ م) سال ختم تصنیف - چار سال مدت -

(۲) حضرت شیخ عبدالحق محدث دهلوی ۱ اخبارالاخیار میں فرماتے هیں " امیر خسرو دهلوی رحمةاللهعلیه سلطانالشعرا برهانالفضلاست - دروادی سخن یگانه عالم و نقاده نوع نبی آدم ست - وے در سخن عالمی است از عوالم خداوندی که پایان ندارد - و او را از مضامین و معانی در اطوار سخن و انواع آن دست داد که هیچ کس را از شعراے متقدمین و متاخرین نداده -"

انهیں پر منحصر نهیں —(۳) شیراز کے هزاردستان و هزار زبان شیخ سعدی۲ نے امیر کے کلام اور اُس کی حلاوت و شیرینی سے متاثر هوکر جو تحسین بلیغ فرمائی۳ اور سلطان محمد قا آن (خان شهید) ناظم ملتان کو لکهه کر بهیجی تهي اور ان کا کلام مرتب رکهنے کی حرص دلائی تهی۴ ' غایت شهرت سے بے نیازِ اعاده هے ' اور ایک دور افتاده معاصر کے لیے موجب صد اِفتخار و نازش - شیخ کے ساتهه امیر کی اِرادت دلی اور خوش اعتقادی کا پتا خود اُن کے کلام سے چلتا هے :—

خسرو سر مست اندر ساغر معنی بریخت

شیره از خم خانۀ سعدی که در شیراز بود

ایک اور موقع پر کهتے هیں — جلد سخنم دارد شیرازۀ شیرازی -

(۴) خواجه عصمت بخاری۵ کو امیر کے تتبع پر فخر تها - مولانا جامی نے بهارستان۶ میں اسکا حواله دیا هے -

---

۱—ولادت ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ع) - وفات ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ع) -

۲—ولادت ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ع) - وفات ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ع) -

۳—تذکرة الکاملین قلمی - ید بیضا قلمی ' صفحه ۱۱۹ -

۴—خزانۀ عامره ' صفحه ۲۴۹ -

۵—وفات ۸۲۹ھ (۱۴۲۶ع) - ید بیضا ' صفحه ۲۳۷ -

۶—صفحه ۱۰۶ ' خزانۀ عامره ' صفحه ۲۱۳ -

(۵) مولانا کاتبی نیشاپوری[1] کے سے استاد فن فرماتے ہیں کہ میں نے خسرو کو ایک بار خواب میں دیکھا اور عصمت کی شہرت اور کامیابی کے راز کی نسبت پوچھا تو یہ جواب ملا۔

میر خسرو را علیہ‌الرحمہ شب دیدم بخواب
گفتم این عصمت ترا یک خوشہ چین خرمن است
شعر او از شعر تو چوں بیشتر شہرت گرفت
گفت با کے نیست شعر او همیں شعر من است

نیز ایک موقع پر لکھا تھا [2] :—

گر حسن معنی ز خسرو بُرد نتوان عیب کرد
ز انکہ استادست خسرو ' بلکہ ز استادان زیاد
ور معانی حسن را برد از دیوان کمال
هیچ نتوان گفتن اورا دزد[3] بر دزد اوفتاد

میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ [4] میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں کمال سے مراد خواجہ کمال خجندی[5] ہیں اور حسن سے امیر حسن علاسنجری دہلوی[6] ' جو خسرو کے خواجہ تاش اور رفیق شفیق تھے۔

۱—وفات ۸۲۹ھ (۱۴۳۵ء) ید بیضا ' ۳۶۰ - ' خزانہ عامرہ ' صفحہ ۳۸۵ -

۲—خزانہ عامرہ ' صفحہ ۲۱۴ -

۳—خواجہ کمال خجندی ' امیر حسن دہلوی کا تتبع کرتے تھے - لیکن مولانا جامی فرماتے ہیں کہ جو لطافت و معنی رسی کمال کے کلام میں ہے وہ خود حسن کے اشعار میں نہیں پائی جاتی - اسی تقلید و پیروی کی بنا پر بعض ان کو دزد حسن کہنے لگے تھے - (بہارستان ' صفحہ ۱۰۵) -

۴—صفحہ ۲۱۴ -

۵—وفات ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) -

۶—وفات ۷۳۸ھ (۱۳۳۷ء) - مگر ید بیضا ' صفحہ ۹۷ میں ۷۳۷ھ ۱۳۳۶ء) لکھا ہے۔

(۶) مولانا جامی ۱ بھی ان دونوں صاحبوں کے کمال کے قائل تھے -

آن دو طوطی که به نوخیزیِ شان

بود در بند شکر ریزیِ شان

عاقبت سخرۂ افلاک شدند

خامشانِ قفس خاک شدند

خود امیر حسن کا قول اپنے یار غار خسرو کے بارے میں ملاحظہ طلب ہے -

خسرو از راہ کرم بپذیرد * آنچه من بنده حسن می گویم

سخنم چون سخن خسرو نیست * سخن این ست که من می گویم ۲

ملائے جامی بہارستان میں امیر خسرو کی نسبت لکھتے ہیں که۰۰۰تتبع خاقانی می کند - هر چند در قصیده به وے نرسیده اما غزل را از وے گذرانیده و غزل هاے وے بواسطۂ معانی آشنا که ارباب عشق و محبت بحسب ذوق و وجدان خود را در می یا بند مقبول همه کس افتاده است - خمسۂ نظامی به ازوے کسے در جواب نگفته وورائے آن مثنوی ها ' دیگر دارد همه مطبوع و مصنوع۳ -

خاقانی شروانی۴ کا قصیدہ '' شینیہ '' بہت مشہور ہے - خسرو نے اُس کے اتباع میں '' مرآۃالصفا '' نام قصیدہ کہا تھا - جامی

۱۔ولادت ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) ۔ وفات ۱۸ محرم ۸۹۸ھ (۹ نومبر ۱۴۹۲ء -

۲۔حیات خسرو ' صفحہ ۱۶۱ -

۳۔ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ -

۴۔وفات ۵۸۲ھ یا بعد ۵۹۰ھ = ۱۱۸۶ یا ۱۱۹۴ء ید بیضا ' ۱۱۶ -

نے اِس کے جواب میں ایک طویل قصیدہ " جلاءالروح " لکھا - فرماتے ہیں[1] -

چو درسیر معانی یافت خسرو سوے آن خوان رہ

ملاحت ھاے او افگند شورے در نمک دانش

دگر خسرو سقاک اللہ نہی یا بد از آن رشحہ

شود سیراب فیض عین عرفان جان عطشانش

بشکر من چو طوطی روح او شکر شکن گردد

چو بفر ستم بہند این تنگ شکر از خرا سانش[2]

جامی کا دوسرا سیر حاصل قصیدہ " لجۃالاسرار " بھی خسرو کے جواب میں ھے - اِن کے سوا کئی غزلیں بھی خسرو کے طرز پر لکھی ھیں -

زنکتہاے حسن جامی این کمالت بس

کہ ساز نظم ترا جز نواے خسرو نیست[3]

(۷) عرفی شیرازی[4] کے سے نازک مزاج و نازک دماغ سخن‌دان نے جو ھر ایک ھندی نژاد کے شاعرانہ کمال کا قائل نہ ھوتا تھا ' طوطی ھند "خسرو" کے تفوق و برتری کا نہ سہی ' اُن کے مرتبے کا ضرور اعتراف کیا ھے -

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم

کہ کام طوطئی ھندوستان شود شیرین

۱—کلیات جامی ' صفحہ ۳۲ -

۲—کلیات جامی ' صفحہ ۳۲ -

۳—کلیات جامی ' صفحہ ۱۳۷ -

۴—وفات ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ ع) ۳۶ سال - والہ نے ریاض‌الشعرا میں اور آرزو نے مجمع‌النفائس میں بڑی تعریف کی ھے -

(۸) ہمارے مایۂ ناز مورخ اور محقق شاعر آزاد۱ موصوف نے امیر کی منزلت اور اُن کے کمالات سخن رسی و بذلہ سنجی کو پیش نگاہ رکھہ کر اُن (امیر) کے بعض مصرعوں پر پیش مصرع لگا دینے ہی کو اپنا فخر و شرف سمجھا تھا - مثلاً

اے خسرو شوخان چہ کند وصف تو آزاد
"خوبان عمل فتلہ ز دیوان تو یا بلد"
میر خسرو نمکین شعر ترا خواند آزاد
" از نمکدان تو شد تازہ گرفتارئی دل"

(۹) آزاد کے محترم و مفتخر نانا اور اُستاد میر عبدالجلیل ۲ واسطی بلگرامی نے اپنی بے نظیر مثنوی میں اپنے شاعرانہ کمال کے اظہار کے سلسلے میں امیر کی فضیلت اور سربلندی بلکہ یکتائی فن کا اِقرار و اعلان فرمایا ہے -

اگرچہ میر خسرو بود اُستاد
ندارد چرخ چون او دیگری یاد
بفکر دور دو پرواز دارد
نبی نبود ولے اعجاز دارد
در انواع سخن شور جہان است
بقدرت خسرو صاحب قران است

۱۔ ولادت ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ (۱۲ جون ۱۷۰۴ع) وفات ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ع) - حیات جلیل حصہ دوم - صفحہ ۱۷۱ -

۲۔ ولادت ۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ (۲ جون ۱۶۶۱ع) وفات ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ (۷ دسمبر ۱۷۲۵ع) - حیات جلیل ، صفحہ ۲۶۹ اول و خزانۂ عامرہ ، صفحہ ۳۵۵ -

ولے من هم ازیں گلدستۂ نو
دریں عصرم بجائے میر خسرو[1]

ان اور ان ایسے بہت سے اقوال و اعترافات کے سلسلے کے بعد آج کس کے منہ میں زبان ھے جو کہ سکے کہ

کوکبۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی[2] فگند
گرچہ بروختم سخن مُہر بست
سکۂ من مُہر زرش را شکست[3]

یہ محض خسرو کا ادعاے شاعرانہ تھا یا سخن گسترانہ تعلی ، حقیقت سے دور ، دلیل و تصدیق کی محتاج - لیکن اگر یہ اعتراض بجا اور حق بجانب سمجھا جائے تو اس شاعر کی جلالت شان اور عظمت درجت کے ثبوت میں میں ان کے محتشم مرشد [4] اور بعض اسلامیان ھند کے دور وسطی کے مرجع اور بر گزیدہ رہنما حضرت نظام الدین اولیا کی ایک رباعی پیش کروں گا - اس سے بڑہ کر کوئی بینہ وشہادت کیا ھوسکتی ھے -

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن ایں خسرو راست
ایں خسرو ماست ناصر خسرو [5] نیست
زیراکہ خدا ، ناصر ایں خسرو ماست [6]

۱—مثنوی طوے محمد فرخ سیر بادشاہ ، بحوالہ سر و آزاد ، صفحہ ۲۶۳ و حیات جلیل ، حصہ دوم ، صفحہ ۱۰۳

۲—وفات بعمر ۸۴ سال ۵۹۷ھ (۱۲۰۰م)

۳—مطلع الانوار -

۴—خزانہ عامرہ ، صفحہ ۲۰۹ -

۵—وفات بعد ۴۴۳ھ (۱۰۵۲م) -

۶—ید بیضا ، صفحہ ۱۱۸ -

نئے پرانے تذکروں اور تاریخوں میں ضیاء برنی ۱ کی تاریخ فیروز شاہی اور شاہزادہ دارا شکوہ ۲ کے سفینۃالاولیا اور نواب صدیق حسن ۳ کے تذکرۂ شمع انجمن کا نام لے دینا کافی سمجھتا ہوں -

امیر کی ان صفات واضافات کے ذکر کے ساتھہ ساتھہ اُن کی ذات کی نسبت یہ یاد دلادینا لابد ہے کہ وہ ہندوستانی تھے - میں نے وہ دونوں مقام دیکھے ہیں ' جنکے ساتھہ اُن کے کالبد خاکستری کو اِس جہان آب و گل میں تعلق رہا ہے - اور وہ دونوں اِسی ہندوستاں کی سر زمین پر واقع ہیں -

(ا) وہ ویران قصبہ ' پٹیالی - جو اب صوبجات متحدہ کے ضلع ایٹہ سے وابستہ ہے ' شاہنشاہ اکبر کے عہد میں دریاے گنگ کے کنارے مومن آباد پٹیالی کے نام سے سرکار قنوج ' صوبہ آگرہ کا ایک محال یا ضلع تھا - اِسی جگہہ کو یہ بے مثل شرف حاصل ہے کہ سلطان بلبن کے تعمیر کردہ قلعے میں (جسکے کھنڈر اب بھی نمایاں ہیں) یہاں کے حاکم امیر سیف‌الدین محمود کے مشکوے عالی میں ابوالحسن نام ' امیر خسرو عرف ' یمین‌الدولہ لقب ' وہ بچہ پیدا ہوا تھا ' ۴ جس نے روشن دنیا کے (یورپ کو چھوڑکر ' جس پر تمام تر تاریکی ' جہالت و گمنامی اُس وقت طاری ہو رہی تھی) سب سے زیادہ مشہور اور خوش گو ' دربار رس ' مگر متورع و متقی درویش مزاج شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی - جس نے بچپن کے چار سال یہاں گزارے تھے ۵ - یہ لاچین ترک '

۱—آٹھویں صدی میں وفات پائی - تاریخ فیروز شاہی ۷۵۸ میں لکھی تھی -

۲—قتل ۲۱ ذالحجہ ۱۰۲۹ھ = ۲۹ اگست ۱۶۵۹ع -

۳—وفات ۲۹ جمادی‌الثانی ۱۳۰۷ھ - مطابق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ع -

۴—خزانۂ عامرہ ' صفحہ ۲۰۹ - و ید بیضا ' ۱۱۷ -

۵—حیات خسرو ' صفحہ ۵ -

جس کے باپ دادا ہزارہ سے آئے تھے ۱ ' جسکی زبان پورے طور پر ب اور پ اور ت اور ٹ کے غیر نازک فرق سے آشنا اور ہندستانی ناموں کے صحیح تلفظ اور صحت کے لئے حرفوں کی تقدیم و تاخیر پر بھی قادر نہ تھی ؛ کچھ مدت تک " سلطانی " تخلص کرتا تھا ؛ اپنے دیوان تحفۃالصغر میں اپنے مولد و منشاء کو کس محبت کے ساتھہ یاد کرتا ہے -

گرچہ ایں از قضاے یزدانی ست
بیتیالی چہ جاے سلطانی ست ۲
من کہ از جملۂ سوار انیم
از تہی دستی اشک بار انیم

امیر اُسوقت تک سپاہی پیشہ ' ایک سوار تھے - " سلطانی " تخلص تھا - اُسکے بعد دونوں کو خیر باد کہہ دیا ' اور اپنی عرفیت امیر خسرو کی مناسبت سے " خسرو " تخلص اختیار کیا تھا ' جس نے نفس آخریں تک ساتھہ دیا - میرا یہ گمان ہے کہ " سلطانی " تخلص حضرت سلطان‌الاولیا کے انتساب اور اُنکی شفقت و رافت کی رعایت سے رکھا گیا جنھوں نے اِس عزیز اِرادتمند کو " ترک‌اللہ " خطاب دیا تھا ' ۳ نظر بحالات خصوصیات و تعلقات تا دم مرگ ؛ صحیح نہیں معلوم ہوتا - یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اُتار دے - بلکہ مولوی سعید احمد مارہروی کی تحریر ۴ سے پایا جاتا ہے کہ امیر کو ایک بار اپنا تخلص بدل دینے کا خیال اِس بنا پر پیدا ہوا تھا کہ خسرو اہل دولت سے نسبت

۱—ید بیضا ' صفحہ ۱۱۷ -

۲—مقدمہ شیریں خسرو ' صفحہ ۲ نوٹ ۱ -

۳—سیرالاولیا قلمی - مصنفہ سید محمد مبارک کرمانی معروف بہ امیر خورد - و ید بیضا ' صفحہ ۱۱۸ - حیات خسرو ' صفحہ ۱۳ -

۴—حیات خسرو ' صفحہ ۱۳ ید بیضا ' صفحہ ۱۱۸ -

رکھتا ھے - موقع پاکر حضرت سے عرض بھی کیا مگر آپ نے اسي کو قائم رکھا اور حلقه بگوش اِرادتمند کا اطمینان بھي فرما دیا -

یه تو ایک جمله معترضه تھا - خسرو جب وحشی تاتاریوں کی قید سے چھوٹے تو سیدھے دھلی آئے - غم زدہ ماں اور رنج و الم میں مبتلا عزیزوں کا کلیجه ٹھنڈا کیا - اُن کے پیچھے بہت سی منتیں مانی گئی تھیں ؛ پوری کی گئیں - مگر دھلی اب اِن کے لئے اِن کی پیاری دھلی نہیں رھی تھی - حالت پُر آشوب پائی - اِطمینان و فراغت کے ساتھه قیام کی کوئی صورت نظر نه آئی ' ابتدائے روزگار کا رنگ بدلا پایا ' تو شفیق والدہ اور عزیزوں کو لے کر پٹیالی چلے آئے ۱ اور کچھه مدت مقیم رھے - اِسی جگھه سلطان معزالدین کیقباد کی تخت نشینی کی خبر ملی - پیچھے پیچھے طلبی کا شاھی فرمان پہونچا - ایک زبر دست بد خواہ ملک نظام‌الدین داربک کی موجودگی میں دربار سلطانی میں جانا خلاف مصلحت تھا ' لہذا پٹیالي سے اپنے ایک پرانے قدر شناس خان جہان حاتم خان کے پاس چلے گئے - ۲

(۳) حضرت دھلی ' کنف دین‌وداد

جنت عدن ست که آباد باد[۳]

جہاں خسرو بڑھے چڑھے ۴ اور عمر کا بڑا حصه گزارا ' اور بالاخر یہیں پیوند خاک ھوئے - اِس کا ذکر جس خلوص و تپاک اور مستانه روش سے فرماتے ھیں ' اُن کے دیوان اور مثنویاں بھری پڑی ھیں -

---

۱—مقدمه قران‌السعدین از خان صاحب مولوی محمد اسماعیل ' صفحه ۴۸ -

۲—" " " " ' صفحات ۵۳ ' ۴۸ -

۳—قران‌السعدین ' صفحه ۲۸ -

۴—خزائنه عامرہ ' صفحه ۱۱۶ -

اے دھلی و اے بتاں سادہ!
پگ بستہ دریشہ کج نہادہ ا

اِن کے پیر طریقت کا قدمگاہ جو زندگی بھر اِن کا مامن و ماویٰ تھا ' اِن کا آخری ملجا و ملتجا بنا اور یوں اِن کی دیرینہ تمنا یا سچی پیشین گوئی بھی پوری ہوکر رھی -

کلامش را نہارم نام گیرم
زھے بخت اَرتھہ پایش بمیرم!۲

مدۃالعمر میں خسرو صرف ایک مرتبہ هندوستان سے باهر گئے تھے - اپنے آقا ومربی سلطان شہید کے قتل کے بعد ' اُس کی نمک خواری و وفاداری یعنی مصاحبت و مصحف داری کي خدمت کی بدولت ' چنگیز خانی مغلوں کے پنجۂ ظلم و ستم میں گرفتار ہو کر اِن کو دوسال بلخ میں مقید اور طرح طرح کے تشددات و آلام میں مبتلا رهنا پڑا تھا - ۳ فطرت کی شوخی و نیرنگی کہوں یا کار کنان قضاء و قدر کی ستم ظریفی ' کہ یہ وهی ام‌البلاد بلخ هے ' جہاں امیر خسرو کے دادا پر دادا امیر اور حکمراں رهے تھے - آج اُسی خانوادہ عز و جلال ' اُن هی سلف مکرم کا ایک رشید خلف اُسی شہر میں (۶۸۴ هجری = ۱۲۸۵ عیسوی) میں پا بجولاں لایا جاتا هے ! جو امیر ابن امیر اور خود بھي حشمت و شوکت والا هے - قبولیت عام اور شهرت و نام نے جس کے قدم چومے هیں -

معاف کیجئے گا کہ میئنے اِس ذراسی بات کو اِس قدر تفصیل کے ساتھہ یہاں لکھا هے - میری اس حدی خوانی کے طفیل میرے اهل وطن

۱ــــقران‌السعدین ' صفحہ ۳۶ -
۲ــــدول رانی خضر خاں ' صفحہ ۱۶ - " نسخۂ کفشش " -
۳ــــخزائنہ عامرہ ' صفحہ ۲۱۰ - حیات خسرو ' صفحہ ۳۴ - ید بیضا ' صفحہ ۱۱۹ ۰

ذھن نشین رکھیں گے کہ ان کا مایۂ فخر شاعر (خسرو) ھندستان زا تھا ' ھندوستان میں رھا ھندوستان ھی میں مرا ' جو کان بلاغت ' جان فصاحت تھا ' جو اصل و نسل دونوں اِعتبار سے غیر ایرانی تھا ' مگر فارسی زبان پر ایسی قدرت رکھتا تھا کہ ایرانی بھی رشک کرتے تھے ! یہ بھی خیال رھے کہ خسرو کی ماں ھند و نژاد یعنی راوت عرض ۱ (مخاطب بہ عمادالملک ۲) کی بیٹی تھیں - اس طرح خسرو کی آبائی زبان ترکی ' مادري ھندی ' ۳ اور قومی و علمی زبان فارسی تھی - باپ کا سایہ کم عمري میں سر سے اُٹھ گیا تھا اِس لئے اِن کی پرورش و پرداخت ' تعلیم و تربیت تمام تر دردمند ماں اور دل سوز نانا کے زیر اثر ھوئی تھی -

انھیں خسرو اور ان کے چند معاصرین اور بعض حلقہ بگوش مقلدین کا تصرف اور اُن کے ذوق شعر و شوق ادب کا ثمرہ تھا کہ ھندوستان کی زبان اور فارسیت نے اھل فارس کے دل فتح کر لئے تھے - ھر طرف سے خراج تحسین وصول ھوتا تھا - زبانوں پر ستایش و نیایش کی صدائیں بلند تھیں - یہ اِنھیں کی گردش قلم کا فیض تھا کہ فارسی آج تک ایک غیر فانی زبان بنی ھوئی ھے -

"مجنون و لیلی" کے ھنر پرور و جوھر شناس ناقد و مصحح کا بیان ھے کہ اس عہد میں ھندستان کی فارسی خراسان و ایران کی فارسی سے زیادہ فصیح وصحیح تھی ' جس پر خود امیر کی شہادت ھے اور اس سے بڑھ کر کیا شہادت ھوسکتی ھے -

---

۱ــــتمہید قران‌السعدین از سید حسن برنی ' صفحات ۵۷ ' ۵۹ - راوت ' ھندوستان کی ایک قوم جو راجپوت بھی کہلاتی ھے - قران‌السعدین ' صفحۂ ۳۶ - حاشیہ تحتی اول - نیز ملاحظہ ھو سیرالاولیا , صفحہ ۱۰۸ -

۲ــــخزانۂ عامرہ ' صفحہ ۲۰۹ -

۳ــــتمہید مذکور ' صفحہ ۵۹ -

اِسی سلسلے میں یہ اقرار بھی ضروری ھے کہ امیر خسرو کے ابتدائی زمانے کے اساتذہ بھی ھندی تھے [۱] - البتہ اِنھوں نے ھوش سنبھالا تو مولانا شہاب‌الدین مہمرہ کے کلام کا تتبع کیا تھا جو ایران سے چلے آئے تھے اور بدایوں میں آسودۂ خاک ھیں - اِسی بدایوں کی کشش سے مجبور ھوکر فرماتے ھیں -

زبس کز مرقد اهل بصیرت چشمۂ نو راست
بجائے سرمہ دردیدہ کشم خاک بدایوں را

اپنے معنوی اُستاد کے نسبت ارشاد ھوتا ھے :—

دربدایون مهمرہ سرمست برخیزدزخواب
گر بر آید غلغل مرغان دهلي زین نوا

شہاب مهمرہ در مور گفتہ است خوب تر شعرے
دل چوں مورمن نیز از قضا سفت آن قدر موے

مہمرہ کا رنگ امیر کے پہلے دیوان تحفۃالصغر میں گھرا نظر آتا ھے - پھر تو اسي نوخیز نو آموز نے وہ کمالات اور جامعیت کے جوھر دکھائے کہ اُسکے زمانہ میں بلکہ اُسکے بعد بھی اب تک کوئی اس رفعت و بلندی تک نہیں پہونچ سکا - اس نے تو شروع ھی میں قدم اُس زینہ پر رکھا تھا جہاں اچھوں کی رسائي نہ تھی - پر جلتے تھے - دنیا پلٹ گئی - بہت سے نام اور نام والے مٹ چکے - مگر خسرو ! تمھارے کار نامے اب تک زندہ و بر قرار ھیں -

مولانا عبدالرحمن جامی اپنے ایک شفیق و رفیق بزرگ " صاحب دولتی " کے وجود باجود پر فخر کرتے اور ان کے فضائل و محاسن علمي

۱—مثلاً خواجہ شمس‌الدین خوارزمی ؛ جن کي ھشت بہشت میں تعریف کی ھے -

و شعری کو اندازہ و قیاس سے بلند و بالاتر بتاتے ھیں - فرماتے ھیں کہ انہوں نے بھی خمسۂ نظامی کے مقابلہ میں مثنویاں لکھی ھیں - تیس ہزار شعروں کا مجموعہ ہوگا - خسرو دھلوی کے قصیدے کے جواب میں بھی ایک قصیدہ لکھا تھا "دوپائی" نام - اس میں بڑے دقیق معانی اور لطایف خیالات پیدا کئے تھے - قلق ھے کہ اب ناپید ھے - مطلع یہ تھا -

آتشیں لعلے کہ تاج خسروان را زیورست
اخگرے بہر خیال خام پختن در سرست ۱

پورے قصیدے یا اس کے کسی مسلسل ٹکڑے کو دیکھنے کے بغیر یہ رائے قائم کرنا مشکل ھے کہ آیا صاحب دولتی کے مدنظر خسرو کی قدرشناسی وستایش تھی یا گریز مخمدت - لیکن زور دار مطلع کے تیور بتاتے ھیں کہ شاعر کو امیر کے کمالات کے اعتراف سے ننگ و عار ھے - وہ لعل گراں بہا جو سلاطین کے تاجوں کا سرتاج ہورہا تھا، اُسکی حقیقت ایک بے حقیقت انگارے سے زیادہ نہیں سمجھتے -

ان کے ایک ھمعصر کی رائے بھی سن لیجئے - محمد تغلق جب صرف شاھزادہ الغ خان تھا تو عبید زاکانی نام ایک نو وارد ایرانی بھی بارسوخ ملازم دربار تھا - یہ شخص جتنا بلند نظر اور وسیع الخیال واقع ہوا تھا اُتناھی متکبر و بد دماغ بھی - امیر خسرو اُس کی نگاہ سے ھمیشہ گرے رھے - کہتا ھے۲ -

فاطِ اُفتاد خسرو راز خامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی۳

۱- بہارستان، صفحات ۱۰۸، ۱۰۹ -

۲- حیات خسرو، صفحہ ۱۶۳ -

۳- سکبا، ولایت میں ایک آش، گیہوں کے روے، گوشت، سرکہ، مصری اور کشمش سے تیار کیا جاتا ھے -

اس تمثیل میں شوخی سے زائد اسکی لطافت نمایاں ہے -

مثنویات خسرو کے جامع الفضائل دیباچہ نگاران نے امیر خسرو کا تقابل معمولاً مولانا نظامی سے کیا ہے اور بعض بزرگوں نے تو اس خدائے سخن کو مسجد کا بوریا نشین غریب ملا بنا کر چھوڑا ہے - حالانکہ دونوں کے زمانے میں سو سواسو برس کا فرق تھا - امیر کی زبان اور ان کے کلام کی آبداریوں کا موازنہ ان کے ہم زمانہ شیخ سعدی سے کرنا چاہئے تھا - خسرو کی نظم و نثر دونوں ' سعدی کی نظم و نثر سے صریحاً مختلف ہیں - دونوں کا معیار بھی جدا ہے - امیر دونوں کو قدرے مشکل عبارت میں دشوار فہم لکھتے ہیں - سعدی وہی باتیں سیدھی سادی زبان اور بے تکلف بول چال میں ادا کردیتے ہیں - امیر کے یہاں لغات اور کم مانوس کلمات کی آمد ہے ' صنائع و بدائع ' تکلفات اور استعارات کی فراوانی اور بھر مار - سعدی چھوٹے چھوٹے جملوں اور لفظوں میں حرف مطلب اس طرح کھہ ڈالتے ہیں جیسے کوئی قند و نبات کی ڈلیاں بانٹ رہا ہو - خسرو بسااوقات لوہے کے چلے اور اینٹ پتھر کے روڑے لگاکر سامنے رکھہ دیتے ہیں - اب اپنا اپنا ذوق سخن اور چاشنی زبان ہے ' جو جسے چاہے پسند کرلے - لاریب کہ سعدی کا میدان سخن ہی دوسرا ہے ' جہاں ہر لحظہ خاموشی اور سکون چھایا رہتا ہے - خسرو ہر وقت رزمگاہ میں رہتے ہیں ' ان کو جوش و خروش ' تعلیات و تصنعات سے کام لینا پڑتا ہے - ورنہ شاید اس بازی میں بھی یہ پیچھے نہ رہ جاتے اور نا کام نہ ہوتے - خسرو کو بظاہر تین دشواریوں سے پالا پڑا تھا اور زیر کرنا تھا - (۱) ان کی عدیم الفرصتی ' رات دن کے مشاغل - صبح سے شام تک ایک امیر و مقرب کی حیثیت

سے تیاری اور دربار شاہی میں موجودگی - پھر اپنے برگزیدہ شیخ کی خدمت و حضوری کا ولولہ و جذبہ ' جو ان کے دل و دماغ اور درویشانہ نہاد پر ہر وقت مستولی رہتا تھا - اسکے بعد وقت ہی کیا بچتا تھا جس کو اپنی ضروریات ' ذاتیات اور شاعری کی نذر کرتے - (۲) خسرو کی تصانیف کی بے شماری اور نیرنگی و بوقلمونی - (۳) سب پر طرہ یہ کہ خود ان کی خوشی یا طبیعت کی پسند کو مطلقاً دخل نہ تھا - انکی تصنیف و تالیف اور شاعری ونثاری کا محض اُمرا و ملوک کے گوشۂ چشم کے اشارے پر دار مدار رہتا - ان حوصلہ شکن قیود اور سختیوں اور صبر آزما پابندیوں کے ساتھ لطیف و نفیس کلام کا یہ انبار ' کیا شاعرانہ کرامت و اعجاز سے کم ہے ! - سعدی کے لئے یہ مجبوریاں کہاں تھیں - انہوں نے زیادہ تر اخلاق و نصائح پر لکھا ہے یا ہزلیات و مطائبات پر - عمر بھی زیادہ پائی تھی - تاہم خسرو کا عشر عشیر بھی نہ لکھ سکے - خسرو نے پھر بھی اُن کی عظمت و عزت کو پہچانا اور مانا ہے - وعظ و نصیحت کی ہموار زمین پر جب اُترتے ہیں تو خسرو بھی سعدی کے نقش قدم (طرز) پر چلتے اور سادگی و بیرنگی کے رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں - حیات خسرو کا فاضل جامع اس روایت کا ذمہ‌دار ہے کہ خسرو نے گلستان سعدی کا بھی جواب لکھا تھا - حسب معمول فاتحہ قبول کی آرزو کے ساتھ پیر محترم کی بارگاہ اقدس میں لے گئے - ارشاد ہوا کہ کل لانا - رات ہوئی تو امیر کو عالم خواب میں روحانیات و مکاشفات کے تمام پردے خود بخود اُٹھ گئے - اور جو کچھ دیکھا اُس کا اثر یہ تھا کہ صبح ہوتے ہی دریا پہونچے اور اپنی گلستاں کا ایک ایک ورق پانی میں بہا دیا[۱]

این دفتر بے معنی غرق مےِ ناب اولیٰ -

۱ـــ حیات خسرو ' صفحہ ۹۳ -

" دوسری بات یعنی پہلی تقسیم کا جواب زیادہ پھیلاؤ چاہتا ہے - پھر بھی میں اس کے ہر پہلو کو کم سے کم لفظوں میں نمودار کرنے کی کوشش کروں گا -

خسرو کی ہر قسم کی تصنیفات کی تعداد۱ باختلاف روایات ایک سو بانوے تک پہونچتی ہے - ننیانوے۲ ایک متوسط عدد ہے ' اسماے حسنیٰ کے مساوی - اسي پر اکثر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے - ان کا غالب حصہ نظم ہے - نثر کمتر ' مگر ایسا نہیں کہ نہ ہو - حسب روایت امیر جملہ اصناف کلام کو ملاکر ان کے اشعار کا شمار چار اور پانچ لاکھ کے درمیان بتایا جاتا ہے۳ - بعض پانچ لاکھ بیت سے بھی زیادہ لکھتے ہیں - ہندوستان کی زندہ و مردہ زبانوں میں کوئی بھی ایسی نہیں ' جس میں امیر نے کوئی مستقل تصنیف یا یادگار نہ چھوڑی ہو - عربی ' فارسی ' سنسکرت ' ہندی ' بھاشا ' پنجابی وغیرہ سب ہی آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہیں - دیوان اور مثنویاں ملاکر ان (۹۹) میں سے گیارہ چھپی ہوئی میری نظر سے گزر چکی ہیں ' اور چار غیر مطبوعہ - باقی کا علم دانندۂ حقیقی کو ہے -

خمسۂ نظامی کے جواب یا بہ تغیر لفظ مقابلہ میں ان کا پنج گنج بھی شہرت تام اور قبول عام حاصل کرچکا ہے - سخن فہم نا قدین کلام نے اس کی توصیف بے حد فرمائی ہے - حتیٰ کہ بعض اہل نظر نے اس کے مختلف اجزا کو نظم نظامی سے بہتر اور بر تر قرار دیا ہے - دولت شاہ

۱---فیروز شاهي مولفۂ ضیاء الدین برنی -

۲---ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ - مسٹر بل وکشرنی ' صفحات ۱۵۱ و ۱۵۴ نیز آتش کدہ آذر -

۳---ید بیضا قلمی ' صفحہ ۱۲۰ و حیات خسرو صفحہ ۹۰ -

سمرقندی راوی ہے کہ شہزادہ سعید بایسنغر بہادر[1] (والی ہرات) خسرو کے خمسہ کو نظامی کے خمسہ پر ترجیح دیتا تھا - خاقان مغفور اُلغ بیگ (فرمانروائے سمرقند)[2] کو اس سے اختلاف تھا - وہ نظم نظامی کی افضلیت کا قائل تھا اور اس حمایت و عصبیت پر دونوں سخن فہم شاہ بھائیوں کے باہم پر لطف مناظرہ و مذاکرہ ہوجاتا تھا - خسرو کی نسبت خود دولت شاہ کے سے فاضل وسیع النظر کی رائے کا نچوڑ یہ ہے کہ "معانی خاص و نازکی ہاے خسرو و سخنان پُر شور عاشقانۂ او آتش در نہاد آدمی می زند......و در نازکی ہاے خمسۂ او اگر فکر کنند ، نکتہا نیست کہ وصف نتوان کرد -

آج سے بیس بائیس برس پہلے ایک اولوالعزم اور سر گرم کار جماعت نے جس کے روح و روان نواب عمادالملک میر سید حسین بلگرامی[3] اور نواب حاجی محمد اسحاق خان[4] (خدا تعالی اُن کو بخشے اور اِس کارنیک کی جزائے خیر دے) اور سکریٹری نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمان شروانی (طال بقاءہ) تھے کمر ہمت باندھی - سلطان العلوم خسرو دکن نے سرپرستی و دستگیری فرمائی - بیش قرار سرمائے اور شاندار اہتمام سے مطبوعہ و قلمی نسخے فراہم کیے گئے - مشہور و ماہر علماے فن اور کملاے وقت نے جن کی نظریں وسیع ، معلومات فراوان اور قلم تیز و رواں تھے ، تہذیب و تنقیح ، تحشیہ و تصحیح کی خدمات اپنے ذمے لیں اور حق یہ ہے کہ نقد و بصر اور جرح و تعدیل

۱—مرزا بایسنغر } دونوں مرزا شاہرخ کے بیٹے اور امیر تیمور کے پوتے تھے - متعدد
۲—مرزا الغ بیگ } زبانوں میں لکھ پڑھ سکتے تھے اور شعر کہتے تھے ان کی علماء فضلا کی قدر دانی شہرۂ آفاق ہے - نویں صدی ہجری کے شروع (۸۰۲ھ - ۱۳۹۹ء) میں پیدا ہوئے اور پچاس برس کے اندر عمر پائی -

۳—وفات بماہ ذیقعد ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۲۶ء

۴—آخر اکتوبر ۱۹۱۸ء میں رحلت فرمائی -

کا حق پورا پورا ادا کیا - ۱۹۱۴ع سے ۱۹۲۷ع تک وہ بیش بہا مکلف نسخے شایع ہوئے ' جنکی صحت ' خوبی کتابت اور حسن طباعت پر دنیاے علم و عمل کو مدتوں ناز رہے گا - خسرو نے تو یہ مثنویاں مختلف عہدوں میں مختلف بادشاہوں کے نام پر لکھی تھیں - لیکن میں اس کو اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان کی خوش نصیبی کہوں یا ان نفیس مطبوعات کی ' جو سب کی سب اسی تاجدار کے عہد علم پرور میں نظر افروز عالمیان ہوئیں - اور ہم ایسے بے سر و سامان ' بے بضاعت' خادمان علم و ادب بھی اس لازوال دولت سے بہرہور اور مالا مال ہوگئے -

اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ امیر خسرو نے غیاث‌الدین بلبن کے عہد سے لے کر محمد شاہ تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ پایا تھا - (۱) غیاث الدین بلبن - (۲) معزالدین کیقباد - (۳) کیومرث‌الملقب بہ شمس‌الدین ' چند روز - (۴) جلال الدین فیروز شاہ خلجی - (۵) رکن الدین ابراہیم شاہ ' چار ماہ - (۶) علاء الدین خلجی - (۷) شہاب الدین عمر ' تین مہینے - (۸) قطب الدین مبارک شاہ - (۹) ناصرالدین خسرو خان ' صرف دو مہینے - (۱۰) غیاث الدین تغلق شاہ - (۱۱) محمد تغلق - یعنی غلاموں کے خاندان کی با اقبال سلطنت کا آفتاب اُن کے سامنے غروب ہوا - خلجیوں کا چراغ اِنہوں نے روشن ہوکر گل ہوجاتے دیکھا - خود اپنی تحریرا کے مطابق سات بادشاہوں کی مصاحبت و ملازمت کی تھی - (۱) شاہزادہ۲ محمد سلطان پسر غیاث‌الدین بلبن - (۲) معز الدین کیقباد (۳) فیروز خلجی - (۴) علاء الدین خلجی -

---

۱—خزانہ عامرہ صفحہ ۲۱۰ ' بحوالہ نُہ سپہر - ید بیضا ' صفحہ ۱۱۹ -

۲—ید بیضا ' صفحہ ۱۱۹ - پانچ سال خسرو اور امیر حسن اس کے ہمراہ ملتان میں رہے تھے -

(۵) قطب‌الدین مبارک ' خلجی - (۶) غیاث الدین تغلق - (۷) محمد تغلق (کچھہ مہینے) ۱ اور سب کی کچھہ نہ کچھہ علمي و ادبی خدمت کی تھي - ان کی مشہور منظومات میں سے اکثر و بیشتر چیزیں کسی نہ کسي علم دوست فرمانروا کی خواهش یا تحریک سے لکھی گئی تھیں - یا مصنفین اور شعرا کے دستور کے مطابق ' جو ازل سے شاید اب تک یکساں عمل پذیر رهے گا ' خسرو نے اپنے کسي سر پرست و عزت افزا تاج دار کے نام منسوب و معنون فرمائی تھیں - وہ بے مایہ و تہی دست جو دو حرف لکھنے پر قادر نہیں ' اس کو تملق و خوشامد سے تعبیر کرتا هے ؛ مگر تجربہ‌کار هنرمند جانتا هے کہ کسي امیر کی قدر شناسی و همت افزائی کے بغیر اس عالم کا کوئی کام نہیں چل سکتا - امیر نے هر ایک کتاب کے دیباچے میں زمزمۂ توحید اور شہادت رسالت اور اپنے پاک مرشد کي منقبت سرائی کے بعد ایک پورا باب سلطان عصر کی مدحت گزاری و ثنا گستري میں وقف فرمایا هے - اسی کے ساتھہ امیر کے ستایش طراز اور معتقد ثناخوان بڑے دعوے کے ساتھہ کہتے هیں کہ انہوں نے ' پیر کی تعریف هو یا بادشاہ کی صفت ' کبھي جادۂ اعتدال و حدود راست گوئی سے قدم باهر نہیں رکھا - یہ رائے کسی حد تک صحیح و وقیع مانی جاسکتی هے - مگر ان کی تحریرات کے سرسری مطالعہ اور ادنے سی توجہہ سے روشن هوجاتا هے کہ شاعرانہ جوش و خروش ورجز خوانی کے بعد ' ان کے ممدوح کی سیرت کے متعلق ' جو کچھہ باقی رہ جاتا هے ' وہ بھی مبالغہ و اغراق سے خالی نہیں تو عجب نہیں - کون کہہ سکتا هے کہ کسی شخص کی نسبت جو کچھہ

۱—ید بیضا ' صفحہ ۱۱۸ -

لکھنے کے قابل تھا یا جس کا لکھنا واجب تھا سب ھی سپرد قلم کر دیا ھے - ملک گیری اور تخت و تاج کی آز و ھوس میں کتنے ھی مظالم اور جورو ستم ان زبر دست انسانوں کے ھاتھہ سے سرزد نہیں ہوئے تھے ' مگر ان کے ذکر سے دار و گیر کا اندیشہ ' جان و مال کا خطرہ تھا ' اس لئے اعادہ سے یک قلم گریز کیا گیا ھے - لکھنے والوں کی مجبوریاں اور زمانہ کی جفاکشي اور ناحق کوشي ظاھر ھے - امیر ھوں یا ان کے معترض ' دونوں کے لئے حدود ادب مانع آتے ھیں اور مجھہ سے بے ادب بے نصیب کو بارگاہ خسروی سے محبت کا سلام اور لب بہ بند و چشم بند و گوش بند ' کا پیام مکرمت پہونچتا ھے - جہاں تک پچھلوں کا واسطہ تھا ' یا خود زندوں کے متعلق ' امیر نے ذرا بھی گنجایش پائی ھے تو اظہار امر واقع میں رو رعایت نہیں فرمائی - ایک دور اندیش ناصح کی طرح ' ھر مناسب اسلوب سے ' پند و موعظت سے کام لیا ھے - اُسوقت مواخذۂ مجرمانہ اور سزا و جزا کا فیصلہ ' اور کار روائي کا انحصار تنہا حکمراں کی رائے اور حکم پر تھا - آج آئین و قانون اور نظام عدالت کی عملداری و نمایش ھے تو اِسکے لئے بھی قانون و قاعدے سامنے آجاتے ھیں - والیان ملک و رؤسا کے خلاف کون زبان کھول سکتا یا قلم کو حرکت دے سکتا ھے -

امیر خسرو کے چاروں دیوان (۱) تحفۃالصغر ' (۲) وسطالحیات ' (۳) غرۃالکمال ' (۴) بقیۂ نقیہ ۱ اور اکثر مثنویاں مختلف بادشاھوں کی تعریف کے ترجیع بند اور قصائد سے مالا مال ھیں - تفصیل کی گنجایش نہیں - '' عناصر خسرو '' میں جو ان کے چاروں دیوانوں کا جوھر ھے '

---

۱ — ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ -

ہر قسم کے اکیس قصیدے موجود ہیں۱ امیر نے چھ مہینے میں تین مثنویاں اور تین سال کے اندر پورا خمسہ علاوالدین خلجی کے عہد میں ختم کیا تھا - اس لئے یہ پانچوں مثنویاں سلطان مذکور کے نام سے معنون ہیں - ' مطلع الانوار ' نظامی کے ' مخزن اسرار ' کے جواب میں لکھا تھا - اخلاق و تصوف کے غوامض و نکات کو شریعت و طریقت و حقیقت کے راز و رموز کے ساتھ عمدہ دلکش پیرایہ میں سمجھایا ہے - یہ مثنوی سب سے پہلی ' یعنی ان کے ابتدائے شوق یا شوق ابتدا کی یاد گار ہے - بااین حجم و ضخامت اور کمالات صوری و معنوی چودہ دن میں لکھ ڈالی تھی - مولانا ابوالحسن نے شرح لکھی - فرماتے ہیں -

خسرو دہلی ست بہ نزد حسن

خسرو اقلیم سخن بے سخن ۲

کیا ممدوح کی ستایش و تحسین کے سوا اس میں مادح کی معنوی قدر و وقعت کا بھی کوئی پہلو نکلتا ہے ؟

خضر خان سلطان مذکور کا بڑا بیٹا اور خسرو کا پیر بھائی تھا - اسکے عشق و محبت اور سوز و گداز کی سر گزشت جو خود اس کی خواہش و فر مایش سے نظم کی تھی ۳ لاجواب ہے - واقعات جتنے دلچسپ و دلکش یا جہاں تہاں درد ناک و عبرت خیز تھے ' اس فسوں ساز نے اُسی انداز اور معجزانہ طراز سے سجا کر سامنے رکھ دئیے ہیں - ساڑھے سات سو برس پہلے کے ہندوستان اور اس ملک کی زبان

---

۱ — شاہزادہ بالسنغر پسر شاہرخ مرزا نے بھی جمع کرایا تھا مگر یہ ہمت ہار گیا - اور ناتمام چھوڑا - ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ -

۲ — حیات خسرو ' صفحہ ۱۳۸ -

۳ — صفحہ ۴۱ - دول رانی خضر خان -

اور یہاں کے کپڑوں کی اچھائیوں کے متعلق حصہ ا یقیناً اس قابل ھے
کہ یہاں کا ھر فرد جو فارسی کا مذاق اور تھوڑی سی استعداد رکھتا ھو
اس سے لطف اُٹھائے اور بہرہ اندوز ھو - تاریخی نقطۂ نظر سے
بھي یہ بڑی قدرو قیمت کي چیز ھے - ' قران السعدین ' ان کي سب سے
پہلي ' تاریخی ' اور نہایت مشہور مثنوی ھے - جس میں دو
باپ بیٹوں کی ملاقات ' یعنی ناصرالدین بغرا خان فرمانروائے
بنگالہ کی آمد اور اپنے بیٹے سلطان معزالدین کیقباد بادشاہ
دھلي سے ملنے کا حال درج ھے - یہ مثنوی کیقباد کی فرمایش
سے لکھي تھي اور اپني خوبیوں اور صوری و معنوی لطافتوں اور نزاکتوں '
اور موقع و محل پر قسم قسم کے مواعظ و نصائح کے باعث بہت مقبول
اور پسند خاص و عام رھي ھے - جب تک فارسی زبان اور اس کي شیرینی
و دلربائي کا چرچا رھا ' اس کا بھي ضرب دور دورہ تھا - نصاب درسیات
میں داخل تھي - بارھا چھپی - متعدد شرحیں لکھی گئیں - فارسی
کی اُونچی اُونچي کتابوں کے ساتھ مجھے بھي سبقاً سبقاً پڑھائي گئی
تھي - " مقالہ " میں خلفائے راشدین کے حالات و فتوحات اور صوفیائے
کرام کے اقوال و ارشادات مرقوم ھیں - اس کا مطالعہ ھم خرما وھم
ثواب کا لطف رکھتا ھے - ' مجنوں لیلی ' اور ' شیریں خسرو ' قابل
استناد تحریریں نہ سہي لیکن ان سے بھي بہت سے حالات اور حقائق
عصری کا پتہ چلتا ' اور عرب و عجم کے پرانے رسم و رواج اور غیرت و
حمیت کے جذبات کي جھلک دکھائی دیتی ھے - ' آئینۂ سکندری '
سکندر مقدونی کے متعلق اُس عہد تک کي معلومات اور تحقیقوں کا
اچھا خاصہ آئینہ ھے - فوجی و جنگی شان و شوکت ' مقابلوں کا طور

ا - دول رانی خضر خان - مقدمہ از مولانا رشیدسالم ' صفحات ۱۰۰ لغایت ۱۱۰ -

طریق اور رسوخ و عزیمت خوب نمایاں کی گئی ھے - ' هشت بہشت '
پند و اخلاق کی عمدہ کتاب ھے - چھوتے چھوتے افسانوں میں نہایت
کار آمد اور سبق آموز باتیں خسرو نے ایک دلچسپ طرز اور معمول
سے زیادہ سلیس و سادہ زبان میں نظم کردی ھیں - ' خزائن الفتوح '
یا تاریخ علائی ' کا مرتبہ بہت بلند ھے - علاءالدین خلجی محمد شاہ
کے اوائل سلطنت ' معرکہ آرائیوں اور فتحوں کو کامل شاعرانہ انداز سے
صنائع و بدائع کے ساتھہ ' مستند تاریخی رنگ میں جلوہ پیرا کر دیا
ھے - شیخ بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کی بڑی تعریف کی
ھے ' سر هنری ایلیٹ بھی اس کی ستایش میں رطب الاسان ھیں اور
اس کو پر از معلومات اور بڑی عمدگی سے مرتب کیا ھوا بتاتے ھیں -
ان کا خیال اس کی نسبت یہ ھے کہ " اس تاریخ میں با قاعدہ تاریخ
وار واقعات تو تحریر نہیں ھیں - بلکہ خاص خاص زمانوں میں ملک
کے جس کسی حصہ میں کچھہ واقعات گزرے ھیں ' اُن کو بلا امتیاز
و تفریق درج کردیا ھے - تاھم امیر خسرو نے جو کچھہ لکھا ھے وہ بوجوہ
وقیع و مستند مانا جاتا ھے - اول تو یہ کل واقعات اُن کے زمانے کے ھیں -
دوسرے ' ان میں سے اکثر میں وہ بذات خاص شریک تھے - تیسرے '
ضیاءالدین برنی کاسا مورخ اپنی تاریخ کے بیانات کی تصدیق کے لئے
اکثر اسی کتاب کو پیش کرتا ھے - سولہ برس ھوئے کہ نواب محمد
اسحاق خان نے دنیا سے کنارہ کشی کی اور بقیہ کلیات خسرو
کی اشاعت و نشر کا کام نا تمام چھوڑا - اب یہ تاریخ (علائی)
جس کی تر تیب و تصحیح و تبیض با حسن وجوہ انجام
پا چکی تھی ' اس کا مسودہ الماری میں بند پڑا اور اپنے مقدر کے فیصلہ کا

منتظر ہے ۔ ' نہ سپہر ' قطب الدین مبارک شاہ ۱ کے نام پر معنون ہے ۔ اسی بادشاہ کے عہد کے واقعات اور حالات اس میں نظم کئے ہیں ۔ اس کے مختلف حصوں اور واقعوں کو مختلف بحروں میں نظم کی خلعت پہنائی گئی ہے ۔ ۲

' رسائل اعجاز' یا اعجاز خسروی ۳ عربی آمیز دشوار فہم فارسی نثر میں ' فن انشا کے متعلق پانچ رسالوں کا مجموعہ ہے ۔ وہ جوان عمر ' جوان خیال ذہین خسرو کے عہد جوانی کی یادگار نہیں ' بلکہ ستر برس کی عمر اور مرنے سے دو سال پہلے (۷۲۳ ھ) کی تکمیل ہے ۴ نثر کی یہی اکیلی کتاب ان کی منظومات کے ایک بڑے حصے پر ہر حیثیت سے بھاری نظر آتی ہے ۔ مدت ہوئی لمبی چوڑی تقطیع کے ۱۱۸۹ صفحات پر چھاپی گئی تھی ۔ متن کے ساتھ ساتھ حواشی' شرح' حل لغات اور ترجمۂ اشعار و اقوال عربی نے بہت سی جگہ لے لی ہے ۔ باوصف خوبی طباعت اور جلی قلم کے ' حاشیوں پر اُلٹی سیدھی اور بین السطور لکھائی ' اصل و نقل کی گنجلکوں اور پیچیدگیوں میں آنکھ اُلجھتی ' طبیعت بھاگتی ہے ۔ دل گھبرانے لگتا ہے ۔ اس میں ہر قسم کے بدائع وصنائع ' معانی و نکات ' حقائق و دقائق اور لطائف و ظرائف ' نیز ضلع جگت کو بڑے اہتمام و نمود سے یکجا کیا ہے ۔ ایجادات و اختراعات گونا گوں کا بھی التزام فرمایا گیا ہے ' تقریظ لکھنے والوں کا فتویٰ ہے کہ یہ بے مثل کتاب خسرو کا شاہ کار اور

۱۔۔۔خزانۂ عامرہ ' صفحہ ۲۰۹ ۔

۲۔۔۔مسٹر بیل کی بیاگرفی کل ڈکشنری میں ان سب کتابوں کے نام ' انگریزی میں مسخ شدہ صورت میں ملتے ہیں ۔

۳۔۔۔مطبوعہ منشی نول کشور ' ۱۸۷۶ ع ۔

۴۔۔۔رسالہ رابعہ اعجاز خسروی صفحہ ' ۱۰۳ ۔

مقبول روزگار ہے - نہ ایسے مصنف پیدا ہوئے ہیں نہ پیدا ہوں گے - نہ ایسی کتابیں انسانوں کی دنیا میں اُتریں گی - شاید یہ فیصلہ کبھی درست رہا ہو - ایک وقت رہا ہوگا جب اس قسم کا مذاق سخن عام تھا - قدیم درسیات کے سلسلہ میں ہر طالب کمال کو اپنا' یا دوسروں کا شوق پورا کرنے کے لئے ایسی کتابوں کے مطالعہ و درس اور ان سے استفادہ و استفاضہ کا مشورہ دیا جاتا تھا - اس کے عربی شعروں' مثلوں' کہاوتوں' محاوروں اور استعاروں کی' جو پریشاں کن کثرت و افراط کی حد سے بھی زائد ہوگئے ہیں' مضامین کی خوبی' محاسن کا تنوع' تشریح و توضیح اور لطف بیان کی خاص کر بڑی تعریف کی جاتی اور توجہ دلائی جاتی تھی - لیکن آج کہ السنۂ مغربی و مشرقی کی وسعت نظر اور کثرت فنون اور لٹریچر کی نزاکت و بہار سے' نہ کتابوں کے شائق کو اتنی فرصت ہے اور نہ ان طلسم آرائیوں کی کوئی قدر' تو کون ان گورکھدھندوں میں پھنسے اور اپنے اوقات عزیز کو رائیگاں کرے گا - ازماسلام گویند پیران پارسارا - اس کا پانچواں حصہ ''السوابق من المنشاۃ'' سے موسوم اور چند سطر کے دیباچے اور چھہ خطوں پر مشتمل ہے - چھٹے خط کا عنوان ''طیبت وہزل'' ہے جس کی ضخامت ستر صفحے ہیں - اس میں تفنن' مطائبہ و خوش طبعی' نزاکت و لطافت خیال تو نام کو نہیں' نہ خوش مزاجی ہے نہ حاضر جوابی - ہزل یا عریانی بھی اپنے معنی میں صحیح طور پر آنے نہیں پائی - البتہ از سر تا پا فحش و مغلظات بھرے پڑے ہیں - جن کی طرف کوئی شریف طینت' گرامی منش انسان رخ بھی نہ کرے گا -

میر آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں امیر خسرو کی نسبت لکھا ہے - ۱ " ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد..... امانا سخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید و اساس آن را بلند ساخت..... " خدا معلوم کہ آزاد کا اشارہ کس وقوع گوئی کی طرف ' اور کیا تھا - البتہ جو دو چار شعر خود اپنے یا کسی اور کے مثالاً نقل کئے ہیں ان کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آزاد کی مراد اس سے وہی تھی جو ان کے ہم خیال مقلدین و متاخرین نے لی ہے - یعنی جیسا کہ پروفیسر علی احمد خاں نے شیریں و خسرو کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے - ۲ "عشق و محبت اور وصل و فراق کی دنیا میں جو واقعات و معاملات واقع ہوتے ہیں اُن کی واقعیت ظاہر کرنے کو واقعہ نویسی یا معاملہ نویسی کہتے ہیں اور کسی خاص طرز ادا سے اس کا بیان کرنا واقعہ نویسی کا کمال ہے.....امیر خسرو اس کے موجد اور پورا کرنے والے ہیں.....شاید بقول امیر علاءالدولہ قزوینی اس رنگ کا عشق انگیز اور زلف و خال آمیز ہونا ہی ضروری ہے - " ۳

کہنا یہ ہے کہ واقعہ پھر واقعہ ہے - ہوسکتا ہے کہ بزم و خلوت میں بھی کبھی ہو جاتا ہو - لیکن وہ پیشتر رزم کا میدان' اور اپنا بسر عام ہونا پسند کرتا ہے - عشوہ و کرشمہ اور ناز و نیاز سے تنہا وابستگی نہیں رکھتا - وہ تیر و تفنگ اور معرکہ و نبرد کا عاشق ہے اور زمزمۂ چنگ سے زیادہ صف جنگ کا شائق - وہ راز جو' اسرار کو متشاعر جو دوسروں کو عشق مجازی اور عشق حقیقی کے پھندوں میں پھنسانا چاہتا ہے '

۱—صفحہ ۲۵ -

۲—صفحہ ۵ -

۳—نیز خزانۂ عامرہ صفحہ ۲۰۹ -

مجاز کو حقیقت کا پہلا زینہ بناتا ہے ' اپنی دلخواہ تعبیر و تعریف کے لئے نئے نئے حیلے تراشتا ہے - لیکن گستاخ و بسیار گو مورخ جو ایسی شعر گوئی کو کفر سمجھتا اور ان مجاز و حقیقت کی نیرنگیوں کو نگاہ حقیقت سے دیکھنا چاہتا ہے' منکر ہے - وہ سیاہ کو سفید سے متمائز کرتا ہے اور کسی آلودۂ فسق کو آسودگان عشق کی صف میں جگہہ نہیں دیتا - خوب جانتا ہے کہ یہ لفظ تو قرآن حکیم میں بھی آیا ہے - ائمہ‌لسان و لغت نے بھی اس کو اور اس کے مختلف معانی کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے - بہر کیف ' راقم سطور تو خسرو کا کمال زیادہ تر اسی حقیقی و تحقیقی واقعہ نگاری کی فراخ و ہموار زمین پر دیکھتا آیا ہے - شاعروں کی متخیلہ اور بگاڑی ہوئی صورت سے اُسے دور سے دور پایا ہے - واقعات دو قسم کے ہوتے یا ہوسکتے ہیں - ایک چشمدید جو لکھنے والے کے سامنے گزریں - دوسرے ' وہ جو سامنے تو نہیں گزرے لیکن سنے ہیں اور قلمبند کرنا پڑتے ہیں - اول‌الذکر کے بیان میں یہ خوبی ملحوظ رہنا چاہئے کہ سامع کے روبرو اصلی نقشہ ہوبہو کھنچ جائے اور جو اثر دیکھنے والے کے دل پر ہوا ہو وہي سننے والے پر پڑے - دوسری قسم کے ذکر میں ناقل کا کام ایسے واقعات کا انتخاب ہوسکتا ہے اور پھر خود اُس کا پرداز کلام ' جس کو سنکر سامع ' اور پڑھکر قاری' ایمان لے ائے کہ ضرور ایسا ہی ہواہوگا - شاعر کو اس تصویر کشي میں وہ تمام خط و خال نمایاں کرنے پڑتے ہیں جو خود تو اُس نے نہیں دیکھے مگر دوسروں کو دکھا دینا اُس کے کمال کا زیور ہے -

میرا خیال ہے کہ امیر اسی قسم کی واقعہ نگاری اور حقائق نویسی کے دلدادہ و گرویدہ تھے - انہوں نے اسی کو ترقی دے کر

اوج کمال پر پہنچا دیا تھا - ان کی عقیدت کیشی اور محبت ' جو اپنے با برکت مرشد کے ساتھہ حد سے بڑھی ہوئی تھی ' ان کو دنیا کی ابلہ فریبیوں اور عاشق مزاجیوں یا اُس زمانہ کی مودت نوازیوں کے لئے کب مہلت دیتی ہوگی - میں نے جن کتابوں کا اوپر ذکر کیا ھے وہ میری راستی خیال اور صدق مقال کی شاھد ھیں - مورخانہ مثنویاں ھوں یا رزمیہ نظمیں ' اس شناور بحر سخن کے سامنے سب سطح آب پر بہتی نظر آتی ھیں - بے شبہہ مغازلہ و معاملہ کے میدان میں بھی خسرو کامیاب ہوئے اور دوسروں سے فائق رھے ھیں ' مگر یہ چیز (منظوم تاریخ نگاری) تنہا انہیں کا حصہ تھی ' اور پھر اسقدر افراط و کثرت کے ساتھہ کہ جس کا پایان بھی نہیں ملتا - پرانے جنگی قصص' مذھبی غزوات اور مجاھدات کو تو بعض اور لوگوں نے بھی نظم کا لباس پہنایا ھے مگر واقعات عصری اور حادثات تاریخی کو موزوں کرنے میں تمام معروف یا مجہول الاحوال شعرا میں یہی پیش پیش رھے ھیں -

" تغلق نامہ " امیر خسرو کی آخری مثنوی بلکہ یقیناً آخری کتاب ھے ۱ - جسکے بعد اُن کو کچھہ لکھنے کی نوبت ھی نہیں پہونچی تھی - مورخین اور تذکرہ نویس اس بارہ میں متفق ھیں اور متفرق تحریروں سے بھی اس کی تائید ہوتی ھے کہ سلطان غیاث الدین تغلق شاہ اول ' صوبہ دار بنگالہ کے خلاف بعض شکایات اور عرضیوں کی تحقیقات کے لئے خود لکھنوتی (دارالصدر) کو ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ع) میں گیا اور امیر خسرو کو ھمرکاب لے گیا تھا۲ - بادشاہ تو اگلے برس واپس چلا آیا ' مگر خسرو کو کسی ضرورت سے وھیں چھوڑ دیا تھا - پورا سال

---

۱ — منتخب التواریخ قلمی - و یاد داشت نواب ضیاء الدین احمد خاں بنام سرھنری ایلیٹ سنہ ۱۸۳۸ع و حیات خسرو ' صفحہ ۱۱۹ -

۲ — حیات خسرو ' صفحہ ۵۵ -

گزر چکا تھا اور واپسی کی صورت نظر نہیں آتی تھی - لکھنوتی کا قیام ' حسرت و پریشانی ' دھلی کی مفارقت و جدائی سوھان روح تھی - ادھر غیاث الدین بھی کارزار حیات سے نجات پاچکا تھا ! - یہ وھی باجبروت تھا جو تمام تحریری اور زبانی روایات کے مطابق خسرو کے ملکوتوی صفات رھنما حضرت سلطان اولیا کے حسن اعتقاد سے محروم تھا - امیر نے یکا یک اپنے شیخ معظم کی رحلت کی خبر پائی - اس حادثۂ جان کاہ سے ان پر جو کچھہ گزری اُس کو لکھتے ھوئے لکھنے والوں کا دل دھلتا ھے - وہ آنکھیں جو نعال رحمت کے غبار کو اپنے اندر جگہ دینے کو ترس رھی تھیں ' روتے روتے پتھرا گئیں - وہ پیشانی جو اس متبرک آستانے پر جھکنے اور سجدۂ و سجود کے لئے وقف اور سرتاپا تمنا تھی ' سنگ و حشت سے لہو بھر کر زخمی ھو رھی تھی - کسی نہ کسی طرح یہ دھلی پہونچے بے اختیار ھوکر سر منڈوا ڈالا - چہرہ پر سیاھی پھیر لی ۲ - اور اس ھیئت کذائي سے آستان جنت نشاں پر حاضر ھوئے - پہلے تو کھڑے کھڑے روتے رھے - پھر مزاز مبارک پر اپنا سر دے مارا ۳ - ھوش میں آئے تو زندگی بھر کا اندوختہ ' عمر بھر کي کمائی ' نقد و جنس سب مساکین و فقرا کو بانٹ دی۴ - مال و متاع فانی سے سبکدوش و فارغ ھوکر تمام دنیوی کاموں سے دستکشی کرلی - موٹا سیاہ ماتمی لباس اختیار کرلیا تھا اور مزار پر انوار کی مجاورت و حاضر باشی۵ - یہ تھے اور ان کا جوش و خروش ' اور وہ مستانہ شوریدگی جو آگاہ دلوں کے بقول عشق صادق کا

۱— حیات خسرو ' صفحہ ۵۹ -
۲— " " صفحہ ۵۹ -
۳— " " صفحہ ۶۰ -
۴— " " صفحہ ۶۰ -
۵— " " صفحہ ۶۰ -

لوازمہ اور چشتی نسبتوں کا خاصّہ ہے - چھہ مہینے بعد اسی حال اور انتہاے حزن و ملال میں ۱۸ شوال ۷۲۵ھ (ستمبر ۱۳۲۵ع) کو اس درد و غم بھری دنیا سے رخصت ہوگئے۱ - اپنے محبوب رہبر کے مرقد مطہر کے پائیں ' جو ان کے سوز سینہ کا جیتے جی واسطہ دیتے رہے تھے ' ہمیشہ کے لئے خاموش اور آسودۂ خاک ہیں۲ -

تغلق نامہ کے تحریر کرنے کا صحیح زمانہ متعین نہیں ہوسکتا کیونکہ مجوزہ یا موجودہ نسخے کے آخری اجزا ' جہاں اپنی تصنیفات میں معمولاً خسرو سال تحریر اور تعداد اشعار و سلسلۂ تصانیف درج فرما دیتے تھے ' کم از کم چار صدیاں ہوچکیں کہ اس جہان گزران سے گزر چکے ہیں - یہ بھی ظاہر ہے کہ امیر نے یہ مثنوی اپنے آقا و مربّی سلطان غیاث الدین مذکور کے عہد میں لکھی تھی اور اُسی کے نام سے منسوب کی ہوگی۳ - بقول مسٹر بیل اور مولوی سعید احمد ' ان کو اس بادشاہ کے خزانہ سے ایک ہزار تنکہ۴ ماہوار ملتا تھا - یہ سب صحیح اور مجملاً یہ معلومات قابل استناد ہے ؛ نیز یہ کہ اس میں واقعات ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ع) تک کے ہیں - رہا سال تصنیف جو ۷۲۵ یا کچھہ دن قبل بتایا جاتا ہے ' قیاس چاہتا ہے کہ یہ بھی صحیح اور درست ہو -

---

۱—حیات خسرو ' صفحہ ۹۰ - مسٹر بیل ڈکشنری ' صفحہ ۱۵۱ -

۲ ,, ,, ' صفحہ ۹۰ ید بیضا ' صفحہ ۱۲۰ -

۳ —مسٹر بیل ڈکشنری ' صفحہ ۱۵۱ -

۴—اُس وقت کا تنکہ ایک تولہ سونے یا چاندی کا سکہ تھا - نقرئی تنکہ کے تانبے کے پچاس پیسے ہوتے تھے - یہ پیسہ جیتل ہی کہلاتا تھا اور اس کا وزن ایک تولہ یا پونے دو تولہ ہوتا تھا - مولف حیات خسرو کی روایت ہے کہ امیر کو جلال الدین فیروز شاہ بارہ سو تنکہ تنخواہ دیتا تھا - جیتل کا نام اس عہد کے بعد نہیں ملتا ہے - ان کے قریب ہی کے زمانہ میں متروک ہوگیا تھا اور سکّوں کے نئے نئے نام ' اشرفی ' اختر زر وغیرہ رائج ہوگئے تھے - مثنویات خسرو میں جیتل اکثر چاندی کے معنے میں آیا ہے -

خدا بخشے نواب محمد اسحاق خاں کو جن کی دلچسپی اور ادبی شغف کے طفیل (بیس برس ہوئے جب) سلسلہ خسرویات کی تہذیب و طباعت و اشاعت کا معاملہ در پیش ہوا اور کئی مثنویاں بڑے اہتمام اور بڑی آب و تاب کے ساتھ چھپ کر نکلیں ' تو تغلق نامہ کی تلاش بھی دامنگیر ہوئی - مگر باوجود کوشش بلیغ نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے کسی معروف و با قواعد کتب خانہ میں اس کا سراغ تک نہ چلا - یہ بھی عجب اتفاق و بخت تھا کہ فارسی کی ایک پرانی قلمی مثنوی کا نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب‌الرحمان خان شروانی کے ذخیرہ نوادر میں موجود تھا - جس کے سر ورق پر غلطی سے یا صحیح طور پر " جہانگیر نامہ عطائے حیاتی کاشی " نام لکھا تھا ' جس نے اپنے متعلق خود اپنے فاضل و وسیع‌النظر مالک کو بھی شبہ میں ڈال رکھا تھا - دنیائے علم و ادب کو جنت مکین مولوی رشید احمد انصاری متخلص بہ سالم پروفیسر علی گڈہ کا مرہون احسان ہونا چاہئے ' جنکی سعی و کرم کی بدولت یہ منزل کسی نہ کسی طرح ختم ہوگئی اور جن کے تفحص و تجسس سے یہی نسخہ " تغلق نامہ خسرو " قرار پاگیا - مرحوم نے خود محنت و تحقیق کرکے پہلے اس کی ایک صحیح نقل تیار کی - پھر اس پر مقدمہ لکھا ' جو افسوس ہے کہ موصوف کی مرگ بے ہنگام سے نا تمام رہا - اِدھر نواب اسحاق خان کے انتقال سے بقیہ کلیات خسرو ' اُدھر مولوی صاحب کی رحلت سے اِن کے مفروضہ یا مسلمہ " تغلق نامہ " کی طباعت و اشاعت کا سارا کام در ہم و برہم ہوگیا - لیکن جزائے نیک ملے مولوی سید ہاشمی فریدآبادی کو ' جنکی سعی و التفات سے اِس نایاب مثنوی کے چھپنے کی نوبت پہونچ گئی - خواہ وہ تغلق نامہ ہو خواہ جہانگیر نامہ - سید صاحب نے اس کی

تلاش و جستجو میں یورپ کے کتب خانے بھی چھان ڈالے مگر تغلق نامہ کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوا - موصوف کی اس عنایت و مہربانی اور اُن کی کاوش و جانفشانی اور کتاب کی صحت و نظر ثانی کے ادائے شکر در شکر کے بعد حیدرآباد دکن کی مجلس مخطوطات فارسی ہماری دلی منت پذیری اور سچی سپاسگزاری کی مستحق ہے ' جس نے اپنے سرمایہ و اهتمام سے اس کو چھپوایا اور جیسی نادرالوجود اور پرانی کتاب تھی اُس کے لئے ویسا ہی پرانا اور پرانے قسم کا بدنما ٹائپ بھی تجویز و انتخاب کیا - جس کا پڑھنا باوجود روشن اور جلی ہونے کے لطافت پسند آنکھوں پر گران گزرتا رہے - بہر کیف مقام مسرت ہے اور موجب نازش کہ آج ہمارے مطالعہ و آگاہی کے لئے آٹھویں صدی ہجری کے ربع اول کا وہ تاریخی مراد فراہم ہوگیا ہے - جس کی حرف بحرف اطلاع ہی سے خود معاصرین یا قریب وقت کے مورخ مثلاً مراکش کا مشہور سیاح ابن بطوطہ مغربی صاحب عجائب الاسفار اور ضیاء الدین برنی مولف تاریخ فیروز شاہی بھی قاصر رہے تھے آپ اگر مطمئن ہوں تو اس کو خسرو دہلوی کا تغلق نامۂ مانیں اور غیاث الدین تغلق اول کے نام معنون ؛ ورنہ حیاتی کاشی کی مثنوی اور نورالدین جہانگیر کے نام سے منسوب ' جہانگیر نامہ ہونے میں تو کسی کو تامل ہو ہی نہیں سکتا - واقعات وہی ہیں ' اوقات وہی - صرف زمانۂ نظم اور حضرت ناظم کا مسئلہ زیر نزاع ہے - اور یہ بحث و تمحیص اُس حد سے تجاوز کرجاتی ہے جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے "کیسی ہی خوب بات ہو حسن کو اختلاف ہے" - بحث طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ کتاب جو ہمارے پیش نظر ہے اصلی تغلق نامہ ہے یا جہانگیر نامہ یا اِن دونوں میں سے کوئی نہیں ' اس کے لئے دوسرے مضمون کی ضرورت ہے جو انشاءاللہ آئندہ حاضر کیا جائیگا -

" دنیا کی موجودہ کسا و بازاری کے اسباب "

(از پروفیسر محمد حبیب الرحمان ایم - اے - (علیگ)

(ا)

اب سے کم و بیش ایک صدی قبل بنیٔ نوع انسان کی مادی خوشحالی میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ تصور کی جاتی تھی ' وہ اضافۂ آبادی کا رجحان تھا - خاص کر مالتھس نے جس شکل میں نظریۂ آبادی کو پیش کیا ' وہ بلاشبہ حوصلہ مند افراد کے لئے بہت ہی مایوس کُن تھی - خیال یہ تھا کہ انسان جدو جہد کر کے جس قدر زیادہ دولت پیدا کرتے ہیں اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ سرعت کے ساتھہ اُن کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے - اور اِس وجہ سے اُن کی معاشی حالت میں کوئی مستقل ترقی اور اُن کے معیار زندگی میں کوئی دیر پا بلندی حاصل نہیں ہو سکتی - ظاہر ہے کہ جب ہماری ترقی ہی میں ہماری پستی کے اسباب مضمر ہوں تو بڑے سے بڑے سورماؤں کا بھی ہمت ہار جانا حق بجانب ہے - لیکن خوش قسمتی سے یہ مالتھس کا ایجاد کردہ بھوت اصلیت سے بہت دور اور محض ایک وہمی تخیل ثابت ہوا - اب ہم یہ جانتے ہیں کہ گو آبادی میں اِضافہ ہوتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں کہ وہ اُسی رفتار سے ہو جو مالتھس نے فرض کی تھی - یہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے میں ایسے ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جہاں آبادی ایک خاص حد تک پہونچ کر رک گئی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ آئندہ اس میں اضافہ کے بجائے تخفیف ہونے لگے - اس کے علاوہ گذشتہ سو ڈیڑہ سو سال کے اندر انسان کو قدرتی وسائل پر جو غیر معمولی تصرف حاصل ہوا ہے اور پیدایش دولت کے نئے طریقے ایجاد کرنے میں اُس نے جو

غیر معمولی ترقی کی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے مستقبل سے اِس قدر مایوس ہوں - چنانچہ اُن امور کا خیال کرکے بعض ذی فہم لوگوں نے مالتھس کے بھوت سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اُسے شیشے میں اُتار نے کی کوشش کی اور حسن اتفاق سے اِس غرض کے لئے ایک مؤثر عمل بھی اُن کے ہاتھہ لگ گیا - فرانسیسی زبان کے دو لفظ یعنی Laissez Faire (آزادہ روی) اِس بھوت کو شیشے میں بند رکھنے کے لئے کم از کم حال تک بہت کار گر ثابت ہوتے رہے - عملی نقطۂ نظر سے اِس تدبیر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہر ملک کی حکومت اپنے باشندوں کی کاروباری زندگی سے جہاں تک ممکن ہو علیحدہ رہے - جان و مال کی حفاظت کے لئے ضروری قوانین نافذ کرنے اور کارو بار کی سہولت کے لئے بعض عام تد بیریں اختیار کرنے کے علاوہ حکومت ملک کے مختلف طبقوں کی معاشی جدو جہد میں قطعاً دخیل نہ ہو بلکہ باشندوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دے اور ہر شخص کو اِس بات کی کامل آزادی دے رکھے کہ وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے جو کام جس طور پر کرنا چاہے کرے - خیال یہ تھا کہ صرف اِسی طرز عمل کی بدولت ملک کے عام مفاد میں زیادہ سے زیادہ ترقی ہو سکتی ہے اور باشندگان ملک کی مادی خوشحالی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ حاصل کیا جاسکتا ہے - بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی نفع کے پیچھے پڑا ہوا ہے ' لیکن بحیثیت مجموعی ملک کے عام مفاد کو بڑھانے کا بھی در اصل یہی کار گر طریقہ ہے - بالفاظ دیگر کوئی شخص کسب معاش کا کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کرسکتا جس کی بدولت دوسرے اشخاص کو کچھہ نہ کچھہ بالواسطہ فائدہ نہ پہونچے - گویا اِس طور پر محنت و مشقت کا سب سے بڑا محرک یعنی ذاتی نفع کی خواہش ' مفاد عامہ کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتی

ھے - ایسے نظام معیشت کے تحت یہ ضرورت ھی باقی نہیں رھتی کہ کسی ایک مرکز سے تمام افراد کی جدوجھد پر نگاہ رکھی جائے اور حتی الوسع اُسے قابو میں رکھا جائے - جب ھر فرد اپنے محدود دائرۂ عمل کے اندر ذاتی نفع کی راہ پر چل کر غیر محسوس مگر قطعی طور پر مفاد عامہ کو آگے بڑھاتا ھے تو پھر کیا ضرورت ھے کہ کوئی با اقتدار ادارہ ایک مرکز سے تمام ملک کی پیدایش و تقسیم دولت کا انتظام کرے ' خاص کر ایسی حالت میں جب کہ ایسے اجتماعی انتظام سے یہ اندیشہ لگا ھوا ھو کہ اس کی بدولت انفرادی جدو جھد کا عالمگیر اصول اور زبردست محرک کمزور ھوجائیگا -

اُنیسویں صدی کے اکثر و بیشتر حصہ میں انفرادیت کے اس طریقے نے بلا شبہ بڑی شاندار کامیابیاں حاصل کیں - سائنس کی حیرتناک ترقی ' نئی نئی ایجادوں کا لامتناھی سلسلہ ' قدرت پر انسان کا روز افزوں تصرّف ' مادی تہذیب کی وہ عظیم‌الشان عمارت جس کے اندر کروڑوں انسان راحت و آرام کے ایسے ذرائع سے بہرہ ور ھیں جو زمانۂ سابقہ میں اُمراء اور بادشاھوں کو نصیب نہیں تھے یہ تمام ترقیاں انسان کو اسی خود بخود چلنے والے ' آزاد ' انفرادی ' غیر مرکزی اور بے ترتیب نظام معیشت کے تحت حاصل ھوئیں -

لیکن جبتک اِس طریقے کی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رھا اور اس کی ناقابل انکار کامیابیاں نظروں کے سامنے آتی رھیں اُسوقت تک کسی کی یہ ھمت نہ پڑسکتی تھی کہ اُسکے تفوّق پر کسی قسم کا کوئی اعتراض یا اسکی صحت اور خوبی کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی چون و چرا کرسکے - نتیجہ یہ ھوا کہ اُسکے بنیادی نقائص ایک مدت تک نظروں سے پوشیدہ رھے اور کسی کو یہ دریافت کرنے کی ضرورت ھی

محسوس نہ ہوئی کہ آیا اِس طریق معیشت کی یہ صفت کہ وہ بغیر کسي مرکزی ترتیب اور نگراني کے خود بخود ٹھیک اور مناسب طور پر چلتا رہتا ھے ' اُسکي ذات کے ساتھہ وابستہ ھے یا یہ کہ وہ محض چند اتفاقي ' غیر مستقل اور عارضي حالات کا نتیجہ ھے -

واضح رہے کہ طریق انفرادیت کے عین عروج کے زمانے میں بھي دور رس نگاھیں اُسکے بنیادی مفروضات کي بے حقیقتي اور اسکي کامیابي کے شرائط کے عارضي وجود کو پہچان چکي تھیں ' لیکن اسکي کامیابیاں بہ مقابل اسکے نقائص کے اسقدر کثیر اور ایسي بدیہی تھیں کہ عام نگاھیں نہ خود اِن نقائص کو دیکھہ سکتی تھیں اور نہ دوسرے دیکھنے والوں کے اقوال پر کان دھرنے کیلئے تیار تھیں - ورنہ حقیقت یہ ھے کہ ابتدائي زمانے سے ھي حالات کي بتدریج تبدیلي کے ساتھہ ساتھہ ذاتی منافعہ اور مفاد عامہ کی یکسانیت کا مفروضہ جو کہ اس آزاد طریق معیشت کا سنگ بنیاد ھے ' وقتاً فوقتاً مشتبہ نظر آنے لگا تھا - لیکن جب کبھی کسی آزاد خیال اور منچلے شخص نے اِس مقبول عام مسلک کی اضافیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوششیں کی ' اُسے یہ کہکر خاموش کردیا گیا کہ یہ محض چند مستثنیات ھیں جو اصلی نظرئے کو کمزور کرنے کے بجائے اسکي صحت و صداقت کا مزید ثبوت ھیں - توضیح کیلئے ھم دو تین مثالوں پر غور کریں گے - جب صنعتی انقلاب کی بدولت پیدایش دولت کے جدید طریقوں کا آغاز ھوا اور چھوٹے چھوٹے کاریگر اپنا اپنا کاروبار بند کرکے بڑے بڑے کار خانوں میں بحیثیت مزدوروں کے اُجرتوں پر کام کرنے لگے تو طریق انفرادیت کے مطابق افراد کو ان کی کاروباری زندگی میں آزاد چھوڑ دیئے اور ذاتی نفع کی رھنمائي میں اپنا ذریعۂ معاش منتخب کرنے کي اجازت

دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے کارخانوں میں کمسن بچوں اور
ان کے محتاج ماں باپ پر وہ اُفتاد پڑی کہ حکومت کو بہت جلد
مزدوروں اور اجیروں کے باھمی تعلقات میں قوانین کارخانہ جات کے
ذریعہ سے روز افزوں دخل دینے کی ضرورت محسوس ہوئی - اسکے علاوہ
جب مزدوروں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اُن کا افلاس اور انتشار اُن
کو اپنی محنت کے ثمرات سے کما حقہ ' مستفید نہیں ہونے دیتا بلکہ
اُن کی پیدا کی ہوئی دولت کا اکثر و بیشتر حصہ روز افزوں منافعہ کی
شکل میں فریق ثانی کے قبضے میں چلا جاتا ھے تو انھوں نے اپنی
کمزوریوں کے اسباب کو دور کرنے کی کوششیں کیں اور مزدور سبھائیں قائم
کر کے اِس مقصد میں ایسی عظیم‌الشان کامیابی حاصل کی کہ اب نہ
آزاد مسابقت ھی قائم رھی اور نہ افراد کیلئے ' ذاتی منافعہ کی رھنمائی
میں اپنے اپنے حسب منشاء کام کرنے کا امکان باقی رھا - یہی نہیں
بلکہ زمانے کی ترقی اور پرانے حالات کی تبدیلی کے ساتھہ ساتھہ
حکومت اپنی رعایا کی کاروباری زندگی میں براہ راست اور روز افزوں
دخل دینے پر مجبور ہوتی گئی اور برابر ہوتی جارھی ھے - چنانچہ تمام
ترقی یافتہ ممالک میں مفت تعلیم ' مفلسوں کی پرورش ' اور بیکاروں کی
امداد ' ضعیفوں کی دیکھہ بھال اور اسی قسم کے گوناگوں کام حکومت کے سپرد
ھیں جن کی سربراھی وہ اپنے عام محاصل سے بالکل اُسی طریقے پر کرتی
ھے جس طریقے پر کہ وہ ملک کی مدافعت کے لئے فوجیں اور اندرونی
امن و امان کے لئے پولس اور عدالتیں برقرار رکھتی ھے - ایک اور بڑا عامل
جس کی بدولت آزاد مسابقت کا دائرۂ عمل روز بروز تنگ ہوتا جارھا ھے '
وہ وسائل نقل و حمل کی روز افزوں سہولت ھے - آج کل تقریباً ھر ملک
میں ھزاروں بلکہ لاکھوں باشندوں کے ذرائع معاش دوسرے ممالک کے

حالت سے ناگزیر طور پر وابستہ ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی ایک ملک میں کسی وجہ سے کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو اس کا اثر متعدد دوسرے ممالک پر پڑتا ہے : ہندوستان میں روئي کي فصل خراب ہوتی ہے تو جاپان کے پارچہ باف بیچین نظر آتے ہیں ' کناڈا اور آسٹریلیا میں گیہوں کی کاشت پھیلتی ہے تو امریکہ اور آرجنٹائن کے کاشتکار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ' انگلستان اور اس کی نو آبادیات میں ترجیحی تجارت کے معاهدے ہوتے ہیں تو ساری دنیا میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے ' فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دنیا کے کل سونے کی تین چوتھائی مقدار اکھٹی ہوجاتی ہے تو تمام دنیا کی تجارت خارجہ درهم برهم هو جاتی ہے ' روس اپنی شہرۂ آفاق پنجسالہ اسکیم پر عامل ہوتا ہے تو یورپ و ایشیا کي دوسری حکومتیں اپنی اپنی جگہہ پر سہمی جاتی ہیں ' انگلستان معیار طلاء کو چھوڑ کر اپنے زر کی قدر کو گرا دیتا ہے تو ہندوستان سے سونے کی برآمد کا ایسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو کسی طرح منقطع ہوتا نظر نہیں آتا ' انگلستان اور امریکہ اپنے قرضے چکاتے ہیں تو ہندوستان سے لد لد کر چاندي روانہ کی جاتی ہے - غرض اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن سے ہم یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کیونکر گذشتہ چند سال کے اندر کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں رہنے والوں کے اغراض و مفاد ناقابل انفکاک طریقہ پر ایک دوسرے کے ساتھہ وابستہ ہو گئے ہیں - گزشتہ جنگ عظیم کے بعد سے تو یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہوگئی ہے کہ اب کوئی ذي عقل انسان اس کی واقعیت سے انکار نہیں کرتا ' عام ازیں کہ وہ اسے اچھا سمجھتا ہو یا برا - اِن مثالوں کو پیش کرنے سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اِس چوتھے عشرہ میں جن جن حالات و کیفیات کے اندر ہم زندگي بسر کر رہے ہیں وہ Laissez Faire یا اصول غیر مداخلت کے

سراسر منافی ھیں - جدید حالات و رجحانات نے اس نظام معیشت کے دونوں اہم مسلمات کو صاف طور پر جھٹلا دیا ھے - ھم بدیہی طور پر یہ محسوس کرتے ھیں کہ آج کسی ملک کا نظم معیشت اپنے آپ نہیں چل سکتا - بغیر حکومت کی مداخلت اور مرکزی انتظام اور ترتیب کے خود بخود ٹھیک راستے پر چلنا تو درکنار ' وہ ایک دن کے لئے بھی برقرار نہیں رہ سکتا - دوسرے یہ خیال کہ ذاتی منافعہ کی خواھش میں افراد اپنے اپنے طور پر جو طریق عمل اختیار کرتے ھیں وہ لازماً مفاد عامہ کے مطابق ھوتا ھے ' صریحاً بے بنیاد ھے - مزدوروں اور سرمایہ داروں ' زمینداروں اور کسانوں ' دولتمندوں اور مفلسوں' دولت پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں کے مخالفانہ اغراض و مفاد کے مظاھرے روزانہ ھماری نظروں کے سامنے آتے رھتے ھیں - مزید بر آں مختلف ممالک کے معاشی اغراض کا تصادم بھی کوئی مخفی شے نہیں ھے - ایسی حالت میں کیونکر کسی حکومت سے توقع کرسکتے ھیں کہ وہ اپنے باشندوں کے مفاد کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر خود الگ بیٹھی رھیگی -نتیجہ یہ ھے کہ اب اصول غیر مداخلت سے انحراف کی مثالیں ھر ملک میں اس قدر کثیر اور ایسی اھم ھوگئی ھیں کہ انہیں محض مستثنیات کہکر ٹالا نہیں جاسکتا - حقیقت یہ ھے کہ ان مستثنیات نے اصلی نظریئے کی ساری بنیادیں کھوکھلی کردی ھیں اور اس کی ظاھری شکل بھی اس قدر مسخ کردی ھے کہ جو ممالک اپنی دانست میں اُس پر کاربند ھیں ؛ وھاں بھی مشکل ھی سے اُس کی شناخت کی جاسکتی ھے -

یہانتک ھم نے یہ ظاھر کرنے کی کوشش کی ھے کہ انیسویں صدی کے مدبرین نے دنیا کے معاشی امراض کے علاج کے لئے Laissez Faire کا جو سیدھا سادہ اور آسان منتر تجویز کرلیا تھا ' وہ محض افسانی تھا - یعنی

اس کی تاثیر چلد خاص حالات کے ساتھہ وابستہ تھی ' جب تک وہ حالات برقرار رھے یہ منتر بھی موثر ثابت ھوتا رھا ' لیکن جب سے یہ حالات بدللے شروع ھوئے لوگ اس تدبیر سے بھی بتدریج دست کش ھونے لگے ' حتی کہ ایک ملک یعنی سوویٹ روس سے تو اب اس ملک کا پورے طور پر اخراج ھو چکا ھے اور بقیہ ممالک میں اگرچہ ابھی تک اس پر عمل جاری ھے تاھم اس کا دائرہ روز بروز تنگ ھوتا جارھا ھے اور اس کا حریف مسلک جسے انگریزی میں Planning System کہا جاتا ھے اس کی جگہہ مسلط ھو رھا ھے - لیکن اس نئے ملک کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ھے کہ ایک طرف تو ھر ملک اپنے اپنے حدود کے اندر جس قدر جلد ممکن ھوسکے ' اس کو تکمیل پر پہونچانے کی کوشش کرے اور دوسری طرف ساتھہ ھی ساتھہ تمام ممالک متفق ھوکر اپنے باھمی تعلقات کو بھی اُسی ملک کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں - کیونکہ جب تک مختلف ممالک سونچ بچار کرکے اپنے باھمی اغراض و مفاد میں بجائے تصادم کے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں گے اس وقت تک اس کرۂ ارض کے رھنے والوں کو باوجود قدرت پر روز افزوں غلبہ پانے کے امن اور چین کی زندگی نصیب نہیں ھوسکتی - چنانچہ موجودہ دور میں انسان جن گوناگوں مصائب میں مبتلا ھیں اور باوجود فراوانی دولت کے جو افلاس اُن میں پھیلا ھوا ھے ' اس کی سب سے بڑی ' سب سے اھم اور بنیادی وجہ یہی ھے کہ ھم سر دست ان دو مسلکوں کے بین بین ھیں ' یا یوں کہئے کہ ھم ان میں سے کسی پر بھی ٹھیک طور پر قائم نہیں ھیں -"

اِن میں سے ایک تو وھی اپنے آپ چلنے والا قدیم طریق معیشت ھے جس کے تحت ذاتی نفع کی خواھش ' آزاد مسابقت کے توسط سے تغیرات قیمت کی رھنمائی میں ' خود بخود انسانی ضروریات کی سربراھی کردیتی ھے -

دوسرا وہ جدید نظام معیشت ھے جس کے تحت آئندہ ضروریات کا قبل
از قبل تخمینہ کر کے ایک طرف تو دولت کی پیدائش کو اُسی کے مطابق
ڈھالا اور قابو میں رکھا جاتا ھے اور دوسری طرف پیدا کی ہوئی دولت کو
اپنے آپ تقسیم ہونے کیلئے نہیں چھوڑ دیا جاتا بلکہ اُس کا بھی خاص طور
پر انتظام کیا جاتا ھے - اول الذکر یعنی اپنے آپ چلنے والے طریقے کی خاص
خوبی یہ ھے کہ اسکے تحت ایک تو انسان کی پیدا آور قوتوں کے لئے
ذاتی نفع کی شکل میں ایک زبر دست محرک دستیاب ہو جاتا ھے -
دوسرے انسانی خواھشات کی تکمیل کیلئے ' عام ازیں کہ وہ حقیقی ضرورت
پر مبنی ہوں یا محض تلون مزاجی کا نتیجہ ' زیادہ گنجائش نکل آتی
ھے - لیکن اس طریقے کا سب سے بڑا نقص یہ ھے کہ اُس کے تحت اشیاء '
کی طلب میں کوئی پابندی اور باقاعدگی نہیں رہتی جس کی وجہ سے
دولت کی پیدائش اور اس کی نکاسی میں وقتاً فوقتاً سخت خلل واقع
ہوتا ھے اور اس طور پر مفید اور ناگزیر وسائل معاش بیدریغ ضائع ہو
جاتے ہیں - آخرالذکر طریقہ کی خوبیاں اور نقائص اس کے بالکل برعکس
ہیں - نقص تو اس کا یہ ھے کہ اس کے تحت عام طور پر پیدائش دولت کا
محرک نسبتاً ضعیف ہوتا ھے - لیکن اس کی خاص خوبی یہ ھے کہ جو
کچھ وسائل اور پیدا آور قوتیں انسان کو میسر ہوتی ہیں ' ان کو
باقاعدگی اور کفایت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ھے اور اس طور پر جو
کچھ دولت پیدا ہوتی ھے اس کی تقسیم میں حتی الوسع انصاف کو ھاتھ
سے نہیں چھوڑا جاتا - سر دست ہمیں ان دو متضاد طریقوں کی خوبیوں
اور نقائص کی تفصیل سے چنداں سروکار نہیں ھے - بات جو قابل لحاظ
ھے وہ یہ ھے کہ ہم حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طریقے
پر سابقہ مسلک سے تو بہت کچھ ہٹ گئے ہیں لیکن اِس جدید

مسلک کي طرف جس سرعت کے ساتھ قدم بڑھانا چاھئے ' نہیں بڑھا رھے ھیں - نتیجہ یہ ھے کہ ھم اس درمیانی دور کے اندر دونوں مسلکوں کے فوائد سے محروم ھوگئے ھیں - قبل از قبل سونچی ھوئی تجویزوں پر عمل کرنے سے جو فوائد حاصل ھوتے ھیں ' وہ تو ابھی تک ھماری دسترس سے باھر ھیں لیکن سرکاري نگرانی ' خانگی مراعات اور اِجاروں کی شکل میں ھم نے اِس قدیم ' اپنے آپ چلنے والے طریقہ کی راہ میں بھی ایسی رکاوٹیں پیدا کردی ھیں کہ جو فوائد آزاد مسابقت سے دولت صَرف کرنے والوں کو حاصل ھوا کرتے تھے ' وہ بھی ھمارے ھاتھوں سے جاچکے - نتیجہ یہ ھے کہ دنیا آجکل سخت ضغطے میں مبتلا ھے اور اِس پریشانی کے عالم میں انسانوں سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ھورھی ھیں - مثال کے طور پر ھم چند واقعات بیان کریں گے جو اُمید ھے کہ دلچسپی کا باعث ھونگے -

ھم جانتے ھیں کہ گزشتہ چند سال سے دنیا کے سب سے زیادہ دولتمند خطوں یعنی یورپ و امریکہ میں لاکھوں بندگان خدا کو محض اس وجہ سے پیٹ بھر کھانا نہیں مل رھا ھے کہ گیہوں خریدنے کے لئے اُن کے پاس کافی زر موجود نہیں ھے مگر انہیں ممالک میں بہت سے کاشتکار محض اس وجہ سے کہ انہیں اپنے گیہوں کی مناسب قیمت نہیں ملتی ' اس کی کثیر مقدار یا تو گوداموں میں بیکار ڈال رکھتے ھیں یا اگر اِسکے مصارف بھی نا قابل برداشت ھونے لگیں تو اسے یونہی بیکار جلا ڈالتے ھیں اور آئندہ فصلوں کے لئے کاشت کا رقبہ گھٹا دیتے ھیں - کیا یہ تعجب کا مقام نہیں ھے کہ یورپ میں لاکھوں مفلس انسان سردی میں ٹھٹھرتے رھیں اور بریزیل میں اعلیٰ درجہ کی قہوہ ریل کے انجنوں میں جلا دی جائے اور حکومت یہ حکم نافذ کردے

کہ آئیندہ تین سال تک قہوہ کا کوئی نیا پودا نہ لگایا جائے ؟ کسقدر حیرت کی بات ہے کہ جرمنی میں لاکھوں مرد اور عورتیں گوشت کو ترستے رہیں اور اس کے پڑوس کے ملک ڈنمارک میں تھائی لاکھہ بیل اور گایوں کو صرف اس وجہ سے ہلاک کرکے جلا دیا جائے کہ ڈنمارک کے کسان اُن کا گوشت جرمنی کے ہاتھہ نفع بخش قیمت پر نہیں فروخت کرسکتے ! ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ ہالینڈ میں ایک لاکھہ سور ہلاک کرکے جلا دئے گئے اور پرتگال میں شراب کی کثیر مقدار موریوں میں بہادی گئی ' مگر اس وجہ سے نہیں کہ وہ لوگ سور کا گوشت کھانا اور شراب پینا حرام تصور کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اِن چیزوں کا کوئی خریدنے والا نہیں - اسی طرح اسپین کے باغوں میں پھل درختوں ہی پر سڑ سڑ کر گر رہے ہیں اور ملایا مشرقی ' جزائر ہند اور جنوبی امریکہ میں ربڑ درختوں سے یونہی بہا جا رہا ہے لیکن کیا مجال کہ کوئی اُسے اکٹھا کرنے کی کوشش کرے - ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تو فوج کے سپاہیوں کو بھیج بھیج کر مزدوروں اور تاجروں کو تیل کے چشموں سے نکلوادیا گیا تاکہ وہ زمین سے تیل نہ نکالنے پائیں - مغربی جزائر ہند میں میلوں نیشکر کے درختوں کی شیرینی کھیتوں پر ہی کھڑے کھڑے ضائع ہوگئی اور ہندستان میں ہزارہا جوت کے پودوں کا بھی یہی حشر ہوا - مختلف ممالک میں تلوں مردہ مچھلی دوبارہ سمندر کے حوالے کردی گئی مگر بھوکے انسانوں کو کھانے کے لئے نہ مل سکی - غرض اِسی قسم کی بیسیوں مثالیں آپ کے سامنے پیش کیجاسکتی ہیں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کیونکر یہ تہذیب و تمدن کے علمبردار ' اپنی عقل و ذہانت پر گھمنڈ کرنے والے اور بقیہ ساری دنیا کو بیوقوف سمجھنے والے ' خدا کی اِن بیش بہا نعمتوں کو بیدردی کے ساتھہ ضائع کر رہے ہیں ' اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ اُنہیں کے بھائی بند

سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تلاش معاش میں حیران و پریشان اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں - ہم جانتے ہیں کہ آج دنیا میں بیکاروں کی تعداد کا تخمینہ تیس ملین کیا گیا ہے - طرفہ یہ کہ اِس میں سے بارہ ملین صرف اُس ملک کے حصے میں آئے ہیں جو مسلمہ طور پر دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند ہے ' جس کے بنکوں میں ساری دنیا کے سونے کی قریب قریب نصف مقدار محفوظ ہے اور دنیا کے بڑے بڑے ممالک جس کے قرضدار اور باجگزار ہیں - ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بارہ ملین اشخاص جو صرف چار سال پیشتر طرح طرح کے پیدا آور کاروبار میں لگے ہوئے تھے ' آج کام نہ ملنے سے ہاتھہ پر ہاتھہ دھرے بیٹھے روٹیوں کو محتاج ہیں - حالانکہ اُنہیں کے حدود عملداری کے اندر لاکھوں من گیہوں گوداموں میں اور کروڑوں روپے کا سونا بنکوں میں بند اور بیکار ہے - ایسی حالت میں اگر کوئی مریخ کا رہنے والا اِس کرۂ ارض کو ایک پاگل خانہ اور اس پر بسنے والوں کو ایک پاگلوں کا انبوہ تصور کرے تو کیا ہم انصافاً اُسے متعصب کہ سکتے ہیں ؟

سوال یہ ہے کہ آخر اِس عجیب و غریب صورت حال کے اسباب کیا ہیں ؟

ہماری رائے میں سب سے اہم اور بنیادی وجہ تو وہی ہے جو ابھی اوپر بیان کی جاچکی ہے ' یعنی سائنس کی ایجادات ' وسائل آمد و رفت کی ترقی اور ہماری روز افزوں معلومات - ہمیں بدیہی طور پر بتلا رہی ہیں کہ یہ کرۂ ارض جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں' دراصل ایک Unit (اِکائی) یا رقبہ ہے اور اسلئے یہ ضروری ہے کہ اسکے گوناگوں معاملات کا انتظام کرتے وقت اِس حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے -

لیکن حالت یہ ہے کہ ہمنے باوجود ان بدیہی رجحانات کے اپنی اِس چھوٹی سی دنیا کے کوئی ستر چھوٹے بڑے حصے کر رکھے ہیں اور وہ بھی کسی معقول اصول پر نہیں بلکہ محض چند اتفاقی حوادث کی بنا پر اور لطف یہ ہے کہ اِن میں سے ہر ایک حصہ اپنے آپ کو ایک بالکل علیحدہ دنیا بنانے کی فکر میں ہے - وہ اپنے تمام معاملات کا خود فیصلہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرے حصوں کے مشوروں کو مداخلت بیجا اور اپنی قومی آزادی کے منافی خیال کرتا ہے - اُسے محض اپنے حدود کے اندر بسنے والوں کے مفاد سے تعلق ہے اور اِس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ اس کے افعال و حرکات کا دوسرے حصوں کے اغراض پر کیا اثر پڑتا ہے بقول مسٹر ولز کے "جن خیالات کے مطابق آجکل معاشی مسلک کی تشکیل ہو رہی ہے ' اُن میں سے کچھہ تو قرون وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں ' کچھہ قدیم روما کی شاہنشاہی کے زمانے سے چلے آرہے ہیں اور کچھہ تاریخ کا آغاز ہونے کے قبل کے ہیں - لیکن ایسے خیالات جو دنیا کے واقعی حالات پر مبنی ہوں ' ہمیں کہیں بھی عمل ہوتا نظر نہیں آتا - کوئی با اقتدار ادارہ آج ایسا نہیں ہے جو دنیا کی تجارت کو ترقی دینے کی کوشش کر رہا ہو یا جسے یہ تحقیق کرنے کا اختیار ہو کہ آیا دنیا میں مناسب اشیا کثیر سے کثیر مقدار میں پیدا اور صرف ہو رہی ہیں - جو حکومتیں ہیں وہ محض جزئی ہیں اور اُن کی صرف یہ کوشش ہے کہ محض اپنی قوم والوں کے لئے کوئی موقع اچھی اشیاء کے استعمال کا نہیں بلکہ نفع کمانے کا حاصل کریں اور وہ بھی ایسا نفع جو اُن کے کوشش نہ کرنے کی صورت میں کسی اور ملک کے باشندوں کے حصے میں آتا - اِن حکومتوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ آیا انکا یہ طرز عمل بہ حیثیت مجموعی خود ان کی تجارت کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے

یا تخفیف ' یا یہ کہ اس کی بدولت خود ان کے باشندوں کی حقیقی راحت و خوشحالی میں بھی در اصل کوئی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں" ......مختصر یہ کہ قوموں کی باہمی بدگمانی اور ایک دوسرے کے حالات سے لا علمی ' اصول معاشیات پر عمل کرنے سے اُن کا صریح انکار ' یا اس بدیہی حقیقت کو تسلیم کرنے سے اُن کا گریز کہ کوئی قوم اپنے آپ کو تباہ کئے بغیر اپنے گاھکوں کو تباہ نہیں کرسکتی ' یہی امور مسٹر ولز کی رائے میں گذشتہ چار سال کے درد ناک واقعات کی آخری اور قطعی توجیہ ھیں ' قوموں کے اِس طرز عمل کو انگریزی زبان میں Economic Nationalism کے موزوں اور جامع الفاظ سے ظاھر کیا جاتا ھے - اُردو میں ہم اُسے ''معاشي قومیت'' کہہ سکتے ھیں - پس ھمارے اِس تمام استدلال کا خلاصہ یہ ھوا کہ دنیا کے موجودہ حالات تو ھمیں Economic Internationalism یا ''معاشي بین‌الاقوامیت'' کی تلقین کر رھے ھیں لیکن ھم اپنے قدیم قومی تعصبات ' نسلی امتیازات ' اور مذھبی اختلافات کے زیر اثر سختی کے ساتھہ ''معاشی قومیت'' پر جمے ہوئے ھیں اور یہی ھٹ دھرمی در اصل ھماری موجودہ پریشان حالي کا بنیادي سبب ھے -

(۲)

اب ھم مختصراً اس اجمال کی تفصیل کیطرف متوجہ ھونگے - یعنی اُن واقعات پر نظر ڈالینگے جو ''معاشي قومیت'' کے مظاھر ھیں اور موجودہ عالمگیر کساد بازاری کے فوری یا قریبی اسباب تصور کئے جاسکتے ھیں -

یوں تو دنیا کی موجودہ مشکلات کے جراثیم طریق سرمایہ داری کی گذشتہ تیرہ سو سالہ تاریخ میں پھیلے ھوئے ھیں ' تاھم ھمارے

اغراض کے لئے صرف سابقہ پندرہ سال کے واقعات پر نظر ڈالنا کافی ہے -
۱۴-۱۹۱۸ع کی عالمگیر جنگ سے ابھی ہم اسقدر قریب ہیں کہ اُس کے
پورے پورے نتائج کا احاطہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ' تاہم آثار
و قرائن بدیہی طور پر بتلا رہے ہیں کہ نوع انسان کی زندگی کا یہ
عظیم‌الشان واقعہ تاریخ عالم میں اسوجہ سے ہمیشہ یادگار رہیگا کہ اُسکی
بدولت انسانوں کے تخیلات میں ایسا زبردست ہیجان اور اُن کے
گوناگوں تعلقات میں ایسی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں کہ یہاں سے
دنیا کی تاریخ میں ایک بالکل ہی نئے باب کا آغاز ہوتا ہے - سر دست
ہمیں اِن تمام تخیلات اور تعلقات کی تبدیلیوں سے کوئی سروکار نہیں
ہے - ہم اس وقت جنگ عظیم کے صرف اُن معاشی نتائج پر نظر ڈالنا
چاہتے ہیں جو عالم کی موجودہ کساوبازاری پر براہ راست اثر انداز
ہوئے ہیں -

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ جنگ عظیم سے دنیا کو سخت
جانی اور مالی نقصان پہونچا لیکن اس مادی نقصان سے کہیں زیادہ
شدید وہ تباہی ہے جو قوموں کے باہمی تعلقات میں بدظنی اور
بے اعتمادی کے مستقل طور پر جاگزین ہوجانے سے واقع ہورہی ہے - یہ
بدگمانی دو امور میں خاص طور پر نمایاں ہے ؛ ایک فوجی قوت کے
سلسلے میں ' دوسرے تجارتی لین دین میں - اگرچہ فوجی پالیسی
کا دنیا کی معاشی خوشحالی پر بہت زیادہ اور براہ راست اثر پڑ رہا ہے '
تاہم یہاں ہمیں اُس سے بحث نہیں - ہماری بحث کا موضوع اسوقت
قوموں کا تجارتی لین دین ہے - جنگ سے پہلے دنیا کی عظیم‌الشان
تجارت خارجہ کا مدار زر اور اعتبار کے بہت ہی نازک اور انتہا درجے
مکمل انتظامات پر تھا - ان انتظامات کو انگریزی میں Gold

Standard System اور اُردو میں "طریق معیار طلاء" کہتے ہیں - دنیا کی موجودہ کساد بازاری کو سمجھنے کے لئے اس طریق کی نمایاں خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے -

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بہت سے اچھے خاصے ذہین اور عقلمند اشخاص نہ صرف ہندستان بلکہ ممالک یورپ میں بھی معیار طلاء کے نام ہی سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں اور اس کے طریق عمل کو سمجھنا ایک کار عظیم تصور کرتے ہیں - ممکن ہے یہ خیال ایک حد تک درست ہو لیکن جہانتک اس طریق کی بنیادی خصوصیت کا تعلق ہے ' وہ بہت سیدھی سادی اور بالکل آسان ہے - طریق معیار طلاء دراصل ایک ترکیب ہے جسکا خاص مقصد یہ ہے کہ مختلف ممالک کے قومی زروں کی اضافی قدر کو معین کردیا جائے - ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ہندوستان میں روپیہ رائج ہے اُسی طرح انگلستان میں پونڈ ' فرانس میں فرانک ' امریکہ میں ڈالر ' جاپان میں ین ' اور ہر ہر ملک میں ایک ایک جداگانہ زر مروج ہے - اب سوال یہ ہے کہ ان مختلف قومی زروں کی اضافی قدر کیا ہے ' بہ الفاظ دیگر ایک پونڈ کتنے فرانک ' کتنے ڈالر ' کتنے ین ' اور کتنے روپیوں کے مساوی ہے ' کیونکہ جب تک اس بات کا قطعی علم نہ ہو ان مختلف ممالک کے مابین جدید پیمانے پر تجارتی لین دین اگر ناممکن نہیں تو کم از کم بہت دقّت طلب ہوجائیگا - چنانچہ اسی دقّت کو رفع کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی گئی کہ ہر ملک اپنے قومی زر کو سونے کی ایک معینہ مقدار کا ہم قدر قرار دے اور اپنی عملداری کے اندر ایسا انتظام کردے کہ لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق مقرر کردہ شرح سے جس وقت چاہیں زر کے عوض سونا اور سونے کے عوض زر حاصل کرسکیں -

اب اگر ہر ایک زر سونے کی کسی معینہ مقدار سے ہر وقت بدل پذیر رہے تو ظاہر ہے کہ ان مختلف زروں کی قدریں نہ صرف ایک دوسرے کے مقابلے میں معین ہوجائینگی بلکہ اُن میں وقتاً فوقتاً بڑے بڑے تغیرات بھی واقع نہ ہونگے -

اب رہا یہ سوال کہ اس استقامت اور تعین کی ضرورت کیا ہے ؟ اس کا جواب بالکل بدیہی ہے - وہ یہ کہ تجارت بین الاقوام کے لئے مختلف قومی زروں کی باہمی قدر کا معین رہنا بڑے فائدے اور سہولت کی بات ہے ' کیونکہ ایسی حالت میں مختلف ممالک کے تاجر پورے اطمینان اور بھروسے کے ساتھ ایک دوسرے کے زروں کے عرض میں اشیاء کا لین دین کرتے ہیں - وہ قبل از قبل یہ جان لیتے ہیں کہ اُنھیں خود ملکی زر کے حساب سے مال تجارت کا کس قدر معاوضہ دینا یا لینا پڑے گا اور چونکہ اکثر و بیشتر تجارت کی بنیاد قرضے پر ہوتی ہے ' اس لئے اس بات کا قبل از قبل علم ہونا بے حد ضروری ہے - تجارت میں معمولاً یونہی بہت سے خطرات ہوتے ہیں ' اب اگر قوموں کے زروں کی باہمی قدریں بھی ہر وقت کم و بیش ہوتی رہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے تجارت میں ایک جدید اور خطرناک بے اطمینانی کا اضافہ ہوجاتا ہے -

مختصر یہ کہ اسی غیر معمولی سہولت کو پیش نظر رکھکر مختلف ممالک نے ' جو جنگ کے دوران میں بدرجۂ مجبوری معیارطلاء ' کو چھوڑ چکے تھے ' جنگ کے بعد دوبارہ اُس کو اختیار کرنے کی سخت کوشش کی اور موجودہ عالمگیر کساد بازاری شروع ہونے سے پیشتر اُن میں سے اکثر اس کوشش میں کامیاب بھی ہوچکے تھے - لیکن اس مرتبہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اب معیارطلاء میں وہ بات نہیں جو جنگ سے پہلے نظر آتی تھی - جس خوبی اور سہولت کے

ساتھ پہلے یہ معیار اپنا کام انجام دیتا تھا وہ اب اس میں باقی نہیں رہی - مختلف زروں کی باہمی قدر میں استقامت ' تو حسب سابق اُس کی بدولت پھر حاصل ہوگئی اور اگر یہ بھی حاصل نہ ہوتی تو پھر اُس کا فائدہ ہی کیا تھا ؟ لیکن مختلف ممالک کو اول تو دوبارہ معیارطلاء پر لوٹنے کے لئے اور دوسرے لوٹنے کے بعد اس پر قائم رہنے کے لئے جو جان توڑ کوشش اور متواتر جد و جہد کرنی پڑی ' ان کی بدولت اُنہیں سخت دقتوں بلکہ تباہ کن نتائج سے دو چار ہونا پڑا - تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ' البتہ یہ بدیہی ہے کہ سود کی شرحوں میں غیر معمولی اضافہ ' کاروبار کے لیے قرض دینے میں غیر معمولی رکاوٹ اور اشیاء کی قیمتوں میں جلد جلد تخفیف ' یہ ہیں وہ ثمرات جو گذشتہ چند سال سے معیار طلاء کے طفیل میں دنیا کو مل رہے ہیں - قدرتی طور پر سوال کیا جائے گا کہ کیوں ؟ آخر جنگ کے بعد وہ کونسی تبدیلی واقع ہوئی ہے جس نے معیارطلاء جیسے مفید انتظام کو قوموں کے حق میں اس قدر مضر بنا دیا ہے ؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ معیار طلاء کی مثال ایک کھیل کی سی ہے اور ہر کھیل کے کچھ قواعد و ضوابط ہوا کرتے ہیں - جب تک تمام کھلاڑی اپنے آپ کو ان قواعد کا پابند نہ کریں ' کھیل جاری نہیں رہ سکتا اور اگر پھر بھی اس کو جاری رکھنے کی کوشش کی جائیگی تو سوائے اس کے کہ طاقتور کھلاڑی کمزوروں کو پیٹیں ' اور کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا - یہی حال معیارطلاء کا ہے - جنگ کے بعد اکثر قوموں نے اُسے دوبارہ اختیار تو کرلیا لیکن بدقسمتی سے بعض نے اُس کے قواعد کی پابندی اپنے اوپر لازم نہ سمجھی ' نتیجہ یہ کہ اولاً اُنھوں نے دوسروں کو پریشان کیا اور بعد ازاں خود بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے - بات یہ ہے کہ معیارطلاء کو

کامیابی کے ساتھہ چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دنیا کو سونے کی جس قدر مقدار حاصل ہے اور ہوتی جارہی ہے وہ بڑی بڑی تجارتی قوموں میں کم و بیش ہر ایک کی ضروریات کے تناسب سے تقسیم ہوجائے - لیکن جنگ عظیم کے بعد سے کبھی بھی پورے طور پر اس شرط کی تکمیل نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ یہ اندیشہ لگا رہا کہ کہیں پورے طور پر اُس کی خلاف ورزی نہ ہوجائے - اولاً ریاستہائے متحدہ میں اور بعد ازاں فرانس میں دنیا کا سارا سونا کھنچ کھنچ کر جانے لگا اور یہ سلسلہ اب تک برابر جاری ہے - نتیجہ یہ کہ ان دو ملکوں میں تو سونے کے ذخائر اُن کی ضروریات سے کہیں زیادہ جمع ہوگئے ہیں اور بقیہ ممالک اپنے کاروبار کے لئے اس کی سخت قلت محسوس کر رہے ہیں -

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں ساری دنیا کا سونا کھنچ کھنچ کر امریکہ اور فرانس میں جمع ہوتا جارہا ہے اور کیوں دوسرے ممالک اپنی اپنی ضرورت کے لائق سونا حاصل کرنے سے معذور ہیں - امریکہ کی بابت تو اس سوال کا جواب ظاہر ہے - جنگ سے پیشتر ریاستہائے متحدہ کا شمار دنیا کے قرضدار ممالک میں تھا یہاں کے باشندوں نے اپنے ملک کے وسیع قدرتی وسائل کو کارآمد بنانے کی غرض سے برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے یورپی ممالک سے کثیر قرضے لے رکھے تھے اور اُن قرضوں پر وقتاً فوقتاً جو سود واجب الادا ہوتا تھا اُسے وہ زیادہ تر اشیائے خوراک اور خام پیداواروں کی بر آمد سے ادا کیا کرتے تھے - جنگ کے آغاز تک یہ سلسلہ برابر اسی طرح جاری تھا البتہ باہر سے جدید قرضے حاصل کرنے کی رفتار گھٹتی جارہی تھی - لیکن جنگ کے دوران میں یہ کیفیت بالکل بدلگئی - اول تو یورپی ممالک کے تمام تجارتی کاروبار یک لخت بند ہوگئے - دوسرے جنگ جاری رکھنے کے لئے ان ممالک کو

اور اِن میں بھی خاص کر اتحادیوں کو اشیائے خوراک اور گوناگوں ضروریات جنگ کی شدید اور روز افزوں ضرورت ہونے لگی - ریاستہائے متحدہ کو اپنی مالی حالت سدھارنے کا اِس سے بہتر کون موقع مل سکتا تھا ؟ اول تو اِس ملک نے نہایت احتیاط کے ساتھہ اپنے آپ کو یورپی جھگڑوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی اور ایک مدت تک کامیابی کے ساتھہ غیر جانبداری پر قائم رہا ' دوسرے اہل امریکہ نے نہایت مستعدی کے ساتھہ غیر ملکی اشخاص کا جس قدر سرمایہ امریکہ کے کاروبار میں لگا ہوا تھا ' اُسے خریدنا شروع کیا حتیٰ کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے تمام کاروبار کے خود مالک بنگئے ' تیسرے مصیبت زدہ اہل یورپ کے آڑے وقت سے فائدہ کمانے میں انھوں نے ذرا بھی تامل نہیں کیا - اشیائے خوراک اور ضروریات جنگ کثرت سے تیار کرکے وہ منھہ مانگی قیمتوں پر یورپ والوں کے ہاتھہ فروخت کرنے لگے اور اپنے خریداروں کو اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ قیمت ادا کرسکیں ' اعلیٰ اعلیٰ شرحوں سے کثیر رقمیں قرض دیں - ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب جنگ ختم ہوئی تو ریاستہائے متحدہ کی حیثیت بالکل بدلی ہوئی تھی - اب وہ قرضدار نہیں بلکہ دنیا کا بہت بڑا قرض خواہ ملک تھا - یورپی اقوام اور خاص کر برطانیہ عظمیٰ سے سود کی بابتہ سال بہ سال کثیر رقمیں اُس کو واجب الوصول ہونے لگیں - لہذا سوال یہ پیدا ہوا کہ اِن رقموں کی ادائی کی کیا سبیل نکالی جائے - بدیہی طور پر اِس کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ یورپ والے اپنا مال ریاستہائے متحدہ کو زیادہ روانہ کریں اور خود اُن سے جس قدر ہوسکے کم مال خریدیں - لیکن دو وجوہ سے اس کا امکان نہ تھا - ایک تو اختتام جنگ کے بعد اہل یورپ میں یہ سکت نہیں رہی تھی کہ وہ فوراً کثرت سے مال تیار کرکے امریکہ روانہ کریں ' اِس کے

برعکس وہ اپنی ضروریات کے لئے خود امریکہ کے محتاج تھے اور اِس وجہ سے جنگ کے بعد بھی امریکہ سے بہ کثرت مال خریدتے رہے - دوسرے یہ کہ ریاستہائے متحدہ نے خوب محصول لگا لگا کر خاص کر اُنھی اشیاء، کو اپنے ملک میں داخل ہونے سے روک دیا جن کے توسط سے اہل یورپ اپنے قرضے ادا کرسکتے تھے - نتیجہ یہ کہ یورپ والوں کو نہ صرف اپنے قرضوں پر سود ادا کرنا پڑتا تھا بلکہ زیادہ مال خریدنے اور کم مال فروخت کرنے کی وجہ سے بھی اُن پر مزید رقموں کی ادائی واجب ہوتی تھی - غرض اِس غیر متوازن صورت حال کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ریاستہائے متحدہ میں سونے کی کثیر مقدار اکٹھی ہوجائے - چنانچہ ۱۹۲۴ ع میں امریکہ کے سونے کی مقدار فرانس کو چھوڑ کر بقیہ تمام ممالک کے سونے کی مجموعی مقدار کے برابر تھی -

دوسرا بڑا ملک جہاں آج کل سونے کی مقدار ضرورت سے زیادہ جمع ہوگئی ہے ، وہ فرانس ہے ، لیکن یہاں اس صورت حال کے اسباب کسی قدر مختلف ہیں - ان کو سمجھنے کے لئے ہمیں چند باتیں خاص طور پر یاد رکھنی چاہئیں :— ایک یہ کہ فرانس جنگ کے پہلے ہی سے ایک بڑا قرض خواہ ملک ہے - دوسرے یہ کہ جنگی قرضوں کی بابت جو رقمیں اُسے ادا کرنا پڑیں اُن سے کہیں زیادہ رقوم تاوان جنگ کی صورت میں اُسے جرمنی سے وصول ہوئیں - تیسرے یہ کہ جنگ کے بعد فرانس کی صنعتوں میں تو بہت تیزی سے ترقی ہوئی لیکن صرف دولت اور اُجرتوں کی شرح میں اُسی مناسبت سے توسیع نہیں ہوئی - چوتھے یہ کہ فرانس بہت بڑی حد تک اپنی ضروریات کا آپ کفیل ہے ، یعنی برطانیہ اور جرمنی کے مقابلے میں تجارت درآمد و برآمد پر اُس کی زندگی کا کم مدار ہے - مزید برآں جنگ کے بعد فرانس نے اپنی تجارت برآمد کو خوب وسعت دی لیکن اپنے

قدیم تجارتی مسلک کے مطابق مال درآمد کو ملک میں داخل ہونے سے روکتا رہا - نتیجہ اِن تمام امور کا یہ ہوا کہ فرانسیسی سرمایہ داروں کے پاس کثیر رقمیں سونے کی شکل میں پس انداز ہونے لگیں -

اب جنگ کی بدولت اور ممالک کی طرح فرانس کے انتظامات زر بھی درہم برہم ہوگئے تھے اور جنگ کے بعد اُن کو ازسرنو درست کرنے سے قبل بعض اور اسباب کے زیر اثر فرانک کی قیمت اِس قدر گھٹ گئی کہ ہر شخص اُس سے احتذر کرنے لگا - خود فرانسیسی سرمایہ دار کثرت سے اپنا سرمایہ دوسرے ممالک اور خاص کر برطانیہ کو روانہ کرنے لگے جہاں پونڈ اِسٹرلنگ کی قیمت ایسے متواتر اور حیران کُن تغیرات سے محفوظ تھی - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ فرانسیسی سرمائے کی ایک کثیر مقدار قلیل المیعاد قرضوں کی شکل میں لندن کے بنکوں میں جمع ہوگئی - اب برطانیہ کے لئے یہ ایک طرح کی زبردستی غیبی امداد تھی کیونکہ امریکہ کو متواتر سونا روانہ کرنے سے انگلستان بنک کے ذخائر میں جو خطرناک کمی واقع ہو رہی تھی ' اُس کی تلافی ایک حد تک اس فرانسیسی سونے سے ہوگئی - دوسرے یہ کہ برطانیہ نے ان فرانسیسی رقوم کے بھروسے پر کچھہ تو اعلیٰ شرح سود کے لالچ میں اور کچھہ سیاسی وجوہ کی بناء پر کثیر رقمیں جرمنی کو قرض دیدیں اور بعد کے حالات کی روشنی میں ہم یہ محسوس کررہے ہیں کہ یہ برطانیہ کی بڑی غلطی تھی - کیونکہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ' فرانسیسی رقمیں صرف قلیل المیعاد امانتوں کی شکل میں برطانیہ کو روانہ کی گئی تھیں ' برطانیہ کے لئے یہ بات قرین عقل نہیں تھی کہ وہ ایسی رقموں کو لیکر خاص کر جرمنی جیسے ملک میں پھنسادے جسکی مالی حالت کسی طرح سے تشفی بخش نہیں تھی - ہمیں فی الحال ان اختلافی مباحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں -

واقعات کا جہاں تک تعلق ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ جیسے ہی فرانسیسی زر کے انتظامات درست ہوگئے اور فرانک کی قدر میں استقامت پیدا ہوگئی ' فرانسیسی سرمایہ دار بتدریج اپنی امانتیں لندن سے واپس منگوانے لگے جسکی وجہ سے سونا انگلستان بنک سے نکل نکل کر پیرس جانے لگا - برطانیہ کے مالی نظام کے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا - امریکہ کی جانب تو سونے کی روانگی کا سلسلہ بدستور جاری ہی تھا ' اب جو پیرس والوں کے مطالبات شروع ہوئے تو صورت حال روز بروز خطرناک ہونے لگی کیونکہ برطانیہ کے لئے یہ بات قطعی ناممکن تھی کہ وہ فرانس کی رقمیں ادا کرنے کے لئے اپنے قرضداروں اور خاص کر جرمنی سے اپنے قرضوں کی فوری واپسی کا مطالبہ کرے - اگر ایسا کیا جاتا تو جو عالمگیر مالی مرحلہ ۱۹۳۱ ع تک رکا رہا وہ فوراً شروع ہوجاتا اور جرمنی کی ساکھ اور اُس کے اعتبار کا تو یقیناً خاتمہ ہوجاتا -

واضح رہے کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں سیاسی مصلحتیں بھی پس پردہ بہت کچھ کار فرما رہیں - یورپی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے برطانیہ کی خارجی پالیسی کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ جرمنی کی معاشی حالت کو پورے طور پر تباہ نہ ہونے دیا جائے تاکہ ایک طرف تو وہاں اشتراکیت کی حمایت اور روسی تجربے کی تقلید کا خیال جڑ نہ پکڑنے پائے اور دوسری طرف فرانس کی قوت ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو سکے - برطانیہ کا بلا روک ٹوک جرمنی کو قرضے دینا اور فرانس کا اپنی قلیل المیعاد امانتوں کو اس قدر اصرار کے ساتھ واپس لینا در اصل انہی سیاسی احساسات کے مظاہر ہیں -

اس توضیح سے ناظرین کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کیوں جنگ کے بعد اور جنگ ہی کے نتیجے کے طور پر مختلف ممالک کے درمیان سونے کی تقسیم میں یہ حیرت انگیز سقم پیدا ہوگیا ہے - لیکن بات جو قابل توجہ ہے ' وہ یہ ہے کہ اس خرابی کا وبال فی نفسہ معیارطلاء کے طریقے پر ڈالنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری در اصل اُن ممالک پر عائد ہوتی ہے جو اس کھیل کے قواعد کی برابر پابندی نہیں کر رہے ہیں - اگر ریاستہائے متحدہ اور فرانس بنک کاری کے ناگزیر اصولوں پر عامل رہتے تو سونے کی یہ نا مناسب تقسیم اس قدر دیر پا ثابت نہ ہوتی ' بلکہ معیارطلاء کے اٹل اصولوں کے مطابق خود بخود اس کی اصلاح ہوجاتی - اس معیار پر عامل رہنے کا اقتضا یہ تھا کہ یہ ممالک سونے کے ذخیروں میں اضافہ ہوتا دیکھکر اپنے قومی زر کی مقدار بھی اُسی تناسب سے بڑھا دیتے - اسکا ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا کہ ان ملکوں میں اشیاء کی قیمتیں دوسرے ممالک کے مقابلے میں چڑھ جاتیں جسکی وجہ سے اُن کے مال کی برآمد گھٹ جاتی اور دوسرے ممالک کا مال اِن کے یہاں زیادہ مقدار میں در آمد ہونے لگتا اور اس روز افزوں درآمد کی قیمت ادا کرنے کے لئے سونا یہاں سے نکل نکل کر حسب ضرورت دوسرے ممالک میں تقسیم ہوجاتا اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا جبتک کہ اُن ممالک میں بھی قیمتیں اُسی سطح پر نہ اُتر آتیں جو دنیا کی قیمتوں کی عام سطح کہلاتی ہے - بدقسمتی سے نہ امریکہ نے اس اصول کی پابندی کی اور نہ فرانس نے بلکہ دونوں نے علی الاعلان اُس کی خلاف ورزی کی اور وہ اِس طور پر کہ جو سونا اُنھیں وصول ہوتا گیا اُسے قاعدے کے مطابق اپنے قومی زر کی بنیاد بنانے کے بجائے اپنے بنکوں میں یونہی بیکار ڈال رکھا - انگریزی اصطلاح میں انہوں نے اُسے Sterilize کر دیا یعنی اُسے اپنا فطرتی فرض انجام دینے سے باز رکھا - فرانس اور

امریکہ کی طرف سے الزام کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اگر ہم اِس قدر کثیر سونے کی مقدار کے تناسب سے اپنے زر کی مقدار میں اضافہ کر دیتے تو اسکی وجہ سے ہماری اندرونی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوکر ہماری صنعت و حرفت اور دوسرے کاروبار تباہ ہو جاتے اور ظاہر ہے کہ کسی ملک سے ایسے ایثار کی بجا طور پر توقع نہیں کیجاسکتی - تفصیل میں پڑے بغیر ہم اِسکے جواب میں صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا بعد کے واقعات ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ فرانس اور امریکہ نے سونے کو اسطرح بچا بچا کر در اصل کوئی فائدہ حاصل کیا ہے ؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ باوجود سونے کی تین چوتھائی مقدار اپنے پاس دبارکھنے کے یہ دونوں ملک بھی عالمگیر کساد بازاری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے ؟ اب رہا یہ سوال کہ آیا قواعد کی پابندی کی صورت میں اُنہیں اِس سے زیادہ نقصان پہنچتا یا کم ' اِسکا جواب نہ ممکن ہے اور نہ مفید - لہذا ہمیں اُسکی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرنیکی کوئی ضرورت نہیں - سونے کی تقسیم کی اس خرابی کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ امریکہ اور فرانس ضرورت مند ممالک کو اور قرضے عطا کریں تاکہ اسطرح پر سونا اُن کے یہاں سے نکل نکل کر دوسرے ممالک میں پہنچے اور اُس کی تقسیم درست ہونے سے پھر معیار طلاء کا عمل حسب سابق جاری ہوسکے - بلا شبہ اِس ترکیب سے امریکہ اور فرانس میں جو سونے کے انبار لگ گئے ہیں ' وہ دوسرے ممالک میں پھیل جائینگے اور اِس طور پر ممکن ہے کہ جو دقتیں معیار طلاء کے بگڑ جانے سے پیدا ہوگئی ہیں وہ رفع ہوجائیں - لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک محض عارضی علاج ہے - اِس سے مرض کی بیخکنی ہونے کے بجائے اس میں آئندہ اور شدت پیدا ہونے کا

قرینہ ہے - کیونکہ اول تو قرضوں کا وقتاً فوقتاً سود ادا کرنا ہوگا ' دوسرے کچھہ مدت بعد خود اصل کی واپسی بھی ضروری ہے - سوال یہ ہے کہ آخر یہ مطالبات کیسے ادا ہوں ؟ مال و اسباب لینے سے تو قرضخواہوں کو انکار ہے ' لہذا ضروری ہوا کہ سونا واپس کیا جائے - اس طرح ہم پھر اُسي نقطہ پر پہنچگئے جہاں سے آغاز کیا تھا - اگرچہ اس ترکیب سے مرض کا مستقل علاج نہیں ہوسکتا ' تاہم یہ صحیح ہے کہ اُسکی بدولت موجودہ تکلیف و مصیبت سے کچھہ آرام ضرور مل سکتا ہے مثلاً ۱۹۲۴ع کے بعد ایک مدت تک امریکہ میں سونے کي مقدار میں مزید اضافہ رکا رہا بلکہ اس میں کچھہ تخفیف ہی ہوگئی - اِس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُس زمانے میں امریکہ والے اپنا سرمایہ کثرت کے ساتھہ دوسرے ممالک اور خاصکر جرمني کو قرض دے رہے تھے - جرمنی اس سرمائے سے کچھہ تو اپنی شکستہ حالت درست کرنے اور کچھہ تاوان جنگ ادا کرنے میں مدد لے رہا تھا - لیکن جب ۱۹۲۹ع میں امریکہ والوں نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے ہی ملک میں سرمایہ لگاکر زیادہ منافعہ کما سکتے ہیں تو انہوں نے نہ صرف مزید قرضوں کا سلسلہ بند کر دیا بلکہ اپنے سابقہ قرضے بھی واپس لینے لگے - اور چونکہ مال و اسباب کی شکل میں قرضہ واپس نہ لینے کی اُنہوں نے گویا قسم کھا رکھی تھی اسلئے یورپ اور ساری دنیا کا سونا نہایت سرعت کے ساتھہ پھر امریکہ میں جمع ہونے لگا - جہاں تک فرانسیسی سرمایہ داروں کا تعلق ہے ' انہیں بیروني ممالک اور خاص کر روس میں قرض دیکر کچھہ ایسے تلخ تجربے ہوئے ہیں کہ اب وہ اس طور پر اپنے سرمائے سے کام لینے میں بہت تامل کرتے ہیں - روسی انقلاب میں فرانس کے سرمایہ داروں کی کثیر رقمیں ڈوب گئیں - اُس کے بعد سے وہ ایسے خوفزدہ ہوگئے ہیں کہ اپنا سرمایہ باہر بھیجنا بہت کم کردیا ہے اور جو کچھہ روانہ کرتے بھی

هیں تو وہ قلیل المعیاد قرضوں کی شکل میں یا بیرونی ممالک کے بنکوں میں امانتوں کے طور پر تاکہ جیسے ہی انہیں کوئی خطرہ محسوس ہو ' وہ اپنی رقمیں واپس منگواسکیں - مختصر یہ کہ موجودہ معاشی بدنظمی کی ایک بڑی وجہ یہ ھے کہ دنیا کے دو بڑے قرضخواہ ملک فرانس اور ریاستہائے متحدہ نہ تو مال و اسباب کی شکل میں اپنے قرضے واپس لینا چاہتے ہیں اور نہ سر دست قرضدار ممالک کو وصول طلب رقمیں کچھہ اور مدت کے لیے قرض دینے پر آمادہ ھیں - نتیجہ یہ ھے کہ سونے کی کثیر مقدار صرف ان دو ملکوں میں بیکار پڑی ہوئی ھے اور بقیہ ممالک میں سونے کی سخت قلت محسوس ہو رہی ھے - اس قلت کی وجہ سے ان ممالک کو معیارطلاء کے اصولوں کے مطابق زر کی مقدار گھٹانی پڑی ' شرح سود میں اضافہ کرنا پڑا اور کاروبار کے لیے قرضے دینے میں غیر معمولی طور پر ہاتھہ روکنا پڑا ' ان انتظامات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عام اشیاء کی قیمتوں میں تخفیف ہو - چنانچہ یہ تخفیف شروع ہوئی اور ۱۹۲۹ع کے بعد سے وہ اس قدر شدید اور عالمگیر ہوگئی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کساد بازاری کی کہیں نظیر نہیں ملتی -

(۳)

ہم اس مضمون کے پہلے حصے میں یہ معلوم کر چکے ہیں کہ ہماری موجودہ مشکلات کا بنیادی سبب ہمارا وہ طرز عمل ھے جسے "معاشی قومیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے - کیونکہ اس طرز عمل نے جنگ کے بعد معیار طلاء کے سارے انتظام کو درہم برہم کر دیا ' اس کی بھی مختصر کیفیت ہم اوپر معلوم کر آئے ہیں اب ہم اسی طرز عمل کی دو اور مثالیں پیش کریں گے جنہیں موجودہ کساد بازاری

سے بہت گہرا تعلق ہے - ان میں سے پہلی مثال تاوان جنگ کی ہے اور دوسری قوموں کے تجارتی مسلک کی -

تاوان جنگ کے متعلق یہ سوال کہ وہ فی نفسہ کہاں تک حق بجانب ہے ، در اصل ایک بے سود سوال ہے - آپ قیامت تک اس مسئلے پر بحث کرتے رہئے لیکن اس پر فریقین میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا - اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہم صرف واقعات سے اپنا سروکار رکھیں اور یہ دیکھیں کہ یہ واقعات کس حد تک موجودہ صورت حال کے پیدا کرنے میں معاون ہوئے ہیں - واقعات یہ ہیں کہ جن قوموں نے گذشتہ جنگ میں فتح حاصل کی اُنھی کو اور اُن میں بھی خاصکر فرانس اور باجیم کو دوران جنگ میں سب سے زیادہ مالی نقصان پہنچا - اُن کے بیسیوں شہر تباہ ہوگئے : عمدہ عمدہ عمارتیں جل کر خاکستر ہو گئیں ، کارخانے اُجڑ گئے ، کاروبار برباد ہوگئے ، سیکڑوں میل کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں جل کر سیاہ ہوگئیں ، لاکھوں ایکڑ زمین ناقابل کاشت بن گئی ، اور ہزاروں پُر امن زندگی بسر کرنے والے اور گاڑھے پسینے سے روٹی کمانے والے دیہاتی بے خانماں ہوگئے - مزید براں قوم کے لاکھوں نوجوان ہلاک ہوئے اور جو بچ رہے ان میں سے اکثر و بیشتر اپاہج اور آئندہ روٹی کمانے سے معذور ہوگئے - جس قوم کو فتح حاصل کرنے میں ایسے کثیر جانی اور مالی نقصانات اتھانے پڑیں ، مفتوح دشمن کے خلاف اس کے غیظ و غضب کی بھلا کیا حد و انتہا ہو سکتی ہے - نتیجہ یہ کہ جب جرمنی اور دوسری شکست خوردہ قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے فتح مند لیکن تباہ حال متحدین کی کونسل بیٹھی تو ان میں سے ہر ایک رکن اس بات پر تلا ہوا تھا کہ نہ صرف اپنے اپنے نقصانات کی پوری پوری تلافی کرے بلکہ جرمنی کو اس عظیم‌الشان

قتل و غارت کا تنہا مجرم قرار دیکر اُس کی بھی خاطر خواہ سزا دے - جہاں تک کہ جرم کی ذمہ داری کا تعلق ہے ' صرف جرمنی پر اُس کا بار ڈالنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی فٹ بال کے مقابلے میں صرف اُس کھلاڑی کو مقابلے کا باعث قرار دینا جو سب سے پہلے گیند آگے بڑھاتا ہے - جس دنیا میں قوموں کے باہمی تنازعات کے فیصلے کا بجز جنگ کے کوئی اور ذریعہ نہ ہو ' جہاں جنگ و جدال اور قتل و غارت کو انسانی ترقی کا ناگزیر عامل بلکہ خود تہذیب و تمدن کا مظہر خیال کیا جاتا ہو ' وہاں کسی ایک قوم کو ایک بڑی عالمگیر جنگ کا تنہا ذمہ دار ٹھیرانا محض ایک طفلانہ حرکت ہے - لیکن یہ بحث ہمارے مضمون سے غیرمتعلق ہے - جو بات ہمارے لئے خاص طور پر قابل لحاظ ہے ' وہ یہ ہے کہ جب متحدین کے نمائندے جرمنی کو سزا دینے کے لئے بیٹھے تو وہ جنگ کے بھڑکائے ہوئے رنج اور غصہ کے جذبات سے بیحد مغلوب اور واقعات کو اُن کی اصلی حالت میں دیکھنے سے بالکل معذور تھے - فرانس اور بلجیم کے اغراض اس مسئلے سے خاص طور پر وابستہ تھے کیونکہ انسانی جماعتوں کی اس بینظیر کشتی کے لئے انہی قوموں کی سر زمین کو دنگل بنایا گیا تھا اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ مالی نقصان اُنھیں کو برداشت کرنا پڑا تھا - لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ اُن کے نقصانات کی تلافی نہ کیجائے چنانچہ فرانس اور بلجیم نے اپنے مطالبات پیش کئے اور ان کی انتہائی مقداریں تجویز کیں - برطانیہ عظمی نے اپنے کثیر بحری نقصانات کو مدنظر رکھکر جرمنی کے تمام تجارتی جہاز ضبط کر لئے اور جنگی وظائف کا ایک علیحدہ مطالبہ پیش کیا - ریاست ہائے متحدہ نے بیشک نرمی کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی لیکن چونکہ وہ خود جنگی قرضوں کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت پر آمادہ نہیں تھا لہذا اس کی نصیحت کا نہ کوئی اثر ہوسکتا تھا اور نہ ہوا - نتیجہ یہ

کہ ان تمام نقصانات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار کی گئی اور جرمنی سے یہ مطالعہ کیا گیا کہ وہ (۱۳۲) ملیارڈ طلائی مارک جو (۶۶۰۰) ملین پونڈ کے مساوی ہوتے تھے متحدین کو بطور تاوان ادا کرے - نفرت و حقارت کے جذبات سے متاثر ہوکر فاتحین نے تاوان کی یہ مضحکہ خیز مقدار تو مقرر کردی لیکن ایک لمحے کے لئے یہ نہ سوچا کہ آخر یہ کثیر رقم ادا ہو تو کیسے ہو - کیونکہ اگر جرمنی یہ ساری رقم سونے کی شکل میں ادا کرنے کی کوشش کرتا تو دنیا میں سونے کی جو کل مقدار موجود ہے ' اُس کی کم از کم سہ‌گنی مقدار اس غرض کے لئے درکار ہوتی اور اگر یہ خیال تھا کہ جرمنی سے اس رقم کے ہم مقدار مال و اسباب وصول کیا جائے ' تب بھی یہ ایک لاحاصل کوشش تھی کیونکہ ایک ایسے ملک سے جس کے سارے باشندے قحط کی مصیبتوں میں مبتلا ہوں ' جس کی نو آبادیات چھین لی گئی ہوں ' جس کے جہازات ضبط کر لئے گئے ہوں ' اور جو اپنے معدنیات اور دولت کے سر چشموں سے محروم کر دیا گیا ہو ' یہ کیونکر توقع کیجاسکتی تھی کہ وہ اس قدر کثیر مقدار میں مال و اسباب تیار کرے - مختصر یہ کہ سونے کی شکل میں تو اس تاوان کا ادا ہونا صریحاً محال تھا اور اگر بالفرض یہ‌وقت تمام مال و اسباب کی شکل میں اُس کا امکان تھا بھی تو وہ یہاں خارج از بحث ہے ' کیونکہ یہ متحدین کا منشا ھی نہ تھا - انگلستان کے مشہور ماہر معاشیات ' پروفیسر کینز نے اپنی معرکتہ‌آلار کتاب " صلح و رسائی کے معاشی نتائج " میں نہایت خوبی اور تحقیق کے ساتھ اِن مسائل پر روشنی ڈالی ھے اور انہوں نے نیز دوسرے ماہرین نے حکومت وقت کو اس حماقت کی طرف متوجہ بھی کیا - لیکن جہاں جذبات بھڑکے ہوئے ہوں ' وہاں بھلا غریب پروفیسروں کی باتوں پر کون دھیان کرتا ؟ یہ کہکر کہ ان بچے پڑھانے والوں کو عملی سیاسیات کے

پر پیچ اور بلند مسائل سے کیا واسطہ انگلستان اور اس کے حلیف اپنے اِن عجیب و غریب مطالبات پر برابر اڑے رہے اور اپنے اصرار سے یورپ بلکہ ساری دنیا کے سیاسیات میں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے رہے -

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے ماہرین سیاست کے اِس تدبر کا دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے پیدا کرنے یا کم از کم اُسے اور زیادہ سخت بنانے میں کیا حصہ ہے - اِس غرض کے لئے ہمیں اولاً تاوان جنگ کی بعض خصوصیات پر نظر ڈالنا چاہئے - تاوان کی سب سے نمایاں خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ ادا کرنے والے ملک کے حق میں محض ایک بار ہی بار ہے - قومیں یوں تو ہمیشہ ایک دوسرے کی قرضدار رہتی ہیں لیکن تاوان جنگ ایک ایسا قرضہ ہے جو کسی پیدا آور کاروبار کے لئے نہیں لیا گیا ، بلکہ جو کسی سابقہ نقصان کی تلافی کے لئے ادا کیا جاتا ہے - جو قرضے کاروبار میں لگائے جاتے ہیں' وہ اپنی ادائیگی کی آپ سبیل نکال لیتے ہیں اور اس وجہ سے لینے والے اور دینے والے دونوں کے حق میں مفید ہیں - تاوان جنگ کی یہ نوعیت نہیں ہے - لینے والے کے حق میں تو وہ محض ایک سابقہ نقصان کا معاوضہ ہے لیکن دینے والے کے حق میں وہ سراسر ایک بوجھ ہے - اُسکو ادا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ باشندوں پر روز افزوں ٹیکس لگائے جائیں جس کی بدولت اُن کا معیار زندگی پست ہوتا جاتا ہے اور مختلف اشیاء خریدنے کی قوت سلب ہوتی جاتی ہے ، اور جیسے جیسے یہ قوت سلب ہوتی ہے اُسی مناسبت سے تجارتی چہل پہل میں کمی ہوتی جاتی ہے ، مال فروخت نہیں ہوتا اور کاروبار سرد پڑ جاتے ہیں - یوں تو ہر حکومت اپنی رعایا سے ٹیکس وصول کرتی ہے لیکن ان محاصل کا ایسا برا اثر نہیں پڑتا کیونکہ اگر ایک طرف ادا کرنے والوں کی جیبیں خالی ہوتی ہیں تو دوسری طرف تحفظ جان و مال ، تعلیم و حفظان

صحت اور دوسری گوناگوں خدمات کی شکل میں اُنہیں معاوضہ بھی مل جاتا ہے - تاوانی محاصل کا بدیہی طور پر یہ اثر نہیں ہو سکتا - تاوان ایک غیر پیدا آور قرضہ تو ہے ہی لیکن ساتھہ ہی وہ ایک خارجی قرضہ بھی ہے ' یعنی اس کے پانے والے خود باشندگان ملک نہیں ہیں بلکہ ایک غیر حکومت ہے اور یہ خصوصیت بجائے خود ادا کرنے والی حکومت کے لئے کئی طرح سے ضرر رساں ہے - ایک یہ کہ جب حکومت کے قرض خواہ خود ملک ہی کے باشندے ہوتے ہیں جیسے کہ جنگی تمسکات کی صورت میں تو حکومت پر اگر ایک طرف قرضے کے ادا کرنے کا بار پڑتا ہے تو دوسری طرف اسے مزید آمدنی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی حاصل ہو جاتا ہے - تاوان میں یہ بات نہیں - دوسری دقّت یہ ہے کہ ادا کرنے والی حکومت کو نہ صرف اپنی رعایا پر ٹیکس لگاکر رقم مہیا کرنی پڑتی ہے بلکہ وہ اِس رقم کو دوسرے ملک کے زر میں بدلنے کی بھی ذمہ دار ہے - جرمنی کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے زر یعنی مارک کی شکل میں ایک معینہ رقم مہیا کردے بلکہ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ خاص خاص شرحوں کے حساب سے حسب ضرورت ' فرانک ' پونڈ ' اور دوسرے زر حاصل کرے یا اُن کے ہم مقدار سونا فراہم کرے اور یہ کوئی آسان کام نہیں - خارجی قرضے کی تیسری دقّت یہ ہے کہ گرتی ہوئی قیمتوں کے زمانے میں اُس کا بار اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے چنانچہ اِس بناء پر بھی جرمنی کے بار میں گذشتہ چند سال کے اندر غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے - تاوان جنگ کی چوتھی اور آخری خصوصیت یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے ' ادا کرنے والے ملک میں اُس کی مخالفت بڑھتی جاتی ہے ' اُس کو خلاف انصاف تصور کیا جاتا ہے ' اور اُس کی بدولت سیاسی تعلقات میں پیچیدگیاں اور بین الاقوامی کار و بار میں ساکھہ اور اعتبار مفقود ہوجانے سے گوناگوں رکاوٹیں

پیدا ہوجاتي ہیں - جرمنی میں اڈولف ہٹلر کی ترقی کا راز بہت بڑي حد تک تاوان جنگ کے انھي ناگزیر نتائج میں مضمر ہے -

اگر فاتح ملکوں کے مدبرین واقعی تدبر سے کام لیتے تو اولاً وہ تاوان کی ایسی مضحکہ انگیز مقدار مقرر نہ کرتے ' دوسرے وہ اس بات پر اصرار نہ کرتے کہ اُن کے مطالبات نقد سونے کی شکل میں ادا ہوں فرانس اور بلجیم کو در حقیقت جو چیز مطلوب تھی وہ سونے کی غیر ضروری مقدار نہیں بلکہ اپنے تباہ شدہ علاقوں کی دوبارہ تعمیر تھی - ایسی حالت میں کیا یہ بات زیادہ قرین عقل نہ تھی کہ تاوان جنگ کا حساب مارک ' فرانک یا پونڈ میں کرنے کی بجائے جرمنی کو اس بات پر مجبور کیا جاتا کہ وہ متحدین کی نگرانی میں اپنے مزدوروں اور اپنے مال و اسباب سے تمام تباہ شدہ علاقوں کی تعمیر کر دے - جرمنی سے اس قسم کا تاوان فوراً وصول کیا جاسکتا تھا کیونکہ اُس کے پاس نہ مزدوروں کی کمی تھی اور نہ اشیائے تعمیر کی - قابل ستائش ہیں فرانس کے وہ مزدور جنھوں نے بے مثل فراخدلی اور متانت سے کام لیکر اپنے مشہور ادارے کے توسط سے حکومت پر پورا زور ڈالا کہ وہ تاوان وصول کرنے کا یہی قرین عقل طریقہ اختیار کرے - لیکن فرانس کے پیٹ بھرے سرمایہ دار یہ کیونکر گوارا کرسکتے تھے کہ دوسرون کي تباهي سے روپیہ کمانے کا یہ زرّیں موقع اُن کے ہاتھہ سے نکلجائے - جرمنی سے عام تنفر کی حالت کا اقتضاء هي یہ تھا کہ متانت اور معقولیت کو شکست اور تنگدلی اور بے عقلی کو فروغ ہو - مختصر یہ کہ کانفرنسیں ہوئیں ' کمیشن مقرر ہوئے ' کمیٹیاں بیٹھیں اور برخاست ہوئیں ' لیکن جرمني سے اُس کی حقیقی قابلیت سے زیادہ ایک پائی وصول نہ کیجاسکی - اولاً کچھہ مدت تک تو جرمنی کا تاوان جنگ دنیا کے دوسرے ممالک

کے باشندوں نے ادا کیا - مثلاً جرمن مارک کی قیمت گرتی دیکھکر خود ہمارے ملک میں ہزاروں اشخاص نے اپنا روپیہ جرمنی کے حوالہ کردیا یا یوں کہئے کہ جرمنی کے توسط سے اُس کے قرضخواہوں کی نذر کردیا - بعد ازاں جب جرمنی نے سابقہ زر کو منسوخ کرکے جدید زر معیارطلاء کے اُصول پر جاری کیا اور جرمن مارک میں استقامت پیدا ہوئی تو دوسرے ممالک اور خاصکر ریاستہائے متحدہ سے قرضہ لیکر تاوان کی ادائی ہوتی رہی - لیکن جب بعض اور وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر آئندہ آئیگا ' ریاستہائے متحدہ سے مزید قرضے حاصل کرنے کا امکان جاتا رہا تو حالت بگڑنی شروع ہوئی - کچھہ دنوں تک برطانیہ نے مدد دی لیکن جب خود برطانیہ کی مالی حالت کی طرف سے بے اطمینانی پھیلی تو اِس حیران کن سلسلے کے اور جاری رہنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ' حتیٰ کہ گذشتہ سال لوزان کانفرنس میں متحدین کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاوان سے دست بردار ہوجانا پڑا - نتیجہ وہی ہوا جو اس طرز عمل کی بدولت ہونا چاہئے تھا لیکن اس اثناء میں ایک طرف تو جرمنی میں سخت تباہی پھیلی ' اور اِسٹریزے مان اور برونگ جیسے مدبرین کی جگہہ گوئرنگ اور ہر ہٹلر جیسے اشخاص نے حاصل کی اور دوسری طرف معیارطلاء کابین الاقوامی انتظام جس پر ساری دنیا کی تجارت خارجہ کا مدار تھا ' ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا -

تاوان جنگ کے سلسلے میں خود متحدین کے باہمی جنگی قرضوں کا مختصر ذکر بھی ضروری ہے - صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف جرمنی ' آسٹریا ' ہنگری اور بلگیریا سے تاوان جنگ وصول ہوتا ہے اور جن ممالک کو یہ تاوان وصول طلب ہے وہ برطانیہ ' فرانس ' اٹلی ' جاپان ' بلجیم ' زیکو سلواکیا ' رومانیا ' یوگو سلاویا ' یونان ' پرتگال ' اور برطانوی نوآبادیات ہیں - دوسری طرف تاوان جنگ کے یہ تمام

امیدوار خود یا تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قرضدار ہیں یا برطانیہ عظمی کے یا اکثر و بیشتر صورتوں میں دونوں کے - اب اِن جنگی قرضوں کی بھی وہی نوعیت ہے جو تاوان جنگ کی ہے یعنی یہ قرضے پیدا آور اغراض کے لئے نہیں لئے گئے تھے ' بلکہ اِسی کرۂ ارض کے خاص خاص حصوں پر بسنے والوں کو ہلاک اور اُن کے املاک کو تباہ کرنے کے سامان فراہم کرنے کے لئے حاصل کئے گئے تھے - ظاہر ہے کہ تاوان کی رقوم کی طرح ان کا بار بھی براہ راست قرضدار ممالک کے مالیات پر پڑتا ہے - جنہیں بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ ایک طرف تو اپنے اپنے باشندوں پر خوب ٹیکس لگاکر اُن کی ادائی کی سبیل نکالیں اور دوسری طرف حتی الوسع اِس بات کی کوشش کریں کہ اپنا مال روز افزوں مقداروں میں دوسرے ممالک کے ہاتھہ فروخت کریں لیکن دوسرے ممالک کا مال حتی الوسع اپنے ملک میں نہ آنے دیں ' تاکہ اس طور پر جو ماحصل زائد سونے کی شکل میں حاصل ہو اُس سے اپنے قرضے ادا کر سکیں - لیکن جب ہر ملک بیچنا چاہے اور کوئی خریدنا نہ چاہے تو اس سے ماحصل زائد تو دستیاب نہ ہوگا ' البتہ مدبرین سیاست کے تدبر کا ایک دلچسپ منظر ضرور پیش نظر ہوجائیگا - تاوان جنگ کی دوسری خصوصیات بھی متحدین کے ان باہمی قرضوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں یعنی وہ اندرونی نہیں بلکہ خارجی قرضے ہیں اور اِسوجہ سے منتقلی رقوم کا عقدۂ لاینحل اور خارجی غیر پیدا آور قرضوں کی دوسری خرابیاں یہاں بھی نمایاں ہیں' تیسرے یہ کہ قیمتوں کی تخفیف کیوجہ سے ادا کرنےوالے ممالک کے حق میں یہ قرضے بھی بہت بڑا بار ہوگئے ہیں -

تاوان جنگ اور جنگی قرضوں کے متعلق ' ہمارے اِس تمام اِستدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ آجکل مہذب دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک کثیر غیر پیدا آور قرضوں میں مبتلا ہیں - اِن میں سے بعض صرف قرضدار ہیں'

بعض صرف قرضخواہ اور اکثر قرضدار بھی ہیں اور قرضخواہ بھی - چونکہ یہ
تمام قرضے صرف غیر پیداآور کاموں میں صرف ہوئے ہیں اسلئے ادا کرنے
والوں کے حق میں وہ بہت بڑا بار ہوگئے ہیں - خصوصاً جب سے تجارت
خارجہ والی اشیاء کی قیمتوں میں تخفیف ہوگئی ہے اُنکا بار بالکل ناقابل
برداشت ہو گیا ہے - تاوان جنگ اور جنگی قرضے ادا کرنے کی فکر میں
ہر مُلک یہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنا مال تو فروخت کرے لیکن دوسروں
کا مال نہ خریدے - نتیجہ یہ کہ کسیکا مال فروخت نہیں ہو رہا ہے - اگر
ہر ملک کے* اثاثے اور ذمہ داریوں کا حساب کیا جائے تو صرف دو ملک ایسے
باقی رہتے ہیں جنہیں بحیثیت مجموعی کثیر رقمیں واجب الوصول رہتی
ہیں : ایک ریاستہائے متحدہ دوسرے فرانس - نتیجہ یہ کہ جیسے ہی قرضے
ادا کرنے کی کوشش کیجاتي ہے دوسرے ممالک سے سونا نکل نکلکر اِن دو
ملکوں میں جمع ہونے لگتا ہے - اور اِسکی وجہ سے بین الاقوامي انتظامات زر
میں سخت پیچیدگی اور ناقابل حل مشکلات پیدا ہوجاتي ہیں اور جیسے
جیسے یہ پیچیدگیاں اور مشکلات بڑھتي جاتی ہیں' قرضدارں کي مالي
حالت اور تباہ ہوتي جاتی ہے اور وہ اپنے قرضے ادا کرنے کے اور ناقابل بنتے جاتے
ہیں - ان حالات میں اِصلاح کی بجز اِسکے اور کیا تدبیر ہوسکتی ہے کہ ان
تمام غیر پیدا آور قرضوں کا یک لخت خاتمہ کردیا جائے؛ عام ازیں کہ وہ
تاوان کی شکل میں ہوں یا جنگی قرضوں کی شکل میں؟ تاوان کی حد
تک تو یہ تدبیر بصد جبر و اکراہ اور بہ دقّت تمام اختیار کیجا چکی ہے -
رہے جنگي قرضے' تو اکثر ملکوں نے اُس کے ادا کرنے سے انکار کردیا ہے' جنمیں
سب سے نمایاں مثال فرانس کی ہے - برّطانیہ بھی اُن کے ادا کرنے پر آمادہ
نہیں ہے اور اِس بارے میں ریاستہائے متحدہ سے گفت و شنید جاری
ہے - حالات و قرائن صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ تاوان جنگ کی طرح یہ
جنگی قرضے بھي بہت جلد بین الاقوامی سیاسیات سے نا پید ہو جائینگے -

اردو کا پہلا رسالہ

از محمد اظہارالحسن - بی - اے ' ایل ' ایل بی (علیگ)

جنوری سنہ ۱۹۳۳ع کے " ہندستانی " میں میئے " اردو کا ایک قدیم رسالہ " کے عنوان سے " خیر خواہ ہند " کی ایک اشاعت کا ذکر کیا تھا اور ادارہ کی جانب سے بھی اس کے متعلق ایک تشریحی نوٹ " تتمہ " کے نام سے شایع ہوا تھا جو غالباً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا - میرے مضمون اور اس تتمہ میں بعض امور تشنۂ تحقیق تھے -

(۱) آیا " خیر خواہ ہند " اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ تھا یا اس سے قبل کوئی اور رسالہ بھی جاری ہو چکا تھا ؟

(۲) گارساں دتاسی نے اپنے تیسرے خطبے (دسمبر ۱۸۵۲ع) میں ماسٹر رام چندر کے متعلق لکھا تھا کہ " یہ پروفیسر دو رسالوں کا ایڈیٹر بھی ہے - ان میں سے ایک خاص طور سے ذکر کے قابل ہے جس کا نام " محب ہند " ہے - یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم ملکی معاملات پر دیسیوں کی تعلیمی حالت پر اور ہندستانی زبان کی ترقی پر مضامین ہوتے ہیں " - پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفي دہلوی کو بھی " محب ہند " کے سات شمارے (بابتہ ۱۸۴۹ ' ۱۸۵۰ع) دستیاب ہوئے ہیں اور موصوف کا خیال ہے کہ " یہ رسالہ جون ۱۸۴۷ع سے نکلنا شروع ہوا " - دتاسی نے " خیر خواہ ہند " کا ذکر نہیں کیا اور " محب ہند " کے علاوہ جو دوسرا رسالہ ماسٹر رام چندر نکالتے تھے اس کا بھی نام نہیں لیا - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرا رسالہ " خیر خواہ ہند " ہی تو نہیں تھا ؟

ان تمام امور پر ''مخزن'' مرحوم کي ایک اشاعت سے روشنی پڑتی ھے - مئی ۱۹۰۹ع کے پرچہ میں ایک صاحب انعام الحق حقی دھلوی بی اے نے ''خیر خواہ ھند'' کے اکتوبر ۱۸۴۷ع والے نمبر کا مضمون ''تربیت اھل ھند کے بیان میں'' اپنی تمہید کے ساتھ ''پرانی چاشنی'' کے عنوان سے شایع کرایا تھا - حسن اتفاق سے مجھے بھی ''خیر خواہ ھند'' کا یہی پرچہ دستیاب ھوا ' چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ع کے ''ھندستانی'' میں اسي کا ذکر کیا گیا تھا اور اسی مضمون کے اقتباسات دئے گئے تھے - بہر حال حقی صاحب اپني تمہید میں فرماتے ھیں -

''انیس سو ایک یا دو ٹھیک یاد نہیں مگر اسي زمانہ میں دلي میں ایک مجلد تھوڑي سی دیر کے لئے میرے ھاتھہ لگ گیا تھا - صرف یہي ایک مضمون نقل کر سکا مگر چونکہ اردو ناگری کا جھگڑا اس وقت در پیش تھا اس کا چھپوانا مناسب نہ معلوم ھوا اس وقت سے اب تک یونہي بلکہ مجھسے دور پڑا رھا - یہ مضمون دھلي کے رسالہ ''خیرخواہ ھند'' میں جو دھلی کیا سارے ھندوستان میں سب سے پہلا اُردو کا رسالہ تھا اکتوبر ۱۸۴۷ع میں شایع ھوا تھا - گویا آج سے باسٹھہ برس پہلے - میرا اس وقت کا علم یہ تھا کہ یہ مضمون مولوی محمد حسین آزاد کے والد کا ھے مگر اس وقت مطلق یاد نہیں کہ کس سے سنا تھا - شمس العلما خان بہادر مولوي ذکاء الله صاحب کي زباني یہ ھے اور ان کي رائے جو وہ ذاتی علم و یقین کی طرح بیان کرتے ھیں وثوق کے لایق ھے کہ ''خیر خواہ ھند'' پہلا رسالہ ھے جو اردو زبان میں پروفیسر رام چندر نے نکالا تھا - وھي اس مضمون کے مصنف تھے - ان کی عادت تھی کہ وہ خود کوئی مضمون اپنے قلم سے

نہیں لکھتے تھے مگر ان کے طلبا جو عربی کی اول جماعت کے تھے وہ جو کہتے جاتے اس کو لکھتے جاتے - اس رسالہ میں اکثر مضامین ان کے اس طرح کے لکھوائے ہوئے ہیں - یہ مضمون انہی کا ھے " - تو گویا اب یہ ثابت ھے کہ یہ مضمون پروفیسر رام چندر کا ھے جو دھلی کے ایک مشہور عالم سمجھے گئے ہیں اور ان کے کمالات کا دلچسپ نمونہ ھے " -

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ 'اردو کے جن قدیم ماہانہ رسایل کا علم اب تک حاصل ہو چکا ھے ان میں یہ نمبر قدیم ترین ھے ' - مولوی ذکاء اللہ کے اس بیان کے بعد اس رائے کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا - مولوی صاحب پروفیسر رام چندر کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور یقیناً اس مسئلہ پر ان کا بیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا ھے اور اب یہ امر طے سمجھنا چاھئے کہ اردو کا پہلا اخبار مولوی محمد باقر نے دھلی سے ۱۸۳۶ع میں نکالا اور اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ پروفیسر رام چندر نے مولوی محمد باقر کے مکان سے شایع کیا - اخبار کے لئے شمس العلما مولانا آزاد کی سند ھمارے پاس ھے اور رسالہ کے لئے شمس العلما مولانا ذکاءاللہ کی -

مضمون کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ھے "اول جلد اس رسالہ میں کچھہ حال طریقہ تربیت کا جو ھندوستان میں قدیم سے آج تک جاری ھے بیان کیا ھے اب ھم وہ طریقہ تربیت کا جو انگریزوں نے واسطے فائدۂ خلق ھند کے جاری کیا ھے بیان کرتے ہیں " - اس کے متعلق حقی صاحب ایک فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں -

" اس رسالہ کا پہلا نام " خیر خواہ ھند " تھا پھر اس کا نام بدل کر " محب ھند " رکھا گیا پہلی جلد اس رسالہ کی ماہ ستمبر ۱۸۴۷ع

کی تھی جس میں ' باعث کم شیوع ہونے علوم مفیدہ کا ہندستان میں ' کے عنوان سے ایک بسیط اور کار آمد مضمون ہے - یہاں اسی مضمون کا حوالہ ہے'' -

اس فٹ نوٹ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں - ایک تو یہ کہ پروفیسر رام چندر جلد کو اس معنی میں استعمال کرتے تھے جس میں آج کل نمبر یا شمارہ استعمال ہوتا ہے اور اس لئے یہ یقین کہا جاسکتا ہے کہ ''خیر خواہ ہند'' پہلے پہل ستمبر سنہ ۱۸۴۷ع میں نکلا یعنی اردو میں ماہانہ رسالہ اخبار سے گیارہ سال بعد جاری ہونا شروع ہوا - معلوم ہوتا ہے کہ حقی صاحب نے ستمبر ۱۸۴۷ع کی اشاعت بھی دیکھی تھی -

دوسرا یہ امر بھی طے ہو جاتا ہے کہ ''محب ہند'' ' ''خیرخواہ ہند'' کا بدلا ہوا نام تھا - اسی لئے غالباً دتاسی نے ''خیرخواہ ہند'' کا ذکر نہیں کیا - دتاسی نے ''محب ہند'' میں جس قسم کے مضامین کا شایع ہونا بیان کیا ہے اس قسم کے مضامین ''خیرخواہ ہند'' میں پائے جاتے ہیں - کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ پروفیسر رامچندر ایک ہی قسم کے دو رسالے جن کے نام بھی اتنے قریب‌المعنی ہوں کیوں نکالتے - اس لئے حقی صاحب کا بیان قابل قبول نظر آتا ہے اور گو انہوں نے تحریر نہیں فرمایا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ بھی بیان شمس‌العلما مولانا ذکاالله ہی کی اطلاع پر مبنی ہے جن سے مسلمہ طور پر اس موضوع پر ان کی گفتگو ہوئی تھی جس طرح میر تقی میر کی وجہ سے سوز نے اپنا تخلص بدل لیا تھا شاید اسی طرح مرزا پور والے ''خیرخواہ ہند'' کی وجہ سے پروفیسر رامچندر نے اپنے رسالہ کا نام بدل کر ''محب ہند'' کردیا جو قریب قریب ہم معنی ہے - پنڈت کیفی کے اس خیال میں کہ محب ہند جون ۱۸۴۷ع سے نکلنا شروع ہوا تھا خفیف سی غلطی ہوسکتی ہے - جون اور ستمبر میں صرف تین ہی مہینہ کا فرق ہے -

تبصرے

" ریاست "—مترجمۂ ڈاکٹر ذاکر حسین خان ایم - اے ' پی ایچ - ڈي
شیخ الجامعہ ' جامعیہ ملیہ اسلامیہ دھلی -
(از ڈاکٹر تارا چند ' ایم - اے ' ڈی - فل)

افلاطون ۴۲۷ ق - م میں پیدا ھوا اور اسّي (۸۰) سال کی عمر میں اس نے وفات پائی - وہ ابتداے شباب میں غالباً اپنے شہر کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے کي خواھش رکھتا تھا ' لیکن حالات نے موافقت نہ کی اور وہ ایتھنز کے سیاسی تگ ودو میں شریک نہ ھوسکا - میدان عمل میں اُسے کامیابی ھوتی یا نہ ھوتی اس کا فیصلہ دشوار ھے ' لیکن اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دنیاے تخیل میں اس کا نام آفتاب کی طرح درخشاں ھے اور ھمیشہ درخشاں رھے گا - یورپ کے فلسفے کی تاریخ اس کے عالمگیر اثر کی شاھد ھے - شاید ھی کوئی زمانہ ایسا گذرا ھو جب کہ افلاطون کے خیالات کی صحیح یا غلط تعبیر اُس دور کے تخیلی تعمیر و تشکیل کے بنیادی اصولوں میں کار فرما نہ رھی ھو - ارسطو تو افلاطون کا شاگرد ھی تھا لیکن روما کے سٹوک' اسکندریہ کا پلوٹائی‌نس ' زمانۂ متوسط کے فلسفی ' پندرھویں صدي میں فلارنس اور سترھویں میں کیمبرج کے حکما بھي اسی کے پیرو تھے -

جرمنی میں ھیگل اور انگلستان میں بریڈلے اور بوسن کیٹ اِسی کے مقلدوں میں سے ھیں - یہی نہیں بلکہ عیسائی الٰہیات اور عربي فلسفہ پر بھی اسی کی مہر لگی ھوئی ھے - آج یورپ میں ھر

فلسفی خواہ وہ افلاطون کا ہم مذہب ہے یا نہیں اس کا دم بھرتا ہے - ان میں سے ایک کا قول ہے کہ " افلاطون کی صحیح تعبیر ہي سچا فلسفہ ہے اور افلاطون کی غلط تعبیر جھوٹا فلسفہ " -

افلاطون کي تصانیف کا سلسلہ ۳۸۸ ق-م میں شروع ہوا اور مرتے دم تک جاری رہا - چالیس سال کے عرصہ میں اس نے بہت سی کتابیں لکھیں اور فلسفہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی - لیکن یہ بڑی غلط فہمی ہوگي اگر افلاطون کو ایک خشک فلسفی یا عالم بے عمل سمجھا جاے - وہ ایک ریفارمر تھا جس کے زخم رسیدہ اور درد مند دل میں انسانوں کو سنوارنے کی زبردست خواهش تھی - جب وہ پیدا ہوا تو اس کا وطن اپنے پرانے حریف سپارٹا سے جنگ میں مشغول تھا اور اس کی جوانی اسي جنگ کی ہیبت ناک فضا میں کٹی - اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے وطن کی ذلت دیکھی - ایتھنز کو پس پا ہوتے دیکھا اور برسوں کی بنی بنائی سلطنت کو اُجڑتے دیکھا - قوم کی حالت خراب ہو رہی تھی اس کے رہبروں کی ملکی تدابیر میں خود غرضی اور انانیت شامل تھی ' قومی مزاج میں سنجیدگی اور تحمل کم اور تلون بڑہ رہا تھا - دولت اور سلطنت نے انسانوں کو دنیوی کامیابی کا متوالا بنا دیا تھا ' پرانے رسم و رواج ٹوٹ رہے تھے ' مذہبی عقیدوں کی بنیادیں کمزور ہوگئي تھیں ' نیک و بد کی تمیز شخصي پسند کے ساتھہ وابستہ ہو رہی تھي - اخلاقی زندگی تو یوں ڈانواں ڈول تھی ' سیاسیات کی حالت یہ تھي کہ تیس برس کے عرصہ میں تین مرتبہ ریاست کا نقشہ بدلا - جنگ کی ابتداء کے وقت ایتھنز میں جمہوري ریاست تھی ' عنان حکومت عوام کے ہاتھوں میں تھی - ایتھنز کا ہر باشندہ خواہ امیر ہو یا غریب پڑھا لکھا ہو یا جاہل ' مجلس مقننہ کا ممبر اور عدالت کارکن تھا '

وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ کے لئے منتخب ہوسکتا تھا - جنگ کے بیسویں برس اس دولت عامہ کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگھہ چندسری حکومت قائم کردی گئی جو خود چند مہینوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکی - اس انقلاب کے سات برس بعد جنگ کے خاتمہ پر ایتھنز خانہ جنگی کا شکار ہوا ' حکومت کی باگ تیس آدمیوں کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی - انہوں نے ہر طرح کا تشدّد کیا اور جمہوریت کے طرفداروں کو سخت سزائیں دیں - لیکن سال دو سال سے زیادہ یہ بھی نہ چلی - اور آخرکار دو زبردست دھکے سہنے کے بعد جمہوریت کا نیا دور شروع ہوا - نئی ریاست کے کارناموں نے افلاطون کے دل و دماغ میں شدید تلاطم برپا کردیا - ان میں سے خاص طور پر جمہوری عدالت کے اُس غیر منصفانہ فیصلے نے جس کی وجہ سے افلاطون کے اُستاد سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا - ان کارناموں نے یہ ثابت کر دیا کہ جمہوریت عدل کی مترادف نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ جمہور سراسیمگی اور خوف سے مغلوب ہوکر سقراط جیسے دانشمند ' فرشتہ خصلت اور نیک سیرت انسان پر موت کا حکم صادر کردے -

اخلاقی اور سیاسی ہیجان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسانی ذہن انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اصولوں کی تحقیق کی جانب متوجہ ہو - افلاطون کی پیدائش سے پہلے یونانی حکماء میں سوفسطائیوں نے ان مسئلوں پر کچھہ غور کیا تھا - لیکن ان کے نظریوں کی کیفیت وہی ہے جو اس مسافر کے بیانات کی ہوتی ہے جو پہلی مرتبہ کسی ملک میں داخل ہوکر اس کے حالات کا مشاہدہ کرتا ہے - ان کا غیر مربوط فلسفہ انسان کے احساس کی کمزور بنیادوں پر قائم ہوا - اور انہوں نے نیک و بد کی تمیز اور حق و علم کا تعین حواس خمسہ کی شہادت پر ٹھرایا -

ان خیالات کی تہ میں جو فلسفہ پوشیدہ ہے اس کو سقراط اور اس کے شاگرد افلاطون نے انسان کے علمی اور عملی زندگی کے لئے سم قاتل سمجھا - یہ ظاہر ہے کہ جس فلسفہ کا انحصار محسوسات پر ہو وہ تلون اور تعیش کو زندگی کا مطمح نظر، نیکی کو حواس کی سیری اور علم و حق کی تلاش کو سعی لا حاصل قرار دیگا - یہ فلسفہ نہ صرف خود انسان کو زندگی کی اندھیری رات میں بلا شمع ہدایت کے اِدھر اُدھر بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے بلکہ قومی زندگی کو انانیت اور خود غرضی کے سپرد کر دیتا ہے - قوم اور فرد دونوں کی بہتری کے لحاظ سے اس کی تردید امر ضروری ہے - افلاطون کی زندگی کا اصلی مقصد یہی تھا کہ سوفسطائیت کا مقابلہ کرے اور عمل کی راہ میں جو رکاوٹیں انسانی کوتاہ نظری کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں انہیں دور کرے -

گو افلاطون کی وفات کو قریب ۲۲۰۰ برس گذر گئے لیکن اس کے فلسفیانہ اصول بیسویں صدی کے لئے اتنے ہی کارآمد اور مفید ہیں، جتنے کہ وہ ۲۲ صدی پہلے تھے - آج بھی دنیا میں سوفسطائیت کی ذہنی قوتیں انسان کی زندگی کو راہ مستقیم سے دور ہٹانے میں سر گرم اور کوشاں ہیں - اسی لئے آج تہذیب اور تمدن کا مستقبل ڈگمگاتا نظر آتا ہے - دنیا کے ہر براعظم میں آدمیوں اور گروہوں کے سامنے وہی پرانے سوال زیادہ مہیب صورت اختیار کئے کھڑے ہیں اور جواب کے طالب ہیں - ایسی حالت میں اگر کوئی چیز واقعی دنیا کو خطرناک مستقبل سے بچاکر محفوظ اور پر امن راستے پر چلا سکتی ہے تو وہ انسانی زندگی کے اصلی اور اٹل اصولوں کا راسخ اور پختہ علم اور ان پر عمل ہے - افلاطون کے فلسفہ کا مطالعہ یقینی اُن اصولوں کی طرف ہماری توجہ کو مائل کرتا ہے -

افلاطوں کے فلسفے کی تہ میں جو اصول کار فرما ہے وہ اس کا مشہور نظریۂ تخیلی یا مثالی ہے - اِس نظرئے کا خلاصہ یہ ہے کہ اضافی علم کے اس عالم ظہور کے پس پشت ایک حقیقی عالم ہے جو تعقل کا محمول ہے - اول الذکر عالم جسمانی ، حسّی ، متغیر ، کثیر ، ظلی اور حادث ہے - دوسرا عالم ، غیر مادی ، عقلی ، غیر متغیر ، مجرد ، حقیقی اور اصلی ہے - اول الذکر کا دوسرے سے تعلق وہ ہے جو اصل کو سائے سے ہے - عالم طبیعی ، اس تخیلی یا مثالی عالم کی نقل ہے - لیکن یہ عالم مظاہر ، عالم مثال کی بنیاد پر قائم ہے - عالم مثال انجام اور مقصود کی حیثیت رکھتا ہے اور عالم فطرت کی علت غائی ہے - عالم مثال علم مطلق کا موضوع ہے اس وجہ سے کہ علم اضافی کا تعلق محسوسات سے ہے اور علم مطلق کا تخیل سے - عالم مثال میں ہی عالم مظاہر کی تکمیل ہوتی ہے - تمام قدرتی مناظر اس تخیلی یا مثالی عالم سے اپنا جوہر اور اپنی قوت حاصل کرتے ہیں - فطرت کی ہر شے ترقی پذیر ہے اس ترقی کا رجحان ایک منزل مقصود یا کمال کی جانب ہے - دوسرے لفظوں میں یہ کمال خیر محض ہے - اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیر محض ، ہر شے کی نشو و نما میں پوشیدہ اور ساری ہے اور ہر شے کی علت و تشریح ہے - فطرتی اشیاء کا علم اُن کی تخیل پر منحصر ہے ، تخیل کسی شے کا کمال یا خیر اضافی ہے - خیر محض تمام اضافی خیروں کا مرکز واحد اور مجموعہ ہے - اس طرح خیر محض علم کا بنیادی اصول اور خیالات کا ربط ہے اس لئے اشیاء کی تشریح پر منحصر ہے -

انسانی زندگی انہیں دونوں عالم پر مشتمل ہے - دنیائے ظاہر اور دنیائے حقیقت ، دنیائے حواس ، اور دنیائے تعقل ، خواہش اور علم - فطرت انسانی کے بھی اسی طرح دو پہلو ہیں - عقلی و غیر عقلی

انسان کے غیر عقلی پہلو کے پھر دو حصے ہیں ' ارادہ اور اشتہا - اس طرح انسان کی روح کے تین حصے ٹھیرتے ہیں استدلال ' ارادہ اور اشتہا -

چونکہ تمام چیزیں خیر اور کمال کیطرف حرکت میں ہیں جو اُن کا پنہاں مفہوم و مقصود ہے اس لئے انسان بھی اُسی طرف گرم عناں ہے - کمال تک رسائی نوع انسانی کا انجام و منتہیٰ ہے اور اس کا کمال اس کی روح کی خوبی - چنانچہ استدلال کی خوبی عقلمندی ' ارادے کی جرائت اور اشتہا کی اعتدال ہے - اس لئے انسانی کمال کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عقلمندی ' جرائت و اعتدال یا انضباط نفس کا حامل ہو ' اس طرح روح کے ہر سہ حصوں میں ہم آھنگی یعنی عدل پیدا ہو جو نیکی کا بلند تریں مقام ہے -

لیکن انسان تنہا اور مجرد فرد نہیں ہے ' اس کی زندگی کا مدار جماعت پر ہے - واقعہ یہ ہے کہ فرد ایک شے واحد ہے اور انفرادیت اور اجتماعیت در اصل اُسی ایک حقیقت کے دو لازم و ملزوم پہلو ہیں - لہذا انسان کی تکمیل بغیر جماعت کے وجود کے ناقابل تصوّر ہے کیونکہ افلاطون کے الفاظ میں " جماعت ' فردیت کی ایک وسیع شکل ہے " - خیر محض کی طرف ترقی کا اصول جو ایک انسان پر صادق آتا ہے وہ اس کے انفرادی اور جماعتی دونوں حیثیتوں پر صادق آتا ہے -

افلاطون کی کتاب ریپبلک جس کا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کیا ہے وہ انسان کے دونوں پہلوؤں سے بحث کرتی ہے - لیکن ریپبلک جماعتی علم یا عمرانیات پر ایک عام بحث نہیں ہے - یہ در اصل فلسفے کی ایسی ایک اعلیٰ تریں کتاب ہے جیسی اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی جاسکی ہے - اخلاقیات ' نفسیات ' مابعدالطبعیات ' طبعیات ' تعلیمات ' حسن کاری ' مذھبیات ' سیاسیات غرضکہ سبھی کچھہ اس میں

موجود ھے - اس کا موضوع مصنف کے الفاظ میں یہ ھے کہ " اس امر کو تسلیم کرکے کہ سب سے اچھا اور سب سے برا آدمی کون ھے ' ھم اس امر کو سمجھیں کہ آیا سب سے اچھا آدمی سب سے زیادہ مسرور اور سب سے زیادہ برا آدمی سب سے زیادہ محزوں ھے یا نہیں " -

ریپبلک میں جو بنیادی بحث اٹھائی گئی ھے وہ نظام حکومت سے متعلق نہیں بلکہ راستبازی سے متعلق ھے - انسان کی روح کی منزل مقصود دوامی امن و طمانینت ھے ' سوال یہ ھے کہ وہ کیونکر حاصل ھو - افلاطوں کا جواب یہ ھے کہ کوئی آدمی تنہا زندگی بسر نہیں کرتا ' اور اس لئے وہ جب تک اپنی پوری جماعت کے لئے نجات نہ حاصل کرے اپنے لئے تنہا نجات نہیں حاصل کر سکتا - یہ سوال اس کتاب کے تمہیدی جملوں میں اُتھایا گیا ھے اور اس کا خاتمہ موزوں طور پر تشریح انصاف کے تصور پر ھوتا ھے -

ریپبلک جو دس دفتروں پر مشتمل ھے پانچ حصوں میں منقسم ھے - پہلے حصے میں جس میں دفتر اول اور کچھہ دفتر دوم کا جزو ھے اصل موضوع کا تعارف کرایا گیا ھے اور دکھایا گیا ھے کہ اخلاق ' انسان کی باطنی زندگی ھے - دوسرے حصے میں جو دوسرے تیسرے اور چوتھے دفتروں پر مشتمل ھے ' جماعت کے اعلیٰ تریں نظام کا بیان ھے اور دکھایا گیا ھے کہ جماعت کا خارجی نظام ' فرد کے باطنی زندگی کا عکس اور ظل ھے - دوسرے لفظوں میں جماعت کا مفہوم ایک ایسے گروہ (اجتماع) سے ھے جس میں انسان کی فطرت کا ھر عنصر اپنے نمود و اظہار کے لئے مناسب جگہہ حاصل کر سکے - تیسرے حصے میں جو پانچویں ' چھٹے ' ساتویں آتھویں دفتر پر مشتمل ھے ' جماعت کے معیاری نظام حاصل کرنے کے لئے وسائل اور ذرایع سے بحث کی گئی ھے اور یہ دکھایا گیا ھے کہ

جماعت کی تکمیل کا انحصار ' حصول علم پر ہے ' اور اس لئے اس کا انحصار حکماء کي حکومت پر ہے - چوتھے حصے میں آٹھویں اور نویں دفتر شامل ھیں اس میں اعلیٰ تریں جماعت کا مصرف بیان کیا گیا ھے اور اُن منازل کي تشریح کی گئی ھے جن سے فرد اور جماعت برائی کیطرف مائل ھونے لگتی ھے - پانچویں حصے میں جو دسواں دفتر ھے ' حسن کاري ' شاعري اور مرنے کے بعد روح کے انجام سے بحث کی گئی ھے -

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں یقیناً تحسین وستائش کے مستحق ھیں کہ انہوں نے ایسی عظیم‌الشان کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا اور خصوصاً ایسے موقع پر - کیونکہ آج کل هندستان بیحد مبتلائے آلام ھے ؛ اس نے مسرت کا حقیقی مفہوم کھو دیا ھے ؛ اس کے فرزند آج کل مصنوعی اور سطحی قسم کی مسرت و کامیابي کی تلاش میں دیوانے ھو رھے ھیں - اس لئے قدرتی طور پر حقیقی مسرت سے وہ محروم ھیں - اس کے علاوہ ہم لوگوں نے اپنے سامنے یہ اصول پیش نظر رکھا ھے کہ آدمی ھی ھر شے کا پیمانہ ھے - اس لئے ھم لوگ ایک فریب نظر سے دوسرے فریب نظر میں مبتلا ھوتے رھتے ھیں اور جماعت اس کی صداقت و حقیقت تک پہونچنے میں ناکام رھتی ھے - ھم لوگ عکس و سایہ ھیں اور عکس و سایہ ھی کے طرح رہ جاتے ھیں اور یہی اصلی سبب ھماری مسرتوں اور قوتوں کی ناکامی کا ھے -

افلاطوں کے ریپبلک کا مطالعہ اور اس کا ھماری زبان میں ترجمہ ایک مخصوص واقعہ ھے - اور اس سے هندستانیوں کی خود شناسی کے باب میں ایک منزل معین پر پہونچنے کے علامات پائے جاتے ھیں -

ترجمہ کے بارے میں ' میں یہ کہونگا کہ یہ یقیناً تعریف کا مستحق ھے - یہ صحیح ھے کہ فاضل مترجم نے بجائے اصل یونانی

زبان کی کتاب کے اس کے انگریزی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کیا ہے ' لیکن یہ کوئی بہت بڑی کمی نہیں ہے - جاوٹ کا انگریزی ترجمہ جو اس ترجمے کا اصل ہے وہ یونانی زبان کی کتاب کا بہترین ترجمہ ہے - افلاطون کے نظریوں کی جو تشریح و تفسیر جاوٹ نے کی ہے زمانے نے اس پر ابھی تک کوئی مزید ترقی بھی نہیں کی -

کتاب کے نام کے ترجمے میں بلکہ تمام مکالمے کے ترجمے میں مترجم کو یقیناً بہت دقت ہوئی ہوگی - یونانی میں کتاب کا نام پولیٹیا (Politaia) ہے جس کا انگریزی میں لاطینی انداز سے ریپبلک ترجمہ کیا گیا ہے آخرالذکر لفظ کے معنی "دولت عامہ" کے ہیں - اردو کا لفظ "ریاست" اُس مفہوم سے بہت دور ہے - "دولت" غالباً اس کا قریب ترین مفہوم ہوسکتا تھا - اس لئے کہ ' اس کے واحد و جمع "دول" اور "دولت" اب بھی ریاست کے معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں - لیکن یہ اصطلاح ' " اقتصادیات " کے نقطۂ نظر سے بہتر اور معروف تر مفہوم کی حامل ہے - سلطنت ' حکومت ' مملکت ' طاقت اور اس نوع کے دوسرے الفاظ یکساں طور پر غیر مناسب ہیں - لیکن لفظ ریاست میں دقت یہ ہے کہ اس لفظ سے بجائے حکومت خود اختیاری و جمہوری کے حکومت شخصی و شاہی کی جانب اشارہ ہوتا ہے - شاید ہندستانی لفظ سوراج اور لفظوں کے مقابلے میں مفہوم سے قریب تر ہے - اس میں شک نہیں کہ یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اس کتاب میں صرف سیاسیات پر بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل اخلاقی اصولوں پر بحث ہے جو سیاسیات اور عمرانیات کی بنیادوں میں کار فرما ہوتے ہیں ' اور اسکا دوسرا نام " عدل " ہے جو اعلیٰ ترین خیر یا راستبازی ہے -

اسی قسم کا خیال Courage, Wisdom, Justice, Virtue
ایسے اصطلاحی الفاظ کے بارے میں بھی Self Control, Temperence
ہوسکتا ہے - ان لفظوں کے ترجمے میں فاضل مترجم نے یکسانی نہیں برتی
ہے - Justice کے لئے دونوں لفظ انصاف اور عدل ' Wisdom کے لئے
حکمت اور عقلمندی ' Courage کے لئے شجاعت ' همت اور بہادری '
Temperence کے لئے عفت - Self Control کے لئے ضبط ' اقتدار
علی النفس وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں - یہ تمام الفاظ
اصطلاحی ہیں - اور فلسفیانہ صحت کے لئے انکی اصطلاح معین ہو جانا
چاهئے تھی -

فلسفے کی اصطلاحات کے مسئلہ کے علاوہ مترجم کے لئے ایک دوسری
دقت یہ ہے کہ ترجمہ ایسا ہو جو پڑھنے میں آسان معلوم ہو - باوجود
اسکے کہ ریپبلک اپنے طرز اظہار میں حیرت انگیز کتاب ہے ' اسکا ترجمہ
کرنا آسان نہیں ہے - افلاطون نے اظہار خیال ' کے لئے جو پیرایۂ بیان
تجویز کیا ہے اس میں بہت روانی ہے جسے پیرایۂ اظہار اور لطافت ادا کا
ماہر ہی انجام دے سکتا ہے - اور افلاطون صرف ایک عظیم المرتبت فلسفی
ہی نہ تھا بلکہ ایک با کمال حسن کار بھی - آزادانہ روش اور روانی
بیان کو ترجمے میں قائم رکھنے میں غیر معمولی دشواری پیش
آتی ہے - مترجم نے اصل کتاب کی خصوصیات کو ترجمے میں مقید
کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے - لیکن متعدد مقامات
ہیں جہاں اسے محض معمولی کامیابی ہوئی ہے -

جب کبھی اسکا دوسرا ایڈیشن نکلے تو ترجمے پر پوری توجہ سے
نظر ثانی کی ضرورت ہوگی - میں یہ بھی تجویز کرونگا کہ اس میں
ذیلی حواشی بھی دئے جائیں - اس میں بہت سی یونانی تلمیحات '

یونانی علم تاریخ و ادب اور علم الاصنام کے متعلق بھی ھیں جو بغیر حواشی کے عام پڑھنے والوں کی سمجھہ میں نہ آئینگے - ناموں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے بھی کچھہ اصول ھونا چاھئے ' یا تو یونانی تلفظ کو ھندستانی اصوات کے ساتھہ دینا چاھئے یا انکے جدید انگریزی یا جرمن مترادفات - جن لوگوں نے ان مکالمات میں حصہ لیا ھے انکی شخصیت کے بارے میں بھی کچھہ وضاحت کر دینی چاھئے - یہ بھی ضروری ھے کہ فلسفیانہ اصطلاحات کی واضح طور پر تعریفیں بھی درج کردی جائیں تاکہ اُردو اصطلاحات کا مفہوم جہاں تک ممکن ھو اصل الفاظ سے قریب تر ھو -

آخر میں ' میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو مبارکباد دیتا ھوں کہ انہوں نے اتنے مشکل کام کو اس خوبی و کامیابی کے ساتھہ انجام دیا -

---

مرآۃ المثنوی

مرتبۂ قاضی تلمذ حسین صاحب ایم - اے ' رکن دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ -

ملنے کا پتہ :— دائرۃالادب ' حیدر گوڑہ ' حیدرآباد دکن قیمت ۱۰ روپیہ -

---

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی ' شعر و حکمت اور اسرار دینیہ کی جن چند در چند خصوصیات کی حامل ھے وہ محتاج تشریح نہیں - مشرق ' خصوصاً عالم اسلامی کا تو فتویٰ ھے کہ ع

ھست قرآں در زبان پہلوی

جو تعریف و توصیف کی آخری حد ہے ' مغرب یعنی مسیحی یورپ میں دانتے کی ڈیوائن کومیڈی بھی اسی طرح کا ایک شاہ کار تسلیم کی جاتی ہے جس کا ذکر پروفیسر نکلسن آج اس اعتراف کے ساتھ کرتے ہیں کہ مولانا کی مثنوی میں جو " بہجت و تلطیف جو وسعت مشرب اور جو روح خیر نظر آتی ہے وہ ڈیوائن کومیڈی کو میسر نہیں "۔

غرض کہ مثنوی چونکہ ادب و حکمت اور حقائق و معارف کا ایک گنجینہ ہے اس لئے ہر زمانے میں لوگوں کو اس سے استفادہ کا شوق رہا ہے اور مختلف طریقوں سے اس کے افادہ کو عام بنانے کی کوشش کی گئی ہے - طرح طرح کے ایڈیشنوں کے علاوہ اگر صرف اس کی شرحوں کا نام گنایا جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہوسکتی ہے ' عام مواعظ میں مثنوی کے قصص و حکایات اور اس کے نکات و لطائف کا مختلف عنوانوں اور تقریبوں سے ذکر ہوتا رہا ہے ' بہر صورت اس سے فیضیاب و متمتع ہونے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ' بایںہمہ عام حلقوں میں ' اکتساب ومطالعہ کا جو صحیح حق ہے وہ خاطرخواہ ادا نہ ہوسکا -

مثنوی کی جو اعلیٰ ترین شرحیں موجود ہیں وہ زیادہ تر شارحین کے تاثرات ہیں اور مثنوی کی طرح خود ایک مستقل چیز بن گئی ہیں ' بعض شرحیں ایسی ہیں جو ایک محدود حلقے کے افہام و تفہیم کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور اس لئے مثنوی کے اصل مفہوم سے اکثر بعد پیدا ہوگیا ہے ' اس قسم کی اصلاحی سعی وکوشش میں حسن نیت کو کتنا ہی دخل کیوں نہ ہو لیکن ظاہر ہے کہ ایسی شرحوں پر مشکل ہی سے شرح کا اطلاق ہوسکتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ حقیقی طور پر مثنوی سے جو افادہ مقصود ہے وہ اصل مثنوی ہی سے ممکن ہے بشرطیکہ اسکے مطالعہ کے لئے معقول آسانیاں بہم پہونچا دیجائیں - اس لئے کہ مولانا نے اپنے ارشادات کو

خود اس قدر آسان اور صاف طریقے سے پیش کر دیا ہے کہ شاید اس سے زاید توضیح و تشریح ممکن نہیں ' لیکن اس کے مطالعہ میں جو دقتیں حائل ہیں وہ یہ ہیں :—

(۱) مثنوی کے پیچ در پیچ قصص و حکایات جن کا سلسلہ بیان اکثر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے -

(۲) قرآن حکیم اور ارشادات نبوی کے اشارات و کنایات -

(۳) تلمیحات جن میں مولانا اپنے بعض معاصرین کی طرف اشارہ فرماتے ہیں -

(۴) فارسی زبان کے بعض الفاظ جو نہ صرف اردو خواں بلکہ بعض فارسی داں ناظرین کے لئے بھی آج نا مانوس ہیں - یہ ہیں وہ دشواریاں جو مثنوی کے مطالعہ میں مزاحم ہیں اور بہ استثنائے چند طالبان فن کے عام طور پر ہر کس و ناکس اس ہفتخواں کو طے کرنے کی ہمت نہیں کرتا ' لیکن مثنوی کو اگر مثنوی ہی سے سمجھنا دیگر وسائل سے اولی تر ہو (اور یقیناً اولی تر ہے) تو ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاضی تلمذ حسین صاحب نے مرآۃالمثنوی میں ان تمام دقتوں کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے رفع کر دیا ہے -

مرآۃالمثنوی کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں حضرت برہان‌الدین ولد چلپی موجودہ صاحب سجادہ خاندان مولویہ کے خط کا عکس ہے ' پھر اونہیں کا لکھا ہوا فارسی میں ایک مقدمہ ہے ' جس میں مثنوی اور صاحب مثنوی کے متعلق کچھہ حالات اور خاندانی روایات درج ہیں - اس کے بعد پروفیسر نکلسن کے خط کا عکس ہے پھر اونہیں کا لکھا ہوا ایک سر نامہ ہے ' اس کے بعد مرتب کا دیباچہ ہے جو ۴۰ صفحوں پر جاکر ختم ہوا ہے اب اس

کے بعد اصل مثنوی شروع ہوتی ہے جسکو قاضی صاحب نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے :—

پہلا حصہ یواقیت القصص ہے ' اس میں ضمنی بیانات کو حذف کر کے مثنوی کی کل حکایتیں یکجا کر دیگئی ہیں ' اسطرح چونکہ حکایتوں میں صحیح تسلسل پیدا ہو گیا ہے اس لئے اس کا مطالعہ آسان اور خوشگوار ہو گیا ' یہ حصہ ۵۳۹ صفحہ پر ختم ہوا ہے -

دوسرا حصہ دررالحکم کے نام سے ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے ' اِس میں مثنوی کے وہ اشعار ہیں جن میں حقائق و معارف اور مواعظ و حکم بیان کئے گئے ہیں ' بغلی سرخیاں دیکر فلسفہ و تصوف کے اِصطلاحات و مسائل بھی واضح کر دئے گئے ہیں -

تیسرا حصہ جواہرالقران ہے - اس میں وہ ابیات درج ہیں جن میں آیات قرانی کی تلمیح یا اقتباس ہے - اس میں قران کی پوری پوری آیتیں اور سورتیں بھی دیدی گئی ہیں -

چوتھا حصہ لالی سنن ہے ' اس میں وہ اشعار جمع کر دئے گئے ہیں جن میں احادیث نبوی کی طرف اشارہ ہے -

پانچواں حصہ مرجانۃالمدیح ہے - اس میں وہ اشعار ہیں جن میں مولانا نے اپنے بعض معاصرین کا ذکر کیا ہے مثلاً برہان الدین محقق (یہ مولانا کے والد کے خلیفہ ہیں ' اور مولانا کی ابتدائی تربیت انہیں کے زیر اثر ہوئی تھی) ' شمس تبریز ' صلاح الدین زرکوب اور حسام الدین چلپی جن کی فرمائش سے مولانا نے یہ مثنوی لکھی -

اس کے بعد قاضیؒ صاحب نے کشف الابیات کے نام سے ایک حیرت انگیز انڈکس تیار کی ہے ' جس میں ہر شعر کے ایک دو لفظ بہ ترتیب حروف تہجی لکھ کر اس کے صفحوں کا نمبر دیدیا ہے جس کا مطلب یہ ہے

که اگر کسی کو مثنوی کے کسی شعر کے ایک ھی دو لفظ یاد ھوں تو وہ اس کشف الابیات کی مدد سے مثنوی میں سے بہ آسانی وہ شعر نکال لے سکتا ھے -

آخر میں نامانوس اور مشکل الفاظ کی ایک فرھنگ ھے جو ۶۷ صفحوں میں جاکر ختم ھوئی ھے -

اس التزام سے یہ اندازہ ھوسکتا ھے کہ فاضل مرتب نے کس قدر محنت اور جان کاھی سے کام لیا ھے اور مثنوی کو جو عام طور پر ایک سنگلاخ چیز سمجھی جاتی تھی کس طرح پانی کرکے رکھدیا ھے -

کتابت و طباعت بغایت پسندیدہ ' کاغذ چکنا اور دبیز ' چرمی جلد جس پر طلائی حروف میں کتاب کا نام منقش ھے - (مدیر)

افسانہائے عشق

مصنفہ جناب حامد علی خانصاحب

یہ سات افسانوں کا مجموعہ ھے - سر ورق پر کیوپڈ اور سائیکی کی تصویر دیگئی ھے اور کتاب میں افسانہ خواں کی ایک عمدہ تصویر ھے - کتاب کی ضخامت ۱۸۲ صفحات ھے - کتابت عمدہ - جلد نفیس تقطیع جیبی - قیمت درج نہیں ھے -

شروع میں منصور احمد صاحب مدیر ادبی دنیا نے ایک مقدمہ لکھا ھے جس میں ان افسانوں کی خوبیوں کی جانب اشارہ کیا ھے - یہ افسانے جناب حامد صاحب نے ٹیگور اور دیگر افسانہ نگاروں سے ترجمہ کئے ھیں اور اتفاق یہ ھے کہ سب المیہ ھیں - حامد علی خاں صاحب کی طبیعت بہت درد مند واقع ھوئی ھے معلوم ھوتا ھے کہ وہ خود ان افسانوں سے بہت متاثر ھوے ھیں اس لئے ترجمے میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا ھوگئی ھے ' اگر پہلے سے معلوم نہ ھو تو مشکل سے اسے ترجمہ کہا جاسکتا ھے ' زبان بہت پاکیزہ اور دلچسپ ھے - کتاب غم و حرماں کے نام معنون کی گئی ھے -

نیرنگ خیال

هندوستان کا مقبول ترین علمي أور ادبي
ماهوار مجلہ - دس سال سے برابر شائع
هو رها هے - سال بهر میں قریباً
--- ایک هزار (۱۰۰۰) صفحات ---
اور
کئي درجن رنگین تصاویر
--- شائع هوتي هیں ---

ملک کي کئی هزار تعلیم یافته خواتین اُسے پڑھتی هیں - نیرنگ خیال کي اشاعت هندوستان بهر کے تمام علمی ادبي رسائل میں سب سے زیادہ هے هر ماه تقریباً ایک لاکهه تعلیم یافته حضرات کے مطالعه میں رهتا هے - نیرنگ خیال کي مقبولیت کا راز صرف یه هے که اس میں تمام بڑے بڑے اهل قلم مضامین لکھتے هیں اور اس کا چنده بے حد قلیل هے -

چنده سالانه : تین روپئے چار آنے - سالانه سمیت چار روپئے باره آنے - سالانه دسمبر کے پرچے کے علاوه بطور زائد خاص نمبر علحده شائع هوتے هیں ' جس کي جدا گانه قیمت ایک روپیه آٹهه آنے هوتي هے -

نیرنگ خیال میں اشتهار دینا هندوستان کي تمام متمول پبلک تک پهونچنے کا بهترین ذریعه هے -

منیجر

نیرنگ خیال

شاهی محله ' لاهور -

اُردو

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن) کا خالص

ادبی سہ ماہی رسالہ

جو

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

جس میں

ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -

اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب، بی - اے - سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) -

سالانہ چندہ : سات روپئے - ایک نسخے کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ، الہ آباد -

سائینس

انجمن ترقی اُردو ' اورنگ آباد (دکن)

کا خالص

سائینس کا سہ ماھی رسالہ

جو

جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شائع ھوتا ھے

جس میں

سائینس کی جدید ترین ایجادات '

انکشافات اور اختراعات پر بحث ھوتی ھے

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی محمد نصیرالدین احمد عثمانی صاحب '

ایم - اے ' بی ایس سی - معلم طبیعات ' کلیہ جامعہ عثمانیہ -

سالانہ چندہ : آٹھہ روپیہ - ایک نسخہ کی قیمت دو روپیہ -

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ ' الہ آباد سے

طلب کیجئے

هندستانی

هندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۴ } اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ع { حصہ ۴

وقائع ثنا

یا

رزمنامۂ پانی پت

(از محمد اجمل خاں، ایم - اے)

وقائع ثنا ایک رزمنامہ ہے جو سید زاہد صاحب المتخلص بہ ثنا نے پانی پت کی تیسری لڑائی کے متعلق سنہ ۱۱۷۴ ہجری میں لکھا تھا - اس کتاب کا سر ورق غائب ہے - لیکن پرانے زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ پہلے صفحہ کو سادہ رکھتے تھے اور دوسرے صفحہ سے تحریر شروع کرتے تھے - لہذا ایک صفحہ کتاب کا کم ہے - دوسرا ورق بوسیدہ ہوگیا ہے اور اکثر مقامات پر مشکل سے پڑھا جاتا ہے - کل ۱۱۹ ورق ہیں - اور ہر صفحہ پر نو شعر خط خام میں لکھے ہوئے ہیں - کل اشعار ۲۱۱۹ ہیں - اور تقطیع چھوٹی ہے -

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ع میں کاتب الحروف اپنے وطن قصبہ گوتنی ضلع پرتاب گڈھ (اودھ) گیا ہوا تھا - یہ قصبہ دریائے گنگا کے کنارے کڑے اور

مانک پور کے درمیان آباد ہے - اور پٹھانوں کی پرانی بستی ہے - وہاں یہ کتاب دستیاب ہوئی ' جسے کسی پٹھان نے محض رزمیہ شاعری کی دلچسپی کی وجہ سے محفوظ رکھا تھا - کتاب کے آخر میں درج ہے کہ بعون اللہ تعالی بتاریخ دوازدھم ربیع الثانی سنہ ۱۲۰۴ ھجری بخاطر داشت محمد تقی خان ساکن گوتنی از خط خام میر عدل جائسی در پرگنہ حسن پور مقام بہاری پور متصل سرسا برائے خاطر برخوردار ذوالفقار خان تحریر یافت - بساعت نیک باتمام رسید -

هر که خواند دعا طمع دارم * ز آنکه من بندۂ گنہگارم

اس کے بعد جنگ نامہ منصور علیخاں ہے ' جو دوسرے خط میں بالکل لکھنو کی زبان میں لکھا ہوا ہے ' اور یا تو کسی نے بعد میں اضافہ کیا ' یا مالک کتاب نے خود لکھا ہے - وقائع ثنا کی تصنیف سنہ ۱۱۷۴ھ میں شروع کی گئی سنہ ۱۱۷۶ھ ۱۲ شعبان کو ختم ہوئی - یعنی آج سے ۱۷۸ برس پہلے کی تصنیف ہے -

زبان

صاحب تصنیف کی زبان نہایت قدیم ہے - یہ زبان تقریباً وہی ہے جو ولی کی تھی اس لئے ثنا کا شمار دور اول کے شعرا میں کیا جاسکتا ہے - ثنا علوم عربیہ و فارسیہ کے زیادہ ماہر معلوم ہوتے ہیں - جا بجا ایسی فارسی اور عربی بندشیں استعمال کی ہیں جو صرف ایسا شخص استعمال کر سکتا ہے ' جو السنۂ مذکورہ پر کما حقہ حاوی ہو - بعض بعض جگہہ تو پورے مصرعے فارسی کے ہیں - مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :—

باعزاز آن شاهزاده حسن

کہ اُن پر فدا ہو جیو جان و تن

بحق حسین آن که در کربلا
نواسه نبی سید باصفا
بحق تقاوت محمد تقی
بحق صداقت علی نقی
بحق هادی راه مهدی زمان
که هے قاتل الکفر روشن روان
خدایا بحق نبی تا ابد
نگه رکھه تو از حاسد و چشم بد
هے سر سبز او تازہ از آدانت
بسر ما و گر ما همیشه بسنت
سنا جب خبر هوگئے پرزکین
شکنہا پڑے غصه سون بر جبین
کروں وہ طرح جنگ کی درمیان
چون داؤد باقوم جالوتیان
مثل هے یه مشهور دانائے سوں
کرے بازي از ریش با بائے سوں
بشرطیکه سلطان عالی محل
کرین آپ بهی ڈیرہ باهر نکل
یکے روز فرخ مبارک سعید
سب احکام انجم سوں آیا پدید

سب سے بڑي بات یه هے که زبان ریختہ میں رزمیه شاعري کی بنیادی کتاب وقائع ثنا هی هے - تذکرہ نویسوں نے غالباً ایسے بلند پایه

شاعر کے متعلق جو خاموشی اختیار کی ہے وہ اسوجہ سے ہے کہ شاید ثنا نے زمانہ گردی اور عام ملکی انتشار سے پریشان ہوکر خانہ نشینی اختیار کرلی ہوگی - یا ایسی خود دار طبیعت پائی تھی کہ بادشاہوں اور امرا کی دربار داری نہ پسند کی ہو ' تذکروں میں عموماً ایسے ہی شاعروں کے نام ہیں جو کسی رئیس یا بادشاہ سے توسط رکھتے تھے یا کم از کم ایسے شہر میں رہتے تھے جہاں امرا و شعرا کی کافی تعداد تھی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ ثنا کی تصنیف اُس زمانے کی ہے جبکہ زبان ریختہ عوام کی زبان سمجھی جاتی تھی ' اور سلطنت اور خواص کی زبان فارسی تھی - اس لئے اس طرف کسی نے توجہ نہ کی ' اور صرف ایک پٹھان نے جو اپنے فرزند ذوالفقار خان میں جذبۂ رزم باقی رکھنا چاہتا تھا ' میر عدل جائسی سے لکھوا کر ایسی بے نظیر تصنیف کو محفوظ کر دیا -

وقائع ثنا کا خلاصہ

ابتدا میں حمد ہے - چونکہ سر ورق نہیں ہے - لہذا ۶ - ۷ اشعار کم ہیں حمد کا نمونہ یہ ہے :—

دھن کو دیا چشمۂ خوشگوار
او مخزن سخن کا کیا گنجدار
دیا لب چو یاقوت رنگ نگین
دیا تاب دندان کوں دُر ثمین
دیا ابرو رخ کو بھی درجہ علو
کیا خوشنما دي ذقن او گلو

دیا طعمہا نو بدو رنگ بو
کرم سوں کہا تب کلوا واشر بوا
اس احساس کا کر سکے کچھہ بیان
اگر ہوئے ہر موئے صدصد زبان
دیکھو صانع کے دست تقدیر کون
کیا مختلف رنگ تصویر کون
کیا کوی نبوت دے موسیٰ خلیل
کیا کوئی نمرود فرعوں ذلیل
کوئی شاہ کرکے دیا عدل داد
کوئي ظالم و مدبر و بد نہاد
کسی کون دیا دولت و عز و شان
کسی کو کیا خوب محتاج نان

حمد کے بعد عنوان ہے - '' تضرع نمودن بدرگاہ جل و علی و آمرزش خواستن از گناہان '' اس میں خدا کو بہت سی قسمیں دیں ہیں کہ میرے گناہوں کو بخش دے :—

مثلاً

قسم ہے تجھے رحم اور قہر کی
قسم ہے صفت لہر در لہر کی
قسم ہے تجھے ناز طفلاں کی
قسم تجھکوں عشق جوانان کی
تجھے آہ سردِ اسیران کسوں
تجھے بوئے خون شہیدان کسوں

تجھے اپنی عظمت خدائی کسوں

تجھے میرے درد جدائی کسوں

تجھے روح حوا و آدم کسوں

تجھے اپنی سب خلق و عالم کسوں

اس کے بعد عنوان ھے ''در نعت حضرت سیدالمرسلین شفیع المذنبین رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم'' نمونہ یہ ھے :—

ملائک کریں پائے بوسی تری

نہ تختِ فلک ایک کرسی تری

کھڑي زهره برجیس خدمت کریں

ثریا تري چتر کي جھالریں

دیوے ماہ وقت سواري رکاب

بسر چمکھیاں لے چلے آفتاب

رواں جب کرے فوج کوں بر عدو

کریں عیسیٰ لگیں صدا طرقو

جو دیکھا تری بخشش عام کوں

ہوئی حرص عزازیل خود کام کوں

لگا کھنے افسوس سوں آہ مار

او روتا تھا حسرت ستیں زار زار

جو جانتا میں ہوگا محمد نمود

میں ہی کرتا آدم کوں پہلے سجود

نعت کے سلسلے میں چاروں اصحاب کی منقبت یوں کی ہے :—

ہو حاکم شریعت کے مسند بنائے
مربع بٹھے چار تکیہ لگائے
بجائے خود ہر یک کو تمکیں دیا
ابوبکر کو یار پیشیں کیا
عمر داہنے اور عثماں یسار
رکھا پشت دیں شاہ باذوالفقار
کہوں شاہ کہ کے علی مرتضی
قدم پر قدم ہے نبی الورا
مخالف پہ ہوتا تھا تنگ روزگار
کہ جس وقت چلے شاہ دلدل سوار
لرزتے تھے آواز چابک کے بیچ
دبکتے کبوتر سے کابک کے بیچ
دیا زینت ہر یک تئیں گرد و پیش
او مضبوط کی پشت بازوئے خویش
بٹھے درمیان سید ہاشمی
بفرمان ایزد کیا حاکمی

نعت کے بعد عنوان ہے " مناجات کردن بدرگاہ باری تعالی جل شانہٗ بشفاعت ائمہ معصومین " لیکن اس میں حضرت علی کا نام نہیں ہے - غالباً اسوجہ سے کہ اصحاب کے زمرہ میں آپ کا نام آ چکا ہے -

اس میں حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ سے شروع کیا ہے - ان کے بعد ائمہ ، حسن ، حسین ، زین العابدین - باقر - جعفر - موسی رضا -

محمد تقی - علی نقی - حسن عسکری - مہدی زمان رضوان اللہ علیہم کے نام ہیں - اور ان سب کے واسطے سے یہ دعا مانگی گئی ہے کہ :—

او برلیاے مہری تو یک آرزو * کہ اس بن ترستا خلق مو بمو
مسلط کر اولاد تیموریہ * دے آرائش این عالم صوریہ

اس کے بعد " عذر خواستن از بزرگان کہ چشم از عوائب [ا] کہتران بپوشند " ہے - جسمیں اپنا نام اور وطن بتایا ہے -

نام و وطن مصنف و تاریخ تصنیف

زاہد نام - ثنا تخلص - سادات قصبہ کراری ضلع الہ آباد سے ہیں - کراری میں شیعہ زیادہ اور سنی کم آباد ہیں - لیکن میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ آپ بظاہر سنی معلوم ہوتے ہیں - اپنے متعلق فرماتے ہیں :—

سنو عرض میری ای صاحب کمال
حدیقہ سخن کا ہوں میں نونہال
کہا جنگ میں شاہ دراں کی
خلیفہ نبی ظل سبحان کی
کیا نظم در ریختہ بیتہا
حقیقت تمام ابتدا انتہا

[ا]—کاتب کی کم علمی پر یہ لفظ دلیل ہے - حقیقت میں بجائے عوائب کے معائب لفظ چاہئے •

سنا تھا جو کچھہ اور آنکھوں دکھا
جدا کر حقیقت وقائع لکھا

تھی سنّ ھجران سید نامدار
ھزار اور صد اور ھفتاد چار

کرو سیر جو تم وقائع ثنا
کہیں بیت کے بیچ دیکھو خطا

صلاح دیو اُسے جو رھے آن بنی
کرم سوں کرو دور طعنہ‌زنی

میں کوشش سے اپنے کیا نا قصور
فاما سخن کا گھر ھے دور دور

کہاں لگ چلے یہ طبیعت نحیف
اصل سوں ھے ترکیب انسان ضعیف

جو ھو نیش زن کوئی ز راہ تباہ
ازیں عقربا دہ خدایا پناہ

مصنف کا سن نام جو ناسنا
اسم زاھد ھے او تخلص ثنا

ھے سادات کا کمتریں خادماں
او پشتین سے ھے کراری مکاں

صفت اُس مکان کی نہیں مختصر
کہا کچھہ ذرا موجز ومختصر

خدا نے دو کونین سے گر قبول
مہر سوں کیا جائے آل رسول

*

غرضکہ یہ تصنیف جس کا نام مصنف نے وقائع ثنا رکھا ہے ۱۱۷۴ھ میں شروع کی گئی - ۱۱۷۶ھ میں ختم ہوئی - لکھتے ہیں کہ :—

بخوش روز شنبہ بوقت سحر
و در چار سن شاہ عالی گہر
تھے ہجرت کے سن یا ز ہفتا دوشش
او تاریخ شعبان کی بھی دوشش
ثنا نے کیا یہ وقائع تمام
محمد نبی پر درود و سلام

آخری شعر ہے :—

جو دل خوش کرے پڑ وقائع ثنا
کرم سوں کیرے تک ثنا پرثنا

عذر خواہی اور اپنا نام و وطن بتانے کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے - عنوان ہے "وقائع اول در صفت نا نہا و عملداری او - در تغیر کردن ملہار از ہندوستان - بحال شدن جھلکو و جنگ نمودن جھلکو در سکر تال" - اسے اسطرح شروع کرتے ہیں :—

دیکھو قدرت قادر ذوالجلال
کسی کوں نہیں گفتگو کی مجال
ملک پر دو عالم کے مختار ہے
حکومت اُسی کوں سزاوار ہے
تعرض سکے کر کوئی کیا گماں
سب تابع حکم کے ہیں کون و مکاں

اس وقائع سے ایک خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے - کہ اُس زمانے میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات نہایت اچھے تھے - حالانکہ مرہٹوں نے بہت زیادہ سختی شروع کردی تھی - چوتھہ کے علاوہ لوٹ مار بھی ہوجاتی تھی لیکن ہندوستانیوں کو اُن سے زیادہ شکایت نہ تھی - بالاراؤ پیشوا کے زمانے میں ہند کا صوبہ‌دار ملہار راؤ تھا - اُسکے زمانے میں سب ہندی خوش تھے - لیکن جب جھنکو راؤ صوبہ دار ہوا تو اس سے ہندو مسلمان سب نالاں ہوگئے حقیقت میں مرہٹہ ' راجپوت ' اور جات ' بحیثیت ہندو ہونے کے کبھی متحد نہیں ہوئے ' اور نہ اس حیثیت سے کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی ہوئی - وقائع اول کے اشعار ذیل صاف صاف اس امر کی تائید کرتے ہیں :—

یک سردار دکھن میں با حشم و جاہ
کہ رکھتا تھا سب راو رانا نگاہ
اسم بالاراؤ تھا بہت بے نظیر
او ناتھا بھی کہتے صغیر و کبیر
سپاہی جوانمرد و حاتم بڑا
او تارا تھا دولت کا ماتھے چڑا
مقرر کیا پونا میں جائگاہ
رکھا ماتھہ چن چن دکن کی سپاہ
نہ ایسا ہوا جب سوں پونائے میں
نہ لگتے جسے ہندیو دکنی

(ملاحظہ فرمائیے ہندی اور دکھنی الگ الگ قومیں تھیں - ہندی میں ہندو مسلمان دونوں داخل تھے)

اتنا لکھنے کے بعد اُسکی فتوحات کی تعریف کی ہے پھر لکھا ہے :—

طرف ہند کے بھیجتا صوبہ دار
تعینات رکھتا تھا لکھہ لکھہ سوار
تھا مامور برہلند ملہار راؤ
کہ رکھتا بہت ہندیوں سوں لگاؤ
بگڑتا کدھین بیجا حرکت ستیں
نکالتا تھا سب کام حکمت ستیں
رفیق ہوتا جسکا دل و جان سوں
نہ رکھتا عداوت مسلمان سوں
ہوئی منقلب گردش روزگار
کیا جھنکوں کون ہند کا صوبہ‌دار
سدا غازدین خان نے یہ روبکار
ہوا جھنکو اب ملک کا صوبہ‌دار
کہا کہا کیا نانا نے خیال خام
تھا ملہار جی سب سوں واقف تمام
نجانے طرح کیا کرے اشکار
بہت بد ہے یہ طفل ناکردہ کار

القصہ جھنکو راؤ نے دھلی پر حملہ کردیا - عمادالملک غازی الدین خاں وزیر تھا اور جو کچھہ نام نہاد حکومت باقی تھی وہ اس کے ہاتھہ میں تھی - اور اس طرح صلح ہوئی کہ جھنکو راؤ نے کہا :—

جو کرتا سلوک تم سے آیا ملہار
وہی ہے مرا آج قول و قرار

یک شمشیر خلعت مرحمت کرو
او پنجاب کو مجھکوں رخصت کرو
جو کچھہ ہم کریں جا وہاں دست برد
کریں اونکو حصہ تمہارا سپرد

مرہٹے لٹھرے تھے - مگر شاہی پروانہ حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے دیوانی کی اجازت لیکے جھنکو راؤ پنجاب کی طرف روانہ ہوگیا -

نجیب‌الدولہ نے جب مرہٹوں کی آمد سنی تو اُس نے آکر راؤ جھنکو سے صلح کی باتیں شروع کیں اور اُس سے مل کر یہ طے کیا کہ بخشی گری مجھے دلوائے ارر غازی‌الدین‌خان کو نکالئے - لیکن باغپت کے قریب جھنکو نے اودہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کردیا - اسلئے نجیب‌الدولہ وہاں سے رخصت ہوا ' اور سکرتال پر مرہٹوں سے خوب لڑا - اسکے بعد پسپا ہوگیا اور احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ جلد آئے - احمد شاہ نے لکھا کہ :—

ہوا حائل اب موسم بر شگال
نظر میں نہیں ہے سپہ کا نکال
کروں ہند بردار از گرد خیل
بشرطے طلوع ہو ستارہ سہیل

اس کے بعد وقائع دوم ہے - یعني " فرستادن ایلچی غازدین خان بطرف شاہ درانی - جواب آوردن ایلچی و رخصت شدن غاز دین خان از بادشاہ برائے شجاع‌الدولہ بہادر بنابر صلح نجیب خان و جھنکو در سکر تال " -

نجیب‌الدولہ کی نوشت و خواند کا حال سن کر عمادالملک غازی الدین خاں نے احمد شاہ کو ایلچی کے ذریعہ سے بہت کچھہ زر و جواھر بھیجا اور لکھا کہ آپ کے تشریف لانے کی چنداں ضرورت نہیں ھے -

سنا جاتا ھے شاہ کا پھر نـزول
اب ھرگز نکیجئے کبھی قصد بھول
یہاں مرھٹہ ھیں بہت بے ادب
لئے پھرتے ھیں فوج سردار سب
کریں جو طلب فوج کوں وقت کار
دکھن سے چلے آویں لکھـا سوار
تسین بیٹھے رھئے وھیں باسـرور
غنیم سے مقابل ھونا کیا ضـرور
خبـردار کـرنا غلامـوں کا کار
پھر آگے شہنشـہ کا ھے اختیـار

احمد شاہ نے اسکا سخت جواب دیا - غازی‌الدین نے بادشاہ وقت سے درخواست کی آپ اگر باھر نکل کے جنگ کریں تو ھم یقیناً درانیوں کو بھگا دینگے - بادشاہ نے کہا کہ میرے پاس نہ فوج ھے نہ روپیہ -

چھپا کچھہ نہیں تجھہ سوں اے نور چشم
نگہ کر تو ھی کچھہ بھی ھے خیل و حشم
نہ ماھی مراتب نہ جھنڈا نشان
رھے نہ مـرے ھاتھہ گجنال بان
نہ نوبت نقـارے نہ کـر نائیاں
نہ جھانجھیں نفیریں نہ سر نائیاں

نہ عــربی دھل ھے و نہ طاسہا

نہ کــرناتھــہ کے دکھنــی باجہا

نہ ضربیں رھیں اب نہ گھوڑ نالیان

نہ رھڑو نہ لسچھــر نہ چھوچھکیان

رھیں نا وہ شاہین جیوں مورتیں

جــزائــر دھــماکے نہ زنــبورکیں

نہ آ شــام کے وے ســوار اوپچي

تیــاري کــوں میــرے رھے اوپچي

نہیں ســاتھہ میــرے رسالے بلی

نــہ آلاشاھی او نہیں کابلي

رھے نا وے قــولار او عنبــری

نہ والا شاھی جنکی تھي بــر تــري

(اعلی شاھی ' والا شاھي رسالوں کے نام معلوم ہوتے ھیں)

نہ احــدی رھے نا رھے گــرزدار

نہ ساتھی رھے رے مغل پنجہزار

نہ پر تل کہیں اب نہ بنگہ بہیر

نہیں ساتھی چھوٹے بڑے کوئی امیر

نہ فرّاش ھیں او نہیں خیمہ گاہ

نہیں ساتھہ مردان جنگی سپاہ

نہ لشکر کہیں اب نہ اردو بزار

نہ بقــال صــراف نہ بیلدار

نہ ھاتھی ھمارے و نہ فیل بان

نہ باروں کو ھیں اونٹ نہ ساربان

نہ سائیس ہیں نہ طویلہ نہ خیل
نہیں ساتھہ میرے نحالوں کے بیل

نہ رتھیں رہیں پردہ زرکاریاں
رہیں نہ سواری کی انباریاں

نہ کوئی چھکڑہ ہے لے چلے رخت کوں
کہا ریں گئے چھوڑ کر تخت کوں

نہ خود اب رہے نا جھلم بکتریں
نہ گھوڑے رہے ناسري پاکھریں

رہیں نا بندوقیں مری خاصگي
نہ بارود شیشہ و نا جامگي

نہ چلہ کمانوں میں ناسے سریں
نہ ترکش میں پیکاں نہ ثابت سریں

سپر ہے نہ شمشیر جمدھر کوئي
نہ بلم نہ نیزہ نہ خنجر کوئی

ببرچی نہ پاس نا کوئی آبدار
رونہ نہ کوئی نہیں کفش دار

نہ طرہ نہ کلغی نہ چیرہ دستار
نہ جامہ دوپٹہ نہ پٹکہ ازار

نہ آمد کہن کی نہ گنجینہ پر
رہے نہ مرے ساتھہ صندوق ور

ایسے طالع میرے پھنسے پابگل
ہوئے سنگ سون سنگ بھی سنگدل

جواهر گئے اپنی پھر کہان کوں
چلے موتی دریائے عمّان کوں

تجمل نہ کچھہ اور نہ کچھہ فوجہا
مگر تنہا هم او دوسہ فوجہا

رها نہ مرے ساتهہ کچھہ ساز سوں
بہ دو گوش و بینی کہاں جا سکوں

لگین ناچنے تیغیں چوری جب انی
کرین کیا وهاں جا هم دستک زنی

بڑے شہر میں اپنے نیک نام سوں
کریں کوچ اب کس سر انجام سوں

سپہ مغلئی سوں گئی اوتهہ گهروں
چھتر تخت کیا لےمیں سر پر دهروں

کیا خوب تحقیق هم مردماں
مگس هیں یہ دولت کے سب بیگماں

جو دولت گئی اب مرے هاتهہ سوں
گئے اُڑ وہ یکسر سبھی ساتهہ سوں

اگر مرضی هے تیری اب خواہ مخواہ
پڑوں باهر اب چھوڑ آرام گاہ

هوں بیمار میں اور بہت درد مند
یک چوپالہ لیا باکهارانِ چند

نفع کچھہ نہ لیکن مرے ساتهہ سوں
بچوگے نہ تم لوگوں کے هاتهہ سوں

خلق دیکھہ میری بلند افسری
کریں گے بہت ریش خلدي تري
کریں گے سب آپس میں یہ قیل قال
وزیر نے کیا بادشاہ کا یہ حال

مندرجہ بالا مرثیہ سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں - اول یہ کہ بادشاہ مجبور محض تھے اور نام کو اُنکی حکومت باقی رہ گئی تھی - دوسرے یہ کہ باوجود اس قدر مجبوری کے خاندان تیموریہ کا اتنا وقار ہندوستانیوں کے دل میں تھا کہ تخت دھلی پر نہ تو کسی مسلمان نے بیٹھنے کی جرأت کی اور نہ مرھٹوں ' جاٹوں یا سکھوں نے باد شاہ کو اپنا باد شاہ نہ سمجھا ہو ' حتیٰ کہ بنگال میں بھی دیوانی کے اختیارات کا پروانہ اسی مغلیہ خاندان کے مجبور بادشاہ کی طرف سے انگریز کمپنی نے حاصل کیا تھا - اسی طرح جھنکو راؤ نے پنجاب کی دیوانی کا پروانہ حاصل کیا - اور اسی طرح اس سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے لاھور و ملتان کی دیوانی حاصل کی تھی -

غرضکہ بادشاہ نے لڑنے سے انکار کردیا اور غازی الدین خاں کو اختیار دیا کہ مرھٹوں کو ساتھہ لیکے احمد شاہ سے جنگ کرو - غازی الدین خان نے جو کچھہ فوج تھی اُسے دو ماہہ باٹنے کا حکم دیا اسلئے کہ اکثر یہ ھوتا تھا کہ مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی اور سب درگاھوں پر جاکے دعا مانگی -

دھلی سے شاہ درے آئے - وھاں سے فرخ نگر آکر ڈیرہ کیا - نجیب خان نے شجاع الدولہ سے مدد مانگي - شجاع الدولہ نے جواب دیا -

اگرچہ مرھٹہ قدیم ھے رفیق
لیکن بھیجتا ھوں صلح کے طریق
نہو اب ذرہ ایک کچھہ آزردہ دل
کمر باندہ جنگ پر رھو مستقل

اور سکر تال کی طرف معہ فوج کے روانہ ھوگیا - نجیب الدولہ نے آکر بہت خوشامد کی اور نذر پیش کی - شجاع الدولہ نے جھنکو راؤ سے کہلا بھیجا کہ شاہ درانی کے آنے کی خبر ھے تم اُدھر جاؤ - یہاں میں انتظام کرتا ھوں - جھنکو نے مان لیا اور لاھور کی طرف روانہ ھوگیا -

وقائع سوم " متوجہ شدن ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی احمد شاہ درانی بطرف ھندوستان " -

اُس وقائع میں احمد شاہ درّانی کی روانگی کا حال ھے - جب دریائے اٹک پار اُتر آئے تو مرھٹوں سے مقابلہ ھوا - تھوڑی سے لڑائی کے بعد مرھٹوں نے شکست کھائی اور لاھور کی راہ لی - پھر پٹیالہ کی طرف بھاگے - ابدالیوں نے دریا عبور کرنے کے بعد شہر چترال میں قیام کیا - جب بادشاہ دھلی کو خبر ھوئی تو وہ بہت خوش ھوا کہ اب غازی الدین خان کے پنجہ سے نجات ملیگی -

سنا جب خبر دل بہت خوش کیا
کلاہِ فخر کوں ھوا پر دیا

اور غازی الدین خان نے سنا تو :—

خبر سن بہت پُر خروش ھو گئے
کہا سر نگوں اوخموش ھو گئے

وقائع چہارم - ''شنیدن وزیر (عمادالملک غازی الدین خان) آمدن شاہ درانی و مصلحت کردن با مصاحبان خود و کشتن بادشاہ عالمگیر ثانی را '' -

وزیر نے پھر بادشاہ سے کہا کہ احمد شاہ آگیا ھے - اب چلئے پہلے روھیلوں کا قلع قمع کریں - پھر مرھٹوں کو ساتھ لیکے درانیوں کو ھندوستان آنے کا مزا چکھائیں - لیکن باد شاہ نے یہ کہ کے ٹالدیا کہ :—

مری بات تحقیق جانو تمہیں
شہنشہ سوں لڑنے کی طاقت نہیں
کیا مفلسیں بہت خاطر پریش
نہیں ھاتھ میرے بجز موئے خویش
اکیلا کوئی فوج کو موڑنا
کہیں یک چنا بھاڑ کوں پھوڑنا

وزیر نے یہ بات سنی تو اپنے مصاحبوں سے مشورہ کیا کہ بادشاہ کو قتل کردیا جائے - بادشاہ سے آکے کہا کہ دو فقیر خراسان سے آئے ھیں اُن سے چل کے دعا کرائیے کہ ھندوستان سے درانیوں کی بلا ٹلے - بادشاہ فوراً تیار ھو گیا - قضا سر پر کھیل رہی تھی - نہا دھو وضو کرکے اور تخت پر سوار ھو کے کوٹلہ پہنچے - فقیروں نے استقبال کیا - اور خنجروں سے مار کر فصیل کے نیچے گرادیا - جب شہر میں ھنگامہ مچا تو نبیرہ جہاندار کام بخش بن اورنگ زیب کو شاھجہان ثانی کا لقب دیکر بٹھا دیا - اور مسجد میں دوگانہ پڑھوا کے قلعہ میں داخل کر دیا - شہر میں ھلّڑ مچا کہ ابدالی آرھے ھیں - لوگ جوق جوق بھاگنے لگے -

سنا غلغلہ شہر کے درمیان
چلیں گردسوں بار بر داریاں

خبر ہوگئی سارے کوچہ گلی
سب اسباب لے عمدہ بیگم چلی
شہر چھوڑ کے لوگ باھر چلا
سو بہتا جدھر تھا سو تودھر چلا
غریبیں بچارے چلے درمیاں
قبائل آگے سر اُپر گٹھریاں
لگے لوٹ نے راہ میں رھزناں
گویا مردا اوپر زغن کرگساں

وقائع پنجم شلیدن راؤ جھلکو آمد آمد شاہ درانی و مقابل شدن میدان قرنال در شاھجہان آباد و شکست خوردن جھلکو و غیازالدین خان (غازی‌الدین خان) و غارت شدن شاھجہان آباد -

غازی‌الدین دھلی سے روانہ ھوکر سکرتال پر آیا اور راؤ جھلکو نے اُس کی پیشوائی کی - اودھر سے ابدالیوں کی فوج بھی آگئی تھی پہلے حملہ مرھٹوں نے کیا - احمد شاہ نے جنرل شاہ‌ولی‌خان سے ساز و سامان لیکر آگے چلنے کو کہا - لڑائی ھوئی اور دکھنیوں کو شکست ھوئي ، تو غازی‌الدین خان کے مشورہ سے دھلی کی طرف روانہ ھوئے روھیلوں کو جب احمد شاہ کے آنے کي خبر معلوم ھوئی تو نجیب خاں نے اُن کا بصد خوشی استقبال کیا - اور روھیلہ سرداروں نے نذرین گزرانین - پھر دتا جی نے بہت دلیري سے ابدالیوں کا مقابلہ کیا اور میدان میں مارا گیا - فوج نے آکر دھلی میں پناہ لی - رات کو یہ خبر مشہور ھوئی کہ مغل متھائی کا پل لوٹ رھے ھیں - سیدی بلال نے یہ حال دیکھہ کے لاھوری دروازہ بند کردیا - لیکن یہ مغل نہ تھے -

ابدالي تھے - ھندوستانیوں کے تعاقب میں دھلي تک چلے آئے تھے اور شھر میں گھس پڑے تھے - قتل عام شروع کردیا -

نہ چھٹے زن و مرد برناؤ پیر
سبھي ھوتے تھے طعمۂ تیغ و تیر
جو اوتا نظر میں سووے قتل کر
نہ کرتے ذرا رحم بھی طفل پر
زنوں کو پکڑ وہ لیجاتے کشاں
نہ دھشت خدا کی نہ شرم کساں

غرضکہ خوب لوٹ مار ھوئی - شاہ نے باھر خیمہ نصب کیا - اتنے میں یہ خبر پہنچی ' کہ جھنکو اور ملھار راؤ نے آپس میں اتحاد کرکے نار نول پر ڈیرہ ڈالا ھے - پھر وھاں سے شکست کھا کر بھاگا - ” اُس کے بعد جاٹوں کے قلعہ کو شکشت دي گئی اور کول (علی گڈھ) کا قلعہ دوندے خاں نے فتح کر لیا - مگر اس قلعہ کو عجب ترکیب سے فتح کیا - غباروں میں بارود کے گولے رکھہ کے اُڑایا - جو قلعہ میں جاکے گرے اور جب اُسے دیکھنے کو سپاھي جمع ھوئے تو بارود میں آگ لگی اور وہ گولے پھٹنے لگے اس طرح غباروں سے قلعہ میں آگ لگا دی - آخرکار ساکنان قلعہ نے امان طلب کی اور قلعہ خالی کردیا -

وقائع ششم ''رسیدن ھرکارہ دردکھن خبر رسانیدن نانھا جیو از ھزیمت جھنکو و غماز الدین خاں و روانہ شدن بھاؤ جی ویسواس راؤ بمقابلہ شاہ درانی '' -

پیشوا نے جب سنا کہ جھنکو کو شکست ھوئی اور وزیر نے بادشاہ کو قتل کیا تو وہ کس درد و رنج سے کہتا ھے کہ -

سنا آج ہندستان کی سر گذشت
جہلکو غاز دین خاں نے کھائی شکست
دیکھو غاز دین خاں کی عقل تباہ
مارا شاہ اپنا نپٹ بیگناہ
اس اندیشہ سوں ہوتا ہوں ناتواں
کریں گے مجھے طعن پیر و جواں
غریبوں کی جاگہ نہ چھوڑا کہیں
زبردست سوں کچھہ بس آتی نہیں

غرضکہ پیشوا کا بھائی بھاؤ بافوج گران معہ فرزند پیشوا وسواس راؤ روانہ ہوا - غازی الدین نے شاہجہاں ثانی کو قید کر دیا - اور عالی گہر کو تخت پر بٹھایا - مرہٹوں نے کنجپورہ پہنچ کر قطب شاہ صمد خان کو ابراہیم خان گاردی کے توپ خانہ سے معہ فوج کے شہید کردیا - اور ایک سردار مسمی نجاب خان کو زندہ گرفتار کر لیا - احمد شاہ ابدالی نے یہ خبر سنی تو بہت افسوس کیا ' اور دریائے جمنا کو فوراً معہ فوج عبور کیا - اس خبر کو سن کر بھاؤ ' وسواس رائے اور ابراہیم خان گاردی نے مشورہ کی مجلس منعقد کی اور بھاؤ کی رائے سے یہ طے پایا کہ فوج کو ایک بڑا لشکر بنا کے گھیر دیا جائے ' اور اُس کے اندر سے توپ خانہ کی مار کی جائے - یہ لشکر شہر پانی پت اور گوہانہ کے درمیان بنایا گیا - گویا ایک قلعہ بنا لیا - کئی روز تک دونوں طرف سے گولہ باری رہی - اور رسد رساں دستوں میں آپس میں لوٹ مار ہوتی رہی -

وقائع ہفتم "برآمدن مرہٹہ از لشکر و جنگ کردن شاہ درانی و کشتہ شدن بھاؤ ویسواس راؤ و فتح یافتن شاہ درانی" -

چونکہ مرہٹہ لشکر کے اندر محصور ہوگئے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ کچھہ روز میں رسد آنی بند ہوگئی اور جو کچھہ باقی تھا وہ بھی سب کھا پی گئے گھوڑوں اور آدمیوں کے مرنے سے بیماری پھیلی - فاقہ سے سب تنگ آگئے - آخرکار مجبوراً مرہٹوں کی یہ حالت ہوگئی کہ :—

دیکھیں خواب میں لقمہ دیتا کوئی
جو جاگے تو ہے مشت خالی ہوئی
سمجھہ خواب کوں تب بہت روتے
اُس حسرت ستیں جان کو کھوتے
ہوئے کہتے بے آب و دانہ فنا
تڑپتے پڑے جو رہے ما لقا
کہا لوگوں نے بھاؤ بھائی ستیں
نہیں طاقت اب بینوائی ستیں
اگر مرنا ہے تو نکل کے مرو
نہیں کوچ کر شہر دہلی چلو

مرہٹے لشکر سے باہر نکل آئے اور ابراہیم خاں گاردی کے توپ خانہ نے آفت بپا کردی -

کہا شاہ نیں تب بمبردان دیں
بعربی زبان أقتل المشرکین

رزم بہت خوب لکھی ہے - اور واقعتاً یہ معرکہ ایسا ہی تھا کہ زبانِ قلم سے اس کا بیان بہت مشکل ہے - بہ‌خوف طوالت فی‌الحال اسے نظر انداز کیا جاتا ہے - لڑائی بہت سخت ہوئی دو لاکھہ آدمی مارے گئے - حتیٰ کہ -

فلک نے کہا بس کہو اے شاہ دیں
برابر مرے مت کرے اب زمین

ابراهیم خان گاردی گرفتار ہوا تو :—

کہا شاہ نے تب کہ اے بوالفضول
نمانا ترس کچھ خدا و رسول
قتل کیوں کیا کنجپورہ آن کر
ایسا کوئی کرتا مسلمان پر
کفر سوں تعجب نہیں سرکشی
نہ تھی تجھکوں لازم برادر کشی

مرہٹوں کو کامل شکست ہوئی - اور احمد شاہ ابدالی سجدۂ شکر بجا لایا - اس کے بعد مزار ولی الہند حضرت بو علی شاہ قلندر کے اندر جاکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ یہاں آکے چھپے تھے اُن کے سر کسی غیبی تلوار نے کات ڈالے تھے - احمد شاہ نے خود کھڑے ہوکر درگاہ کو دھلوایا اور فاتحہ پڑھا - اور پھر ملک کا انتظام کرکے واپس ولایت چلا گیا -

---

یہ ہے خلاصہ اس رزمنامہ کا جس میں مختلف اس قسم کے واقعات ملتے ہیں جو موجودہ انگریزی تواریخ سے بالکل مختلف ہیں - اس کے علاوہ اس جنگ میں متعدد مقامات پر ایسے واقعات پیش آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی تک ہندو مسلمان محض مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے - اور گو مرہٹوں میں احساس قومیت پیدا ہوگیا تھا لیکن وہ بھی دہلی کے تاجدار کو قابل عزت ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا جائز فرمانروا سمجھتے تھے -

ثنا کی شاعری

یاد رکھنا چاہئیے ' کہ جس زمانے میں ثنا نے یہ رزمنامہ لکھا ہے وہ ریختہ کا ابتدائی زمانہ تھا اور بعد میں جتنے شعرا گزرے اُنہوں نے ایرانی شاعری کی صوری و معنوی تقلید کی - جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری فطری نہ رہی - تقلید کی کورانہ بے راھہ روی میں پڑکر گُل و بلبل نرگس و سنبل اور آب رکنا باد و گلگشت مصلے ھی یاد رہ گئے - نہ ھندوستان میں کوئل دکھائی دی ' نہ آموں کی بہار نہ کنول دکھائی دئے نہ گنگ و جمن کی وادیاں - لیلا اور شیریں تو سب کو یاد رھے - مگر وہ دیویاں جنھوں نے ساوتری اور سیتا کا جامۂ ھستی پہن کر خراب آباد ھند کو منور کردیا تھا اُن کی طرف سوائے حزین کے کسی کا ذھن منتقل نہوا شاعر کہتا ھے اور بہت خوب کہتا ھے کہ :—

در محبت چون زنِ ھندی کسے مردانہ نیست

سوختن بر شمع مردہ کارِ ھر پروانہ نیست

لیکن ثنا کی شاعری میں آپ یہ دیکھیں گے کہ فارسیت کا اثر غالب ھونے کے باوجود اُنہوں نے خالص ھندوستان کی چیزوں سے فطری شاعر کی طرح اثر پذیری کی ھے - ملاحظہ فرمائیے -

قصبہ کراری کی تعریف میں کہتے ھیں :—

او دیوان عالم کا ھے انتخاب

بوا نورتن میں زمرد خوش آب

ھے سر سبز او تازہ از آدانت
بسر ما و گرما ھمیشہ بسنت
ھے گلزار بستی و ھم مرغزار
گویا حوض کوثر بھرے چشم سار
کھڑے گرد اشجار طوبی سرشت
دیا حق نیں (نے) پر کالۂ از بہشت
دے جاتی طرح اوس زمین سوں خزاں
کبوتر جیوں کعبۂ دو جہاں

(یعنی وھاں خزاں نہیں آتی جس طرح کعبہ میں کبوتر نہیں جاتے)

راو جھلکو نے پنجاب فتح کرلیا ھے - اس کی خوشی میں جشن ھو رھا ھے - یہاں جو حالت دکھائی ھے وہ کتنی فطری اور پر کیف ھے - فردوسی نے بھی جو شاعری کی ھے اُسمیں اھل نظر صرف دو چیزوں کو دیکھتے ھیں ایک رزم دوسرے بزم - ثنا کی بزم ملاحظہ فرمائیے - (خط کشیدہ الفاظ ھندوستانی تشبیہ و استعارہ کو ظاھر کرتے ھیں) -

کي خاطر جمع ملک کے کام سوں
بٹھے جشن میں بہت آرام سوں
کہا میرے خاصے مصاحب بلا
او جامے کا شیشہ و ساغر لیا
بلا اب جوھیں مطربِ دکھنی
الاپیں بلا سازھا راگنی
میں مختار ھوں اب ھندستان پر
جیونکہ باغبان ھے گلستان پر

تب ساقی لے آیا دو آتش شراب
کہ تھی بہت خوشبو و ہم رنگ آب

(ملاحظہ فرمائیے ہندی شراب پانی کی طرح تھی - شراب ارغوانی نہ تھی) -

مغنّی چلے سازھا لیکے سنگ
تنبورے و قانون او بین چنگ
کوئی لے کمانچہ رباب ارغنوں
کوئی دھمد ھمیں - ڈھولکیں - جھن جھنو
کوئی دف - دوتارہ کوئی جلترنگ
کوئی تال مردنگ مہور مورچنگ
ہوا راستہ سب چلیں کنچنی
چھوڑیں مکھہ اوپر زلف کی ناگنی

(ملاحظہ فرمائیے کنچنیاں جارہی ہیں - ساقی بچے نہیں ہیں اور منہ پر زلف کا مار نہیں ہے ناگنی ہے - جسکے کاٹے کی لہر نہیں) -

گوندہ او شانہ کر خوب موئے سیاہ
لیا شب نے گویا سورج کی پناہ
رکھا فرق نازک بسر با شکوہ
ندی بہ چلی درمیانِ دو کوہ
پہن سر او پر مور اور مورنی
چمکتا زمرد و ہیرا چنی
پہن بالیاں اور ٹیکا سجا
کرنپھول بھی خوب موتی ٹکا

ایسا زیب رخ گوشوارہ ہوا

گویا متصل ماہ تارا ہوا

باندھا جب گلوبند او چھبکلی

کلی زر کی گویا بنی سر کھلی

پہنا بدّھیاں سب جڑاؤ گہر

پہنا گنج خوبی اوپر مار زر

(ہندوستان میں مشہور ہے کہ خزانہ کے اوپر ناگ دیوتا بیٹھ جاتے ہیں اور حفاظت کیا کرتے ہیں) -

سجا بازو بند اور جہانگیریاں

او پاؤں میں پازیب چوراسیاں

لیا پہن انگلیوں میں انگشتری

ملی پنجۂ ماہ سے مشتری

لگایا پشانی میں غازہ شتاب

نمودار تھا قوس پر آفتاب

کھنچا آنکھوں میں سرمہ دنبالہ دار

کنول میں چھپے بچگاں سیاہ مار

ملا رخ پہ گلگلونہ کوں بید رنگ

عرق آگیا گل کتیں دیکھ رنگ

رکھا خال مشکین زنخدان پر

سیہ زاغ بیٹھا گلستان پر

(ہندوستان میں کالی بکری - کالا کوا - کالے تل صدقے میں دئے جاتے ہیں اور خال مشکین بھی حسن کو دو بالا کرنے کے علاوہ

نظر بد سے بچانے کے کام آتا ھے - اس لئے سیه زاغ سے تشبیه دي گئی ھے) -

دیا لب و دنداں کوں اک پان سوں
لیا آب یاقوت مر جان سوں
کیا سرخ ھاتھوں کو مہندي رچا
شفق نے لیا دیکھه کر منه چھپا
ازاریں پہن پاؤں میں خلنجری
اوپر سر بسر سب لباس زری
پہن زرو زیور جھمک کر چلیں
گویا رات کوں شعلۂ آتشیں
کیا زیب مجلس کی نزدیک شب
ھوا تھات عشرت کا موجود سب
رکھا پہلے آگے گـزک او نقل
اوتھا ساقی لے ساغر و شیشه مل
کیا پر بہت مے ستیں جام کوں
پلاؤ نے لگا بادہ خود کام کوں
کیا ساقی نے جب پیاله رواں
ھوئے مست مجلس کے پیرو جواں
کہا مطربوں سوں که کھینچو صدا
زباں پر لیاؤ تو آئیں ادا
لیا مطربوں نے سمجھه راز کوں
تہاو کر بجانے لگے ساز کوں

الاپ کـر کے آھلگھا تان کی
کھلنچا راگنی شیام کلیان کی
جو دیکھا محـو ھـوگئی انجمن
لگی بول نے کا نہوا او یمن
یمن میں لگی بول نے ھولیاں
بتاؤنے لگیں بھاؤ سب لو لیاں
تھرک کے اوٹھیں او لگیں ناچنے
لگے گت سٹیں گھونگرو باجنے
ھوا رقص میں دور دامن رواں
جہاز حسن کا کھل گیا باد باں
معلق زناں چرخ - یکپائے سوں
جیوں پھرتی ھے گرداب دریائے سوں
موافق بجیں ساز او دستکیں
اوٹھا ھاتھ کر تیں او را وکتکیں
کھچیں ناز سوں رخ اوپر اوڑھنی
سـرج پـر دمکتی گویا دامنی
اوٹھائیں تھیں جب ھاتھ کو انگ انگ
لگا دور دل کھینچے جیوں پتنگ
کہا راگنی سب محبت اساس
لگا سـور تھا بـوقت بھبھاس
ھوئی مستی جھلکو کوں مے تان کی
بٹھے گویا شاھی پہ ملتان کی

اک دولت سے ہیں مست متوالہ تھا

دوبالا نشہ رقص او پیالہ تھا

ہندو مسلم تعلقات

مندرجۂ بالا بزم کے نمونے کے علاوہ اور بھي بزم کے نمونے ہیں - اور رزم بھی کافی پر زور ہے - معاشرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا اس رزمنامے سے پتہ چلتا ہے - مثلاً اُس زمانے مَیں ہندوستان میں کیا رسمیں تھیں - ہندوستانیوں کا طرز زندگی کیا تھا - اور عورتوں کا اُس سوسائٹی میں کیا درجہ تھا - انگریزي کمپنی کا دہلی اور مضافات میں کیا اثر تھا - اور عام حالت تجارت و صنعت و حرفت کی کیا تھی - لیکن جس چیز پر اس رزمنامے سے مخصوص طور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے - کہ اُس زمانے میں یہاں ہندو مسلم سوال نہیں تھا - اور احمد شاہ ابدالی کی لڑائی ہندوؤں سے نہ تھی بلکہ مرہٹہ قوم سے تھی - لیکن یاد رہے کہ مرہٹوں کے ساتھہ خود عمادالملک غازي‌الدین خان کی پوری امداد تھی - اور پنجاب سے آدینہ بیگ کی دعوت پر مرہٹوں نے حملہ کیا تھا - سندھیا کے علاوہ ابراہیم خان گاردی ہی وہ سر دار تھا جس نے روہلہ پٹھانوں کے آٹھہ ہزار سپاہیوں کو قتل کرنے کے بعد میدان سے منہ نہیں موڑا اور آخر کار ابدالیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر قتل ہوا - یہ بھی واضح رہے کہ با وجودیکہ مرہٹوں کو پوري حکومت حاصل ہوگئی تھی اور اُنہوں نے دہلی کو بھی فتح کرلیا تھا لیکن تیموري نسل کے نام نہاد بادشاہ کو تخت سے نہیں اُتارا ' نہ موجودہ زمانہ کے پرو پا گنڈا کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ اورنگ زیب کي اولاد سے انتقام لیا جائے -

حتی کہ تاریخ شاہد ہے کہ جس غلام قادر نے شاہ عالم کی انکھیں نکالیں تھیں اُسکا سر کاٹ کے خود سندھیا نے بادشاہ کے قدموں میں ڈالا تھا حالانکہ سندھیا مرہٹہ تھا اور غلام قادر اور شاہ عالم دونوں مسلمان تھے - واقعہ یہ ہے کہ یہ جنگ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہ تھی بلکہ ہندوستانیوں اور افغانوں کی تھی - ہندوستانیوں کے لیڈر مرہٹے تھے لیکن ان کا عین وقت پر راجپوتوں اور جاٹوں نے ساتھ چھوڑ دیا - اور جنگ بھی اس غرض سے نہیں تھی کہ دھلی کا تخت لیا جائے - بلکہ افغان لوٹ مار کے اپنے ملک کو واپس چلے گئے اور ہندوستان میں پھر وہی نام نہاد اور کمزور سلطنت تیموریہ باقی رہ گئی - ہندو - مسلمان - مرہٹے - جاٹ غرضکہ جملہ اقوام ہند بادشاہ دھلی کو اپنا جائز بادشاہ سمجھتی تھیں - اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُس وقت کی آپس کی لڑائی بھڑائی سے ملک کی تجارت صنعت و حرفت کو فائدہ ہی پہنچتا تھا - ہاں بیرونی ممالک کے باشندے جو دولت لوٹ مار یا تجارت کے ذریعہ سے لیجاتے تھے اُسے آپ ہندوستان کا فائدہ سمجھئے یا نقصان یہ آپ کی سمجھ پر منحصر ہے -

بہر حال ثنا نے جن اشعار میں ہندو مسلم مسئلہ کی تشریح کی ہے وہ درج ذیل ہیں -

عنوان ہے " مناجات کردن بدرگاہ باری تعالیٰ جل شانہ بشفاعت ائمہ معصومین " اس میں ائمہ کے واسطے سے اس طرح دعا مانگی گئی ہے :—

ز طفلی تری حُب ہے بیچ جان

نجانا ترے بن کوئی ایزدان

لیا پیچھا تیرا میں اے دستگیر
کرم مت کرے مجھ پہ آتش سعیر
او ہر لیاے میری تو یک آرزو
کہ اس میں ترستا خلق مو بمو
مسلط کر اولاد تیموریہ
دے آرائش این عالم صوریہ
ہوا ہے حدیقہ جہاں خار خار
کرم سوں لیا ایک نو آئین بہار
پھولے لہلہا ہند کی سبز باغ
ہوں افسردگاں لب معطر دماغ

رزمنامہ کے آخری اشعار ہیں :—

ہوئے شاہ ہندوستاں سوں بدا
چلے پھر طبل باز گشتی بجا
خدایا فضل کر ہندستان پر
جہاں لگ ہنود و مسلمان پر

غرضکہ دعا یہی ہے کہ اولاد تیموریہ تخت پر رہے اور ہندو اور مسلمان پر خدا اپنا فضل کرے - کتنا اچھا زمانہ تھا - نہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے - نہ یہاں کے تمدن و معاشرت پر لڑائیوں کا کچھہ اثر ہوتا تھا ہندوستان کی زندگی تھی جو اپنے پر سکون فلسفۂ ہمہ اوست میں محو تھی - اُسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ فرنگی آیا یا افغان گیا حتیٰ کہ اب تک دیہاتوں میں باوجود تغیر زمانہ اور انقلاب عظیم کے آپ دیکھیں گے کہ کسان اپنی وہی پرانی زندگی بسر کر رہا ہے - اور اس کے لئے سوائے اپنی روزی کمانے اور قسمت پر شاکر

رهنے کے اور کوئی مشغلہ نہیں ہے - ضرورت ہے کہ فلسفۂ ویدانت اور فلسفہ عمر خیام کا مقابلہ کیا جائے - اس لئے کہ خیام شاید نئے الفاظ میں وہی بات اس طرح کہتا ہے :---

در یاب کہ از روح جدا خواہی رفت
در پردۂ اسرار خدا خواہی رفت
مے خور کہ ندانی ز کجا آمدۂ
خوش باش ندانی کي کجا خوا ھي رفت

"دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے اسباب"

(از پروفیسر محمد حبیب الرحمان - ایم - اے - علیگ)

(۴)

اب ہم معاشی قومیت کے ایک اور دلچسپ مظہر یعنی تجارتی مسلک کی طرف متوجہ ہوں گے - ہر شخص یہ جانتا ہے کہ تجارت کا انحصار تقسیم عمل کے اصول پر ہے اور تقسیم عمل کے فوائد بالکل بدیہی اور ناقابل انکار ہیں - بجائے اسکے کہ ہر شخص اپنی ضرورت کی تمام اشیاء خود تیار کرے ' یہ زیادہ مناسب ہے کہ مختلف لوگ مختلف کاموں کے لئے مخصوص ہو جائیں اور اپنی اپنی پیداواروں کا آپس میں مبادلہ کرکے اپنی ضروریات پوری کریں - اِس طور پر کیا بلحاظ مقدار اور کیا بلحاظ خوبی کام بہتر طور پر انجام پاتے ہیں اور جو انسانی جماعتیں اِس اصول پر عامل ہوتی ہیں انکا معیار زندگی بہ مقابل دوسری جماعتوں کے جو اُسپر عامل نہیں ہوتیں ' بہت بلند ہوتا ہے -

اِس اصول کا اطلاق جس طرح ایک ہی ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے ' بالکل اُسی طرح مختلف ممالک کے مابین بھی کیا جاسکتا ہے - ہر ملک ہر چیز کی پیدایش کے لئے مساوی طور پر موزوں نہیں ہے بلکہ خاص خاص ملک خاص خاص چیزیں نسبتاً بہتر اور ارزاں تیار کرسکتے ہیں - ایسی حالت میں بحیثیت مجموعی تمام دنیا کی دولت میں ' اور فرداً فرداً ہر ہر ملک کی خوشحالی میں ' کثیر سے کثیر اضافہ کرنے کی بدیہی صورت یہ ہے کہ ہر ایک ملک اپنے آپ کو صرف

اُن چیزوں کی پیدایش کے لئے مخصوص کردے جن کے لئے وہ گوناگوں اسباب کی وجہ سے موزوں ترین واقع ہوا ھے اور اپنی ضرورت کی بقیہ چیزیں دوسرے ممالک سے جو اُن کی پیدایش کے لئے خاص طور پر موزوں ھیں ' بذریعہ مبادلہ حاصل کرے - اسی مبادلہ کو اصطلاح میں تجارت خارجہ یا تجارت بین‌الاقوام کہتے ھیں -

موجودہ زمانے میں جبکہ ذرائع آمد و رفت کی ترقی کی بدولت دنیا کے دور دراز ممالک ایک دوسرے سے قریب اور قریب تر ہوتے جا رھے ھیں ' اقتضائے عقلمندی یہ ھے کہ بنی نوع انسان تقسیم عمل کے اصول سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ھو تجارت داخلہ اور خارجہ دونوں کو ایسے راستوں پر لگائے جس سے دنیا میں کثیر سے کثیر خوشحالی پھیل سکے - تجارت داخلہ کی حد تک تو دنیا اس اصول کی صداقت کو تسلیم کر چکی ھے اور ھر ملک اس بات کی پوری پوری کوشش کرتا ھے کہ نہ صرف تجارت کے راستے سے ھر قسم کی رکاوٹ کو دور کرے بلکہ جہانتک ممکن ھو مال و اسباب کے نقل و حمل میں سہولتیں پیدا کرے لیکن جونہی تجارت خارجہ پر اس اصول کا اطلاق کرنے کی کوشش کیجاتی ھے ' معاشی قومیت کے جذبات اپنا اثر دکھانے لگتے ھیں اور لوگ ایسی بدیہی حقیقت کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرنے لگتے ھیں - ھمارا منشاء یہاں تجارت آزاد اور تامین تجارت کے موافق و مخالف دلائل پر بحث کرنا نہیں ھے - اس کی نہ یہاں گنجائش ھے اور نہ ضرورت - البتہ یہ عرض کردینا ضروری ھے کہ باوجود اُن عارضی اور جزئی مستثنیات کے جن سے معاشین کو انکار نہیں ھے ' اس اُصول کی عام

صداقت میں اب تک کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں کہیجاسکتی اور نہ آئندہ اس کی کوئی توقع نظر آتی ہے -

لیکن گزشتہ نصف صدی کی معاشی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اس اثنا میں دنیا کی تقریباً تمام آزاد قومیں نہایت پابندی کے ساتھہ اِس اصول کی خلاف ورزی کرتی رہی ہیں اور اپنی عملداری کے اندر اکثر ایسے کاروبار جاری کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں جو بغیر حکومت کی امداد کے کبھی اپنے آپ نہ جاری ہوسکتے تھے اور نہ قائم رہ سکتے تھے - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کئی ممالک، ایک ہی قسم کا مال و سامان اپنی اپنی ضروریات سے کہیں زیادہ تیار کرنے لگے اور اس کی وجہ سے ہر ایک کو اپنے مال کے لئے بازار اور اُس کی تیاری کے لئے خام پیداوار حاصل کرنے میں روز افزوں دقّت محسوس ہونے لگی - لیکن جنگ سے پہلے تک یہ دقّتیں اِس حد تک نہیں پہونچ سکی تھیں کہ ان اقوام کو اپنے تجارتی مسلک کی غلطی کو تسلیم کرنے پر مجبور کرسکیں ' اور اِس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ایشیا اور افریقہ کے کمزور ممالک اِن طاقتور آزاد قوموں کی دقّتوں کو بہت کچھہ حل کر دیتے تھے - ایک طرف تو وہ اُن کی مصنوعات کے لئے وسیع بازار مہیا کر دیتے تھے اور دوسری طرف اِن مصنوعات کے لئے طرح طرح کی خام پیداواریں فراہم کردیتے تھے - اگرچہ جنگ کے پہلے ہی سے اِس انتظام کے بنیادی نقائص ظاہر ہونے لگ گئے تھے ' تاہم کسی نہ کسی طرح کام چل رہا تھا ' اور اگر جنگ واقع نہ ہوتی تو شاید اور چند سال تک یہ کیفیت برقرار رہ سکتی - لیکن جنگ عظیم نے اس شعبے میں بھی بعض ایسے تغیرات پیدا کر دئے ہیں جن کی بدولت یا تو مختلف اقوام کو اپنے قدیم تجارتی مسلک میں بہت کچھہ تبدیلی

کرنا پڑیگی اور یا انہیں تجارت بین الاقوام کے گوناگوں فوائد سے محروم ہوکر ایک ادنی معیار زندگی پر قانع ہونا پڑیگا - جنگ عظیم کے جو نتائج خاص کر تجارتی مسلک کے نقطۂ نظر سے ہمارے لئے غور طلب ہیں وہ حسب ذیل ہیں -

اول تو خود یورپ میں جنگ کی بدولت کئی ایک چھوٹی چھوٹی آزاد حکومتیں قائم ہوگئیں - اب ان میں سے ہر ایک نے اُسی " معاشی قومیت " کے جذبے کے زیر اثر اپنے اپنے حدود کے اندر ہر قسم کے زرعی اور صنعتی کاروبار جاری کرنے شروع کئے عام ازیں کہ وہ کاروبار اُن کے قدرتی اور دوسرے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے موزوں ہوں یا نہ ہوں - چونکہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہ کاروبار اپنے آپ قائم نہ رہ سکتے تھے ' اِس لئے اِن نئی حکومتوں نے کچھہ جوش وطنیت میں اور کچھہ اپنی نئی حاصل کردہ آزادی کو جتلانے کے خیال سے غیر ممالک کے مال پر اعلی اعلی شرحوں سے محصول در آمد لگانا شروع کیا - یہ مسلک جو نسبتاً بڑے ممالک کے حق میں ہی باوجود اُن کے وسیع اثرات کے سخت تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا ' اِن ذرا ذرا سی کمزور ' قرضدار اور محدود وسائل والی قوموں کے لئے صریحاً نا قابل عمل ثابت ہونے لگا - وجہ صاف ظاہر ہے - آج کل اکثر و بیشتر کاروبار اُسی وقت نفع بخش ثابت ہوتے ہیں جبکہ انہیں بڑے پیمانے پر چلایا جائے اور بڑے پیمانے پر چلانے کے لئے تین چیزوں کی خاص طور پر ضرورت ہے ' ایک سرمایہ دوسرے وسیع بازار ' تیسرے کثیر مقدار میں خام پیداوار - اِن چھوتے چھوتے ممالک کو اِن میں سے ایک بات بھی نصیب نہ تھی - سرمایہ تو انہوں نے اعلی شرح سود کا لالچ دیکر بعض دوسرے ممالک سے قرضوں کی شکل میں ایک حد تک حاصل کرلیا ' لیکن مال کی نکاسی کیلئے

بازار نہ ملنے کی وجہ سے یہ قرضے اُن کے حق میں غیر پیدا آور قرضے بن گئے اور کاروبار کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ روز بروز گرانبار ہوتے گئے - اِس حیرانی کے عالم میں اِن ملکوں نے یہ سوچ کر کہ کم از کم اپنے اپنے ملکی بازار ہی محفوظ کرلیں ' بیرونی ممالک کے مال کی در آمد پر اور زیادہ شرحوں سے محصول لگانا شروع کیا - گویا صورت یہ پیدا ہوگئی کہ ہر ملک اپنا مال تو بیچنا چاہتا ہے لیکن دوسروں کا مال خریدنا نہیں چاہتا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ محض ایک مجنونانہ حرکت ہے ' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تجارت بین‌الاقوام کا پورے طور پر خاتمہ ہوجائیگا -

جنگ عظیم کا ایک اور قابل لحاظ اثر یہ ہوا کہ اُس کی بدولت اکثر ایشیائی ممالک کو ' جو اب تک صرف یورپی اقوام کے معاشی اغراض و مفاد کی تحصیل کا ذریعہ بنے ہوئے تھے ' اپنے مفاد کو سمجھنے اور اُسے موثر طور پر جتلانے کا موقع مل گیا - بعض ایشیائی اقوام نے تو اپنے آپ کو یورپ کے سیاسی اور اسی وجہ سے معاشی اثر سے بالکل آزاد کرلیا ' لیکن جو ایسا نہ کرسکے وہاں بھی کچھہ تو زمانے کے بدلے ہوئے تخیلات اور کچھہ سیاسی ہلچل نے ایسی صورت پیدا کردی کہ اب وہاں یورپ کے اغراض و مفاد کو خود اہل ملک کے اغراض و مفاد پر ترجیح دینے کی بہت کم گنجائش رہگئی - نتیجہ یہ کہ یورپ والوں کے بڑے بڑے کاروبار جو محض وسیع ایشیائی بازاروں کے برتے پر چل رہے تھے ' اب روز بروز غیر نفع بخش ثابت ہوتے جارہے ہیں - مزیدبرآں جن ایشیائی ممالک میں جنگ کے خاص حالات کے زیر اثر نئی نئی صنعتیں قائم ہوگئیں ' وہاں فطرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اب کہیں بیرونی مقابلے کی وجہ سے تباہ نہ ہوجائیں لہذا

اعلیٰ اعلیٰ شرحوں سے غیر ممالک کی در آمدوں پر محصول لگائے جاتے ھیں -

جنگ عظیم کا ایک اور بڑا نتیجہ ریاستہائے متحدۂ امریکہ کی حالت کی تبدیلی ھے - ھم اس سے قبل یہ معلوم کر چکے ھیں کہ کیونکر جنگ کی بدولت ریاستہائے متحدہ کی حیثیت بجائے قرضدار کے ایک بڑے قرضخواہ ملک کی ھوگئی - تجارتی مسلک کے نقطۂ نظر سے بھی یہ تبدیلی بہت اھمیت رکھتی ھے - دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک کی طرح ریاستہائے متحدہ کا مالی مسلک بھی قدیم سے تامینِ تجارت رھا ھے - جبتک اِس ملک کی حیثیت ایک قرضدار کی سی تھی ' یہ مسلک اُس کے لئے چنداں ناموزوں نہیں تھا ' کیونکہ اُس زمانے میں وہ دوسرے ممالک سے زیادہ مال خریدتا اور اپنا مال کم فروخت کرتا تھا ' اور اِس طرح جو زائد قیمت واجب‌الادا ھوتی اس کے لئے باھر سے قرضہ لیا کرتا تھا - جنگ کے زمانے میں صورت حال بالکل اس کے برعکس ھوگئی : اب دوسرے تمام ممالک کثرت سے اُس کے قرضدار ھیں اور اس پر طرّہ یہ کہ اب وہ اپنا مال زیادہ فروخت کرنا اور دوسروں سے کم خریدنا چاھتا ھے - جنگ کے بعد چند سال تک تو یوں کام چلتا رھا کہ امریکہ کو جس قدر رقوم واجب‌الادا ھوتی تھیں انھیں وہ قرضے کے طور پر پھر یورپ والوں کے حوالے کر دیتا تھا - لیکن جب بعض وجوہ سے یہ سلسلہ بھی بند ھوگیا تو اب بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں ھے کہ وہ یا تو مال و اسباب کی شکل میں اپنے قرضے واپس لے یا پھر ھمیشہ کے لئے اپنے قرضوں سے ھی ھاتھہ دھو بیٹھے - معاشی قومیت کا دراصل یہ ایک بہت دلچسپ نتیجہ ھے -

(۵)

دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے سلسلے میں ہم یہ اکثر سنتے ہیں کہ زراعت پیشہ طبقوں پر اِس کساد بازاری کا خاص طور پر سخت اثر پڑا ہے - اِس واقعہ کے اسباب کا مختصر بیان یہاں بے محل نہ ہوگا -

ابھی تک یہ خیال بہت عام تھا کہ سائنس کی ترقی اور مشین کے استعمال کی بدولت انسان کی قوت پیدا آوری میں جو غیر معمولی اضافہ گزشتہ ایک صدی کے اندر ہوا ہے وہ صرف صنعت و حرفت تک محدود ہے - زراعت کے متعلق یہ خیال تھا کہ اِس کارو بار کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اُس میں نہ سائنس کے انکشافات سے کوئی خاص فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور نہ مشین کے استعمال کی زیادہ گنجایش ہے ۔ اِس بنا پر کئی مرتبہ پیشین گوئیاں کی گئیں کہ زرعی پیدا واروں کی قیمتیں مصنوعات کی قیمتوں کے مقابلے میں لازمی طور پر بڑھ جائینگی کیونکہ زراعت ' پیدائش بہ پیمانہ کبیر کے اِن تمام فوائد سے محروم ہے جو صنعت و حرفت کے کارو بار کو بدرجۂ اُتم حاصل ہیں - لیکن یہ پیشین گوئیاں کبھی پوری نہیں ہوئیں - حقیقت یہ ہے کہ پیدائش دولت کے جدید طریقوں نے جس طرح صنعت و حرفت کے کارو بار میں انقلاب پیدا کردیا ہے ' اُسی طرح زرعی کارو بار بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے اور یہ کیفیت بیسویں صدی کے آغاز سے بہت زیادہ نمایاں ہوگئی ہے - زراعت کے مختلف شعبوں میں اب مشینوں کا استعمال روز افزوں ہے - جنگ سے پہلے تک صرف دنیا کے نو آباد ممالک مثلاً کناڈا ' اور آسٹریلیا میں یہ رجحان زیادہ نظر آتا تھا لیکن اب تو قدیم ممالک میں بھی

یکے بعد دیگرے زراعت کے قدیم طریقے متروک ہوتے جارہے ہیں اور بڑے پیمانوں پر مشینوں سے زراعت کرنے کا رواج پھیلتا جا رہا ہے - اسکے علاوہ سائنس کی روز افزوں معلومات سے بھی زراعت کے ہر ایک شعبے میں وسیع پیمانے پر استفادہ کیا جا رہا ہے : مصنوعی کھادوں کے ذریعے سے زمین کی قوت پیداآوری کو بڑھانا ' عمدہ تخم پیدا کرکے مختلف پیداواروں کی خوبی میں اضافہ کرنا ' آبپاشی کے ذرائع کی توسیع سے نئی نئی زمینوں کو قابل کاشت بنانا ' مویشیوں کی نسلوں کو طرح طرح سے سدھارنا اور زرعی پیداواروں کو بغیر اُن میں کوئی خرابی پیدا ہوئے دور دراز ممالک تک روانہ کرنا ' ان تمام امور میں سائنس کی تحقیقات سے جو غیر معمولی امداد آجکل حاصل کیجارہی ہے ' اسکا علم ممکن ہے عام طور پر نہ ہو لیکن اُس کے نتائج روز افزوں زرعی پیداواروں کی شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں - اشیائے خوراک کی کمی کے سبب بنی نوع انسان کا قحط کی مصیبتوں میں مبتلا ہونا ' کبھی اس قدر بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا تھا جتنا کہ وہ آج کل نظر آتا ہے - دنیا کو آجکل جو شکایت ہے وہ زرعی پیداواروں کی قلت کی نہیں بلکہ اُنکی اِفراط کی ہے ' حالانکہ ابھی اکثر و بیشتر ممالک میں زراعت انہیں قدیم ' غیر کار گزار اور ناقص طریقوں سے کیجارہی ہے - جب ہندوستان اور چین جیسے وسیع اور زرخیز ممالک بھی اِن جدید طریقوں سے کام لینے لگینگے تو نہ معلوم خداکی یہ عجیب و غریب مخلوق اپنے خالق کی اِن گوناگوں نعمتوں پر کسقدر واویلا مچائیگی -

مصر کے قدیم افسانوں میں ایک قصہ مذکور ہے جسکا بیان یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا - سنا ہے کہ گیہوں جو اب صرف بالوں میں

پیدا ہوتا ہے ' کسی زمانے میں درخت کے سرے سے لیکر زمین تک برابر اُگا کرتا تھا - ایک مرتبہ کسی عورت کا بچہ دریائے نیل کے کنارے کیچڑ میں گرگیا - ماں نے بچے کو صاف کرنے کیلئے مٹھی بھر گیہوں توڑلیئے - دیوتاؤں کو بڑا غصہ آیا کہ نالائق انسان انکی نعمتوں کو اس طرح ضائع کرے - انھوں نے بال کو چھوڑ کر پودے کے باقی تمام حصے کو گیہوں اُگانے کے نا قابل بنادیا تا کہ اناج کی قلت ہوجانے سے حضرت انسان کو اُسکی قدر معلوم ہو - جیسا کہ سر آرتھر سا لٹر نے اِس قصے کے ضمن میں بیان کیا ہے ' ممکن ہے سائنس کے انکشافات کی بدولت ہم دوبارہ اس نعمت کو دیوتاؤں سے حاصل کرلیں لیکن اس عجیب و غریب دنیا میں جہاں افراط کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگ اور مفلس ہوجاتے ہیں ' اِس کھوئی ہوئی نعمت کا دوبارہ حاصل ہوجانا سردست ہماری مشکلات میں اور اضافہ کر دیگا -

مختصر یہ کہ گزشتہ چند سال سے غلہ اور اجناس کی پیداوار میں تو غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے - لیکن اُن کی طلب میں اُسی مناسبت سے توسیع نہیں ہوئی ہے - اور یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں - انسان کو اشیائے خوراک کی بلا شبہ سخت ضرورت ہے لیکن یہ ضرورت بہت تھوڑی مقدار سے رفع ہو جاتی ہے اور انسان ضرورت سے زیادہ اِن چیزوں کا خواہشمند نہیں ہوتا - کیونکہ جیسا کہ آدم اسمتھ مدتوں قبل کہہ چکا ہے شکم انسانی کی وسعت بہت محدود ہے - دوسری اشیاء کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے - جس قدر آپ اُنکی سر براہی کیجئے اسیقدر وہ " ھل من مزید " پکارتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ جوں جوں مصنوعات میں توسیع اور اُن کی قیمتوں میں تخفیف ہوتی ہے ' اُنکا بازار بھی اُسی مناسبت سے وسیع ہوتا جاتا ہے ' پرانے

خریدار پہلے سے زیادہ مقداریں خریدتے ھیں اور جو لوگ اب تک خرید نہیں سکتے تھے وہ خریدار بنتے جاتے ھیں - زرعی پیداواریں اور خاصکر اشیائے خوراک بدیہی طور پر اِس صفت سے محروم ھیں ' نتیجہ یہ کہ بہ حیثیت مجموعی اُن کی طلب میں بجز اضافۂ آبادی کے کوئی بڑی توسیع کی گنجائش نہیں بلکہ بعض اوقات یہ دیکھا گیا ھے کہ جیسے جیسے آمدنی بڑھتی اور معیار زندگی بلند ہوتا ھے ' گیہوں اور چاول جیسی اھم اشیاء کا صرف کم ھونے لگتا ھے ' کیونکہ انکی جگہ لوگ زیادہ تعیشانہ غذائیں استعمال کرنے لگتے ھیں (مثلاً ریاستہائے متحدہ میں ہر سال جو گیہوں کا آتا استعمال ھوتا ھے اسکی مقدار سنہ ۱۸۸۹ع میں تو فی کس ۲۲۴ پونڈ تھی لیکن سنہ ۱۹۲۹ع میں وہ گھٹ کر ۱۷۵ پونڈ ھوگئی تھی اِسکے علاوہ اجناس کی طلب میں تخفیف واقع ھونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ھے کہ جانوروں کی قوت محرکہ سے کام لینے کا طریقہ وز بروز متروک ھوتا جاتا ھے - پہلے قوت محرکہ کا انحصار اجناس پر تھا ' اب وہ پٹرول پر ھے - نتیجہ یہ کہ وھی مشینیں جو ایک طرف زمین کی پیداواروں میں اضافہ کر رھی ھیں ' دوسری طرف اِن پیداواروں کے استعمال میں تخفیف کا سبب بن رھی ھیں ' ابتک جو زمینیں جانوروں کیلئے خوراک اُگا یا کرتی تھیں وہ بھی اب انسان کی غذا پیدا کرنے لگي ھیں اور مکا اور گیہوں جیسی اشیاء کی مقدار رسد میں اسوجہ سے بھی بہت کچھہ اضافہ ھوگیا ھے - اِن گوناگوں اسباب کا نتیجہ یہ ھے کہ ایک طرف زرعی پیداواروں کی رسد میں غیر معمولی اضافہ ھوگیا ھے اور دوسري طرف اُن کی طلب میں کوئی نمایاں توسیع نہیں ھورھی ھے - اِسلئے اگر یہ دنیا کی کساد بازاری واقع نہ ھوتی ' تب بھي زرعی پیداواروں کی قیمتیں گرتیں ' لیکن اِس کساد بازاري کی

وجه سے یہ تخفیف اور زیادہ ہوگئی ہے اور زراعت پیشہ طبقے کی قرضداری
اُسکے حق میں اور زیادہ گرانبار ہوگئی ہے -

(۲)

دنیا کی موجودہ کساد بازاری کے جو اسباب ابتک ہم نے بیان کئے
ہیں ' اُنمیں سے کچھہ تو طریق سرمایہ داری کی ماہیت میں مضمر
ہیں اور کچھہ اُس عظیم‌الشان خلل اندازی کا نتیجہ ہیں جو گزشتہ
جنگ کی بدولت قوموں کے معاشی اور سیاسی تعلقات میں واقع ہوئی
ہے - لیکن ایک مدت تک اِن اسباب کا اثر دنیا کے زرعی اور قرضدار
ممالک تک محدود رہا اور ان ممالک میں بھی اُنکا اثر ہمیشہ یکساں
طور پر شدید نہیں رہا - بلکہ گزشتہ پندرہ سال کے عرصے میں بعض
بعض وقفے ایسے واقع ہوئے جبکہ بجائے کساد بازاری کے کاروبار میں خوب
چہل پہل رہی اور جنگ کی بدولت تجارت خارجہ کے جو انتظامات درہم
برہم ہوگئے تھے ' وہ بہت بڑی حدتک دوبارہ سدھر گئے اور یہ محسوس
ہونے لگا کہ دنیا بہت جلد نہ صرف جنگ کے نقصانات کی تلافی کر لیگی
بلکہ معاشی ترقی کے ایسے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوجائیگی جنکا جنگ سے
قبل وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا - ریاستہائے متحدہ اور فرانس
چونکہ ایک مدت تک کساد بازاری کے اثرات سے محفوظ تھے اِسلئے اِن
ممالک اور خاصکر ریاستہائے متحدہ میں یہ رجائیت سب سے زیادہ
نمایاں تھی - ریاستہائے متحدہ کی معاشی حالت میں جنگ کی بدولت
جو تغیر واقع ہوا ' اُسکا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ' اب اُسی تغیر کے ایک
ذیلی نتیجے کی طرف ہمیں متوجہ ہونا ہے - ہمارا اشارہ سنہ ۱۹۲۸ع
اور سنہ ۱۹۲۹ع کی اُس عجیب و غریب گرم بازاری کی طرف ہے جو
ریاستہائے متحدہ کے صرافے میں واقع ہوئی اور جسکی وجہ سے یہ کساد بازاری

ایک تو عالمگیر بنگنی یعنی جو ممالک اُسوقت تک اسکے اثرات سے محفوظ تھے وہ بھی اسکی زد میں آگئے ' دوسرے خود یہ اثرات اور زیادہ شدید ہوگئے اور اُن کی اصلاح میں اور زیادہ اُلجھنیں پیدا ہوگئیں -

انگریزی زبان کے (Speculation) کے لفظ سے اکثر لوگ واقف ہیں ' اُردو میں اس کا ترجمہ " تخمین " کیا گیا ہے - اب ایک ایسی سوسائٹی میں جس کی معاشی زندگی کی بنیاد سرمایہ داری کے طریقے پر ہو تخمین کے ذریعے سے ایک بہت ضروری معاشی کام انجام پاتا ہے : وہ یہ کہ بسا اوقات عارضی اسباب کے اثر سے یا عام خریداروں اور فروشندوں کے غلط اندازے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں غیر معمولی کمی بیشی واقع ہونے لگتی ہے - ایسی حالت میں بعض اشخاص ایسے آنکلتے ہیں جو اپنی خاص معلومات اور دیرینہ تجربے کی بناء پر تغیرات قیمت کے عارضی اور دیر پا اسباب میں امتیاز اور بازار کی حالت کا صحیح اندازہ کر لیتے ہیں اور اپنی اِس واقفیت سے یوں نفع کماتے ہیں کہ جب بازار میں قیمتیں ناواجبی طور پر گرنے لگتی ہیں تو وہ خریدار بنجاتے ہیں اور جب قیمتیں ناواجبی طور پر چڑھنے لگتی ہیں تو وہ فروشندوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں ' اور اِس طور پر ارزاں خرید کر گراں فروخت کرنے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے ' وہی ان کی محنت کا معاوضہ ہے - اگرچہ یہ لوگ بہ ظاہر کوئی دولت نہیں پیدا کرتے بلکہ محض عوام کی ناواقفیت یا یوں کہئے کہ اپنی خاص واقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تاہم اِسمیں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ ہماری موجودہ سرمایہ دارانہ تنظیم معیشت میں ایک بہت ضروری فرض انجام دیتے ہیں ' کیونکہ بازار میں اُن کے موجود ہونے سے اشیاء کی قیمتوں میں بار بار بڑے بڑے تغیرات نہیں

واقع ہونے پاتے اور قیمتوں کی کمی بیشی خاص خاص حدود کے اندر محدود رہتی ہے اور اُن سے متجاوز نہیں ہونے پاتی - معاشی کاروبار کے لئے قیمتوں کی یہ استقامت جسقدر مفید اور ضروری ہے ' اس کی تشریح کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے - لیکن یہی تخمین جو ہمارے نظام معیشت کے لئے اِس قدر ناگزیر ہے ' بعض اوقات اِس طور پر استعمال کیجاسکتی ہے کہ اُس سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچنے لگے اور انتظام معیشت بجائے برقرار رہنے کے اور درہم برہم ہوجائے اور یہ صورت بالعموم اُس وقت واقع ہوتی ہے جبکہ عام لوگ جو بازار کے اصلی حالات سے ٹھیک طور پر واقف نہیں ہوتے ' تخمین میں حصہ لینے لگتے ہیں ' یا تخمین کے کاروبار کرنے والے واقف‌کار اشخاص بددیانتی سے کام لینے لگتے ہیں - بدقسمتی سے اِس قسم کی نامناسب اور ضرر رساں تخمین کا ایک حیرتناک واقعہ سنہ ۱۹۲۹ع میں ریاستہائے متحدہ میں واقع ہوا - لیکن اُس کا اثر صرف اُسی ملک تک محدود نہیں رہا بلکہ تمام یورپ اور کم و بیش ساری دنیا میں اب تک اس کے اثرات اپنا کام کر رہے ہیں یہ ہم معلوم کرچکے ہیں کہ جنگ عظیم سے قبل ریاستہائے متحدہ نسبتاً کم دولتمند اور بہ حیثیت مجموعی ایک قرضدار ملک تھا - اس کے برعکس مغربی یورپ کے ممالک نسبتاً زیادہ دولتمند اور بڑے سرمایہ‌دار تھے جنکا سرمایہ دنیا کے گوشے گوشے میں لگا ہوا تھا - جنگ کے بعد حالت بالکل بدل گئی اب ریاستہائے متحدہ کی حیثیت تو ایک بہت بڑے قرضخواہ ملک کی ہوگئی اور یورپ کے تمام ممالک اُس کے قرضدار بنگئے - مزید برآں جس اثناء میں اہل یورپ آپس میں مصروف پیکار تھے ' ریاستہائے متحدہ نے اپنی صنعت و حرفت کو خوب ترقی دی اور جہاں جہاں یورپ والوں کا

مال فروخت ہوتا تھا ، وہاں ریاستہائے متحدہ کے قدم جمنے لگے - جنگ کے بعد بھی یورپ والوں کی حالت تو چار سال کی خونریزی اور جان و مال کی تباہی سے بے حد پست ہوگئی تھی لیکن ریاستہائے متحدہ باوجود آخری زمانے میں شریک جنگ ہونے کے بہت خوشحال تھیں - ممالک یورپ اپنی شکستہ صنعتوں اور تباہ شدہ زراعت کو درست کرنے میں طرح طرح کی دقّتیں محسوس کر رہے تھے اور خاصکر شکست خوردہ جرمنی تو کلیتاً ریاستہائے متحدہ کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہا تھا - اپنی شکستہ حالت کی اِصلاح اور تاوان جنگ کی ادائی دونوں کے لئے وہ کثرت کے ساتھہ قرضے لے رہا تھا اور ان قرضوں کا اکثر و بیشتر حصہ ریاستہائے متحدہ ہی سے آرہا تھا - برطانیۂ عظمیٰ اگرچہ بہ حیثیت مجموعی قرضخواہ تھا لیکن وہ بھی ریاستہائے متحدہ کا قرضدار تھا - اُس کے اکثر و بیشتر بازار غیر ممالک اور خاصکر ریاستہائے متحدہ اور جاپان کے قبضے میں چلے گئے تھے اور اِن بازاروں پر دوبارہ تسلط قائم کرنے میں اُسے گوناگوں مشکلات پیش آرہی تھیں - فرانس کی مشکلات اگرچہ اِس قدر سخت نہ تھیں تاہم وہ بھی ریاستہائے متحدہ کا قرضدار تھا - مختصر یہ کہ یورپ کے اِن بڑے بڑے ممالک کی تباہ حالی اور ساتھہ ہی اپنی معاشی حالت کی غیر معمولی ترقی کو دیکھکر اہل امریکہ کو اپنی کامیابی پر گھمنڈ نہیں تو کم از کم یہ خیال ضرور پیدا ہوگیا تھا کہ اعلیٰ معیارِ زندگی حاصل کرنے کا ایسا گُر ان کے ہاتھہ لگ گیا ہے جو دوسری قوموں کو نصیب نہیں اور قدرت اُن کے حال پر کچھہ ایسی مہربان ہے کہ وہ جس کام میں ہاتھہ ڈالتے ہیں ، انہیں توقعات سے زیادہ کامیابی نصیب ہوتی ہے - غرض رجائیت کی ایک لہر تھی جو اِس ملک میں دوڑگئی تھی اور اُس کے آثار

معاشي زندگی کے اکثر و بیشتر شعبوں میں نمایاں تھے - انھوں شعبوں
میں سے ایک شعبہ Stock exchange یعنی صرافے کے کار و بار کا
ہے - چنانچہ اس پر بھی گرد و پیش کے حالات کا اثر پڑنا شروع
ہوا - لوگ نہایت اشتیاق کے ساتھہ کمپنیوں کے حصے خریدنے لگے
اور اِن حصوں کی قیمتیں فوراً چڑھنی شروع ہوئیں - محض اس امید
پر کہ مال خوب فروخت ہوگا ' کاروبار فروغ پائیں گے اور کارخانے نفع
کمائیں گے ' لوگ اِن گوناگوں قسم کے حصص اور تمسکات کی بڑہ بڑہ کر
قیمتیں دینے لگے اور جسقدر خریداروں کا یہ اشتیاق بڑھا ' اُسی قدر
قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا - جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ بغیر کسی
جد و جہد کے روز بروز زیادہ دولتمند بنتے چلے جا رہے ہیں تو فطرتی
طور پر اُن کے قمار بازي کے رجحان کو اور تحریک ہوئی اور اہل امریکہ
نے عقل کو بالائے طاق رکھہ ' آنکھیں بند کر کے ایسا جوا کھیلنا شروع کیا
جس کی تاریخ عالم میں کہیں نظیر نہیں ملتی - بیس بیس فیصدی
شرح سود پر قرض لے لیکر لوگ ایسے کارخانوں کے حصے خریدنے لگے جن کا
ابھی کوئی وجود بھی نہ تھا ' اور یہ محض اس امید پر کہ یہ کارخانے
جب قائم ہوجائیں گے تو اُن کا مال خوب بکیگا اور اُنھیں خوب منافع
حاصل ہوگا - امریکہ میں بنک کاري کا نہایت عمدہ انتظام قائم تھا
تاکہ کاروباری اغراض کے لئے قرضے کے لین دین میں سہولت ہو - لیکن
یہی سہولت اِس زمانے میں جبکہ ملک بھر میں تخمین اور قمار بازي
کی وبا پھیلی ہوئی تھی ' ملک کے حق میں بہت خطرناک ثابت
ہوئی - ہر شخص کا حقیقی پس انداز تو جو تھا وہی قائم رہا لیکن
اُس کے قابل فروخت تمسکات کی قیمتیں روز بروز بلکہ لمحہ بہ لمحہ
بڑہ رہی تھیں اور ان بڑھتی ہوئی مالیت کے تمسکات کی ضمانت پر وہ

اپنے بنک سے مزید قرض لیتا اور اِس رقم سے مزید تمسکات خریدتا تھا - لوگوں کو یوں راتوں رات دولتمند بنتا دیکھکر بہت سے اشخاص جو یورپ کے حاجتمند ممالک کو قرضے دے رہے تھے ' اب اپنی رقمیں خود ملک کے اندر تمسکات کی خرید و فروخت میں لگانے لگے اور سابقہ قرضے واپس طلب کرنے لگے - یہی نہیں بلکہ خود ممالک یورپ کے دولتمند اشخاص بھی ایک حد تک اِس وبا سے اثر پذیر ہوئے اور انہوں نے بھی دولتمند بننے کی اس سہل ترکیب سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی رقمیں بجائے اپنے ملک کی شکستہ حالت کی اصلاح میں لگانے کے کثرت سے امریکہ روانہ کیں اور اِس طرح پر یہ جنوں پھیلتے پھیلتے تمام بڑے بڑے سرمایہ دار ممالک پر حاوی ہوگیا اور ایک اچھا خاصہ مذاق طریق سرمایہ داری کے مخالفین کے ہاتھ آگیا -

بحر اٹلانٹک کے ایک جانب تو تخمین کی یہ گرم بازاری تھی اور لوگ یوں لمحہ بہ لمحہ دولتمند بنتے چلے جارہے تھے لیکن اُسی کی دوسری جانب یورپ اور خاص کر جرمنی میں حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی - جنگ اور شکست کے مصائب کو رفع کرنے اور اپنی سابقہ معاشی حالت پر لوٹنے میں جرمنی نے جو ہمت اور مستعدی دکھائی وہ بلا شبہہ ہماری تعریف کی مستحق ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ ساری جد و جہد قرض لی ہوئی رقموں پر منحصر تھی حتیٰ کہ فاتح متحدین اپنے شکست خوردہ دشمن سے اب تک جسقدر تاوان جنگ وصول کرسکے وہ بجز آخری دو ایک قسطوں کے سب کا سب انہی نام نہاد فاتحین سے قرض لے لے کر ادا ہوا ہے ' گویا یوں سمجھئے کہ اِدھر فاتحین نے اپنی رقمیں ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل کردیں اور اُدھر جرمنی کا تاوان جنگ ادا ہوگیا - اِس کے علاوہ

جرمنی نے اپنی صنعت و حرفت کو درست کرنے اور اُن میں دوبارہ جان ڈالنے کے لئے جو کثیر رقمیں قرض لیں ' وہ علیحدہ ہیں - مختصر یہ کہ جنگ کے بعد دس سال کے اندر اندر وسط یورپ میں جو دوبارہ معاشی ہلچل پیدا ہوگئی تھی وہ سراسر قرض لی ہوئی رقموں کے بل بوتے پر قائم اور اُنھی پر جاری تھی ' اور اِن رقموں کا اکثر و بیشتر حصہ صرف ریاستہائے متحدہ سے حاصل کیا ہوا تھا - اب جو امریکہ میں تخمین کی وبا پھیلی تو قرضوں کا یہ سلسلہ بند ہوگیا - پچھلے قرضے نہایت شدت کے ساتھ واپس طلب کئے جانے لگے اور خود یورپ والوں کا سرمایہ بھی امریکہ ھی کی طرف جانے لگا - جنگ کی بدولت زر کے معاملات اور بنک کاری کے انتظامات میں جو سخت بدنظمی پیدا ہوگئی تھی ' وہ کئی سال کی پریشانی اور بڑی دقتوں کے بعد اب رفع ہوئی تھی اور معمولی حالات رفتہ رفتہ دوبارہ عود کر رہے تھے لیکن یورپ کے مرکزی بنکوں سے یکایک کثیر رقمیں باھر نکلنے لگیں تو صورت حال پھر خطر ناک ہوگئی - اپنے اپنے ذخیروں کو بچانے کے لئے اِن بنکوں نے سود کی شرحوں میں اضافہ کرنا شروع کیا ؛ تاکہ لوگ اپنی رقمیں واپس نہ طلب کریں بلکہ اعلی شرح سود کے لالچ میں اُنھیں کے ھاں رکھہ چھوڑیں - اِس ترکیب سے اصل مقصد تو حاصل نہیں ہوا ؛ کیونکہ رقمیں برابر نکلتی ھی رھیں ' لیکن پیدایش دولت کے کاروبار میں سخت رکاوٹ پیش آنے لگی - سود کی شرح بڑھنے سے مصارف پیدایش بڑھنے لگے اور کارخانوں کے لئے نفع کمانے کا امکان روز بروز کم ہونے لگا - جو کاروبار مشکل سے چل رہے تھے وہ بند ہونے شروع ہوئے ؛ اور جو نسبتاً اچھی حالت میں تھے اُن کی حالت خراب ہونے لگی اور اس طور پر یورپ میں کساد بازاری کا دور شروع ہوا - لیکن امریکہ میں جب تک لوگ مجنونانہ طور پر حصص

کي خرید و فروخت میں مشغول رھے ' انھیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ کیونکر دوسرے ممالک کي بھلائی اور برائی کے ساتھہ خود اُن کی بھلائی اور برائی وابستہ ھے ' بلکہ وہ اس دلخوش کُن خیال میں مست رھے کہ دوسرے ممالک کی تباھی کا اُن پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا " جب تک مناسب معلوم ہوا ہم نے یورپ والوں کو قرض دیا - اب جو خود اپنے ھی ملک میں نفع کمانے کا ایسا زرین موقع پیدا ہوگیا ھے تو کوئي وجہ نہیں کہ ہم اپنا سرمایہ اُسی طرح باہر روانہ کرتے رھیں یا اپنے قرضداروں سے پچھلے قرضے واپس نہ طلب کریں - اگر یورپ والے تباہ ھیں تو وہ اپنے کرتوت کا خمیازہ بھگت رھے ھیں ' اور اگر ہم خوشحال ھیں تو یہ ھماري عقلمندي یا شاید خدا کی غیر معمولی عنایت کا نتیجہ ھے " یہ ھے خلاصہ اُس طرز کا جو سنہ ۱۹۲۹ع تک اھل امریکہ نے دوسرے تمام ممالک اور خاص کر اھل یورپ کے ساتھہ اختیار کر رکھا تھا - اخلاقي نقطۂ نظر سے اُس کی پسندیدگی یا غیر پسندیدگی سے ھمیں کوئی سروکار نہیں لیکن واقفیت کے نقطۂ نظر سے ہم یہ ضرور کہہ سکتے ھیں کہ یہ طرز عمل اصل صورت حال کے سراسر منافی تھا - کیونکہ اُس کی بدولت نہ صرف یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا بلکہ خود اھل امریکہ سخت مصیبت میں مبتلا ہوگئے - ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ع کو تمسکات کی خرید و فروخت کی گرم بازاری کا خاتمہ ہوگیا - جو لوگ راتوں رات دولتمند بن رھے تھے وہ اب آن واحد میں دیوالیے ہوگئے - جن کاغذ کے پرزوں پر لوگ اپنی دولتمندی کي عمارت تعمیر کر رھے تھے ' وہ اب کوڑیوں کے مول بکنے لگے - جن بنکوں نے انھیں پرزوں کی ضمانت پر اپنے گاھکوں کو اس احمقانہ تخمین میں قسمت آزمائی کرنے کے لئے قرضے دئے تھے ' وہ اب کاروبار

بلند کرنے پر مجبور ہوگئے - کسی کو دوسرے کا اعتبار نہیں رہا - جو کارخانے زیر تعمیر تھے ' وہ ادھورے رہ گئے اور جو مکمل ہوگئے تھے وہ اب سرمایہ نہ ملنے کی وجہ سے جاری نہ رہ سکتے تھے - بیکاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور اِس اضافہ کے ساتھہ ساتھہ کساد بازاری کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہونے لگا - حتیٰ کہ اب دنیا کا شاید ہی کوئی خطّہ ایسا موجودہ ہو جو دنیا کی اِس کساد بازاری کے مایوس کن اثرات سے پورے طور پر محفوظ سمجھا جاسکے - برٹش ایسوسی ایشن کے ایک حالیہ اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں سر آلفرڈ اِیونگ نے بڑی سچی بات کہی ہے - وہ فرماتے ہیں : —

"The command of nature has been put into man's hand before he knows how to command himself"

دنیا کی موجودہ معاشی مشکلات کی شاید ہی اِس سے بہتر کوئی توجیہہ ہوسکے -

---

هندوستان کے شمال مغربی سرحد کا سائنٹفک مسئلہ

(از مسٹر بشیشر پرشاد ایم - اے)

ملک کی حفاظت کا سوال ایک اهم سوال هے ' اسلئے هر حکومت کا یہ فرض هوتا هے کہ اپنے ملک کی سرحد پر نظر رکھے اور اسکو خوب مضبوط رکھنے کا انتظام کرے ' اس کام کے لئے یہ ضروری هے کہ سرحد ایسی قائم کی جائے کہ اسکی جغرافیائی حیثیت (پہاڑ اور دریا وغیرہ) کے ذریعہ دو ملکوں کا فرق صاف صاف ظاهر هوجائے - پہاڑ یا دریا دو ملکوں کو صرف الگ هی نہیں کر دیتے بلکہ ملک کی حفاظت کے لئے بھی کار آمد ثابت هوتے هیں - اونچے اونچے پہاڑ دشمنوں کی مداخلت کو روکتے هیں اور ملک کی فوج کو یہ موقع دیتے هیں کہ آسانی سے اپنی سہولت کے مطابق دشمنوں کا مقابلہ کرسکے - اگر کہیں همالیہ کا سا برف آلود پہاڑوں کا سلسلہ موجود هو تو باهر سے دشمنوں کا آنا تقریباً نا ممکن هے ' همارے ملک کی سرحد قدرت نے خود هی مقرر کردی هے - دکھن ' پچھم اور پورب کے بڑے حصے سمندر سے گھرے هوئے هیں اور اسکے خشکی کے راستوں کا غیر ممالک سے کوئی تعلق نہیں هے - شمال میں پامیر سے لیکر پورب کی طرف تقریباً پندرہ سَے میل لانبی آسام کی پہاڑیوں تک برف سے ڈھکی هوئی اونچی همالیہ کی دیوار هے جو سنتری کی طرح باهر سے آنے والے دشمنوں کو روکے هوئے هے - اس دیوار میں کہیں کہیں درے هیں ' لیکن چونکہ برف سے ڈھکے هوئے هیں اسلئے فوجی نقل و حرکت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں هیں -

یہ پہاڑوں کا سلسلہ شمال مغرب اور شمال مشرق میں نیچا ہو جاتا ہے اور چھوٹی نیچی پہاڑیاں ہی نظر آتی ہیں - ان پہاڑیوں کے بیچ میں کافی راستے ہیں جنکے ذریعہ صرف سیاح ہی نہیں بلکہ فوج بھی آسانی سے آجا سکتی ہے ' اسلئے جتنے حملے وسط ایشیا سے ہمارے ملک پر ہوئے ہیں ' اسی شمال مغرب کے کوہستانی راستے سے ہوئے ہیں - یہ سارا راستہ تقریباً تیرہ سو میل لمبا ہے اور شمال میں گلگھت سے لیکر جنوب میں سمندر تک چلا جاتا ہے - اسکے شمالی حصے میں پہاڑ اونچے اور درے کم ہیں اور جنوبی حصے میں چھوتی پہاڑیوں پر رتیلی بے آب زمین ہے ' صرف وسط حصے میں کچھہ ایسے درے ہیں جنکے ذریعہ باہر سے دشمن آسکتے ہیں اور اِسی کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے - اگر یہ راستے نہ ہوتے تو سرحد اور اسکی حفاظت کا سوال اتنا اہم اور پیچیدہ نہ ہوتا -

فتح پنجاب کے بعد حکومت برطانیہ کے سامنے بھی یہ مسئلہ آیا ' کیونکہ اب دریائے سندھ کے مغرب میں پیشاور ' کوہات اور بنو وغیرہ مقامات اسکے زیر اثر آگئے تھے ' دریائے سندھ کی گھاتی کی مسطح زمینوں پر جب انگریزی اقتدار قائم ہوگیا تو شمال مغربی پہاڑیاں ہی ملک کی سرحد بنیں ' کچھہ جنوب میں سندھ کا صوبہ پہلے ہی قبضے میں آگیا تھا - اور وہاں کے انگریز حکام مغرب میں کوہستانی او رتیلی زمینوں پر رہنے والی بلوچی قوموں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے اور اسطرح انہیں وہاں کی جغرافیائی حالت سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی تھی - بلوچی ' مرئی ' بغتی وغیرہ جرگوں پر آسانی سے کامیابی حاصل کرلینے سے ان حکام کو یقین ہوگیا کہ آگے بڑھنے میں زیادہ دشواریاں حائل نہ ہونگی چنانچہ وہ افغانستان کی سرحد تک بڑھنے کے لئے حکومت برطانیہ پر زور دینے لگے ' لیکن پنجاب کے حکام

کو اس حد تک خود اعتمادي نہ تھي اور حالات کے مختلف ہونے کے باعث شروع میں وہ پٹھان قوموں سے کوئي تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے ' غدر کے کچھہ زمانے کے بعد تک یہ حالت قائم رہی -

اسی زمانے میں وسط ایشیا میں روسی مملکت کی ترقی بہت تیزي سے ہو رہی تھی اور ہر سال ایک نہ ایک خود مختار سلطنت اسکی فتوحات کا شکار ہو رہی تھي - سمرقند ' تاشقند اور بخارا (۱۸۶۸ع) اسکے مطیع ہوگئے تھے اور وہ خیوا اور جنوب مغرب میں مرو کی طرف بڑہ رہا تھا - مرو پر روس کا اثر ہوجانے سے افغانستان کے لئے خطرہ تھا اور ساتھہ ہی ہندوستان پر بھی روسی حملے کا امکان تھا - روس کی مملکت آہستہ آہستہ افغانستان کی طرف وسیع ہو رہی تھی اور اسکا زیادہ زور اس ملک کے شمال مغربی گوشے پر تھا - حکومت روس نے ' فوج اور سامان حرب لیجانے کے لئے ریل تیار کرلی اور یہ لائین افغانستان کي سرحد کیطرف بڑھتی آرھي تھی ' ایسي حالت میں امیر افغانستان خوف زدہ ہوا اور ہندوستان کي سرکار برطانیہ بھی اس طرح کے حملے کے امکان کا اندیشہ کرنے لگی -

اندیشے کے لئے کافي وجوہ تھے ' پہلے زمانے میں جتنے حملہ آور وسط ایشیا سے اس ملک میں آئے تھے وہ افغانستان ہوکر اور خیبر یا بولن کے دروں سے گزر کر یہاں پہونچے تھے لیکن افغانستان میں ہر طرف آسان راستہ نہ تھا ' کوہ ہندو کش ' مشرق میں پامیر سے لیکر مغرب میں ہرات تک پھیلا ہوا ہے اور شمال سے آنے والے دشمنوں کو روک سکتا ہے ' با وجود اسکے کہ دروں کی تعداد کم نہیں ہے تاہم اس پہاڑ کو طے کرنا ہر فوج کے لئے دشوار ہے ' کیونکہ یہ درے ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور اونچے بھی ہیں ' صرف شمال مغرب میں پہاڑ کے نیچے ہوجانے

سے اور دریاؤں کی گھاٹیوں کے باعث راستہ ملجانا ممکن ہے - اس لئے روسی افواج کے لئے اگر اس کا مقصد کابل یا ہندوستان پر حملہ کرنا تھا تو صرف ایک ہی راستہ باقی رہگیا تھا وہ کشکی اور ہرات کے پاس سے تھا ' ہرات سے قندھار ہوکر بولن تک ' یا غزنی اور کابل ہوکر خیبر پر دھاوا بولنا کوئی مشکل بات نہ تھی - اس لئے ہرات کی طرف سے روسی مملکت کے بڑھنے سے حکومت ہند کا خائف ہونا قدرتی تھا - اس دقت کو دور کرنے اور دشمن کے آنے کا خوف ہٹانے کے لئے اُنیسویں صدي عیسوی میں کئی برسوں تک ایک نئی حکمت عملی سے کام لیا گیا جو سرحدی مسئلہ کی سائنٹفک پالیسی کے نام سے مشہور ہے -

لارنس کے وائسرائے ہونے سے تقریباً آٹھہ برس قبل سندہ کے حاکم جیکب نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا ' اس کی رائے یہ تھی کہ '' اپنی سرحد کے اندر کسی دوسری یوروپین طاقت سے جنگ کرنے میں ہماری شہرت میں فرق آئیگا ' کیونکہ ہم اپنی پوری طاقت کو کام میں نہ لاسکینگے ' اگرچہ وہی طاقت باہر نکل کر لڑنے سے فتح کے لئے کافی ہوگي........ہندوستان پر شمال مغرب سے حملہ کرنے کے لئے صرف دو راستے ہیں ' یعنی خیبر اور بولن کے دروں سے ہوکر ' ہمارے قلعے اور چوکیاں ان تمام دروں کے اُس طرف واقع ہیں ' خیبر کے پاس پشاور میں اور بولن کی طرف جیکب آباد میں ' اور پشاور میں رہ کر درے پر ہم اپنی نظر رکھہ سکتے ہیں لیکن اپنی حفاظت کے لئے جیکب آباد سے ہمیں آگے بڑھنا ہی پڑیگا........اس کے لئے پہلی ضرورت تو یہ ہوگی کہ ہم کوئٹہ پر قبضہ جمالیں اور درۂ بولن تک رہیں ' اور وہاں سے کوئٹہ تک ایک اچھی سڑک بنائیں - خیبر اور بلوچستان میں

قیام کرکے افغانیوں کو روپیہ دیں اور امن کے ساتھہ ہرات پر قبضہ کریں ' کویٹہ میں اچھی چھاونی ہونے سے اور ہرات کے قلعہ میں بیس ہزار سپاہی رکھکر ہم صرف بولن کے راستے ہی کو نہ بند کرلینگے بلکہ ممکن ہے کہ خیبر کی طرف جاتے ہوئے دشمن کی فوج پر حملہ بھی کرسکیں ' اس حالت میں ہندوستان پر ہمارا کامل قبضہ ہوسکے گا " - [۱]

اس نئي حکمت عملی کا جو آگے چل کر سرحد کی سائنٹفک پالیسی کے نام سے مشہور ہوئی یہیں سے آغاز ہوتا ہے - جیکب نے سنہ ۱۸۵۶ع میں کیننگ سے اس پر عمل در آمد کی استدعا بھی کی لیکن اُس زمانے میں اسکا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا ' کیونکہ لارڈ کیننگ نے اسے قبول نہیں کیا ' تاہم یہ خیال قائم رہا اور آگے چلکر اس پر عملدر آمد بھی ہوا - جیکب اور اس کے دوسرے ہمخیالوں کی یہ خواہش تھی کہ کویٹہ میں چھاونی ہوجائے جس سے حفاظت کے نقطۂ خیال سے ہندوستان کی سرحد چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے آگے شمال مغرب تک پہونچ جائے ' کویٹہ پر قبضہ ہوجانے سے قندھار پر بھی اثر ہوسکتا تھا اور ہرات کي طرف سے روس کے امکانی حملوں کو کامیابی کے ساتھہ روکا جاسکتا تھا -

کچھہ زمانے کے بعد لارڈ اِلگن کی وفات پر بارٹل فریرے نے نئے وایسرائے کے غور کے لئے ایک چٹھی بھیجی جس میں اُنھوں نے نئے اصول پر عملدر آمد کرنے کے لئے لکھا ' لیکن اتفاق سے لارنس تازہ حکمران ہوکر آیا اور وہ اس نئے اصول کا سخت مخالف تھا ' لارنس کي حکمت

---

[1] Lewis Pelly, "Suggestions towards the Permanent Defence of N. W. Frontier of India"—Views of Gen: John Jacob, pp. 345—354.

عملی تحکمانہ بے عملی[۱] کہی جاتی ھے ' اسکا خیال تھا کہ روسی فوج اس ملک پر کبھی حملہ نہیں کرسکتی ھے کیونکہ راستے میں افغان لوگ اس کی مزاحمت کرینگے اور اگر بدقسمتی سے وہ ھماری سرحد تک پہونچ بھی گئی تو دریاے سندہ کے ساحل پر اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ھے ' وہ بھی دریاے سندہ کو ھندوستان کی قدرتی سرحد مانتا تھا اور اس کے کنارے قلع بناکر دشمن کو روکنا چاھتا تھا اسی کے ساتھہ وہ امیر کابل سے دوستی رکھنے کا موید تھا ' لیکن اس کو جنگی امداد دینے اور ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کا موقع دینے کا قائل نہ تھا - اس کے زمانۂ حکومت میں اس امر کی کوئی اُمید نہ تھی کہ اس نئی حکمت عملی کے مطابق کوئی کام ھوسکے گا ' اور سنہ ۱۸۶۸ع سے قبل روس کا ' اتنا خطرہ بھی نہ تھا - دوسری بات لارنس ھی کے زمانے میں (۱۸۶۶ع) سر ھنری گرین نے بھی جیکب کی طرح کویٹہ پر قبضہ کرلینے کی تجویز کی اور چاھا کہ وھاں تک ریل بن جائے ' اس تجویز سے بمبئی کا گورنر سر بارطل فریرے بھی متفق تھا ' اب سیاسی حالات میں تبدیلی پیدا ھوجانے سے گرین کے بیان میں بہت کچھہ صداقت نظر آنے لگی ' سلطنت روس میں بہت وسعت پیدا ھوگئی تھی اور سنہ ۱۸۶۵ع میں تاشقند پر بھی اس کا قبضہ ھوجانے سے اُس طرف سے خطرہ بھی بڑہ گیا تھا ' لیکن لارنس نے گرین کی تجویز کو منظور نہیں کیا ' وائسراے کی کاونسل کے دوسرے ممبر بھی آگے بڑھنے کے خلاف تھے اسلئے اس مرتبہ بھی سائنٹفک سرحد کی حکمت عملی کوئی عملی جامہ نہ اختیار کر سکی -

---

Policy of "masterly inactivity"—[۱]

اس مقصد کی ایک تیسری تجویز ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۶۸ع کے ایک خط کے ذریعہ سر ہنری رالنسن نے ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں پیش کی ' جس کی ایک نقل غور کرنے کے لئے حکومت ہند کے پاس بھی آئی [۱] - اس سے قبل افغانستان میں تخت کے لئے خانہ جنگی شروع ہوگئی تھی اور شیر علی اور اس کے بھائیوں نے حکومت ہند سے اپنے اپنے لئے مدد چاہی ' لیکن لارنس نے کسی کو مدد نہ دی اور جو کوئی بھی کچھہ زمانے کے لئے کابل کا حکمران ہوجاتا تھا اُسی کو وہ امیر تسلیم کرلیتی تھی اس سے اس کا یہ مطلب تھا کہ افغانستان کے جھگڑے میں نہ پڑے اور امیر اور وہاں کی رعایا سے دوستی قائم رکھے اور وہاں کے خانگی جھگڑوں سے سروکار نہ رکھے ' یہ حکمت عملی اُس ملک اور اُس زمانے کے حالات کے اعتبار سے اچھی تھی لیکن اس سے ایک نقصان بھی تھا افغانستان روز بروز کمزور ہوتا جارہا تھا جس سے وہ روس کے اقدام کو روکنے کے ناقابل ہوتا جاتا تھا ' اس سے تو ہر فریق متفق تھا کہ افغانستان سے دوستی اور اس کی طاقت بھی روس کے مقابلے سے ہندوستان کو بچا سکتی ہے ' فرق صرف اس قدر تھا کہ لارنس وغیرہ وہاں کی سیاست میں مداخلت کئے بغیر دوستی چاہتے تھے اور دوسرا فریق اپنے مطیع دوست کو تخت پر بٹھا کر مالی اور جنگی امداد دیکر امیر کو اپنے ہاتھہ میں لینا چاہتا تھا تاکہ روس سے مقابلہ کرنے میں کبھی کابل کی طرف سے کوئی شبہ باقی نہ رہے - رالنسن نے اپنی چٹھی میں لارنس کی حکمت عملی کی خامیوں کو دکھاکر لکھا تھا کہ شیر علی کو مدد دیکر اُسے کابل میں

---

[۱] Letter to Government of India from Political Secretary— dated 21st August, 1868 (Afghanistan correspondence, 2190-1878 p. 31.)

مطمئن کردینا چاھے" کیونکہ کابل میں اقتدار حاصل کرنا ھمارے لئے
بہت ضروری ھے جس سے ھم روس کا وہ راستہ بند کرسکتے ھیں"
اس کے ساتھہ ھی اس نے یہ بھی دکھایا کہ ترکی اور یورپی مسایل کی
وجہ سے ھمیشہ یہ خطرہ ھے کہ روس ' برٹش حکومت کو ایشیا میں
تنگ کرے اُس کا یہ بوی قیاس تھا کہ روس جلد ھی ھرات کو اپنے
اقتدار میں لے لینے میں کامیاب ھوجائے گا اور اگر ھرات پر روس کا اقتدار
ھوگیا ' تو اس کی قوت وسط ایشیا میں مضبوط ھوجائیگی - رالنسن نے
لکھا کہ ھرات ' ھندوستان کی کلید کہا جاتا ھے اور وسط ایشیا میں
اس کی حیثیت حربی نقطۂ نظر سے بہت اھم ھے ' در اصل یہ کہنا
غلط نہ ھوگا کہ اگر روس پوری طرح ھرات میں اپنا قدم جما لے اور ایک
طرف مشہد اور استراباد سے دوسری طرف مرو ھوتے ھوئے خیوا سے تیسری
طرف بخارا اور تاشقند سے اس کے آمد و رفت کا معقول سلسلۂ تعلق
ھوجائے تو ایشیا کی تمام فوجیں مل کر اسکو ھٹانے میں ناکامیاب رھینگی
اور پھر اگر وہ شرارت ھی پر امادہ ھوجاے اور انگلستان کی دشمنی ھی
اسکے اُس مقام پر قابض ھوجانے کا سبب ھو ' تو اس کے پاس ھمیں
نقصان پہونچانے کا سامان ھوگا کیونکہ ھرات پر بے روک توک قبضہ
ھوجانے سے فارس اور افغانستان کی پوری جنگی طاقت اس کے زیر اثر
ھوجائیگی آخر میں رالنسن نے اس دقت سے بچنے کی تدبیر بتائی
ھے وہ یہ ھے کہ پہلے فارس سے حکومت برطانیہ دوستی کرے اور وھاں
اپنا سفیر رکھکر روس کے اثر کو زائل کرے ' دوسرے شیر علی کی حیثیت
مضبوط کی جائے جس سے کابل میں برطانوی اثر مضبوط ھوجائے '
تیسرے لاھور سے پشاور تک اور دوسری چھاونیوں تک ریل بنائی جائے
اور چوتھے کوئٹہ میں ایک مضبوط قلعہ اور چھاونی بنائی جائے لیکن

اگر اس سے شیر علی یا افغان لوگ خوش ہوں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا -

رالنسن اور اس حکمت عملی کے دوسرے حمایتی کوئٹہ لینے پر زیادہ زور دے رہے تھے ' اگرچہ اُن کی نظر ہرات اور قندھار پر بھی تھی - اُن لوگوں کا خیال تھا کہ سرحدی پہاڑیوں کے اسطرف رہنے سے دشمن کو دروں کے داخلی رخ پر قبضہ کرلینے اور افغانی جرگوں پر اپنا اثر ڈالنے کا موقع مل جائیگا اور اُس وقت حملوں کا روکنا آسان نہ ہوگا ' پھر اگر ایک بار دشمن ملک کے اند آجائیگا تو ہندوستان کی غیر مطمئن رعایا میں بد امنی پھیل جانا اور دشمن کی حیثیت کا مضبوط ہوجانا مشکل نہ ہوگا - دوسرے نپولین کے وقت سے فن حرب نے اسقدر ترقی کرلی تھی کہ پہاڑیوں کی روک اب روک نہیں سمجھی جاتی ' اسلئے یہ ضروری تھا کہ پہاڑیوں کے اُس پار دروں کے دوسرے رخ کے باہر برطانوی چھاونیاں رہیں اور دشمن کا ملک کے باہر ہی مقابلہ کیا جائے اس کے ساتھہ وہ لوگ افغانستان کے ساتھہ گاڑھی دوستی کے موئد تھے جس سے موقع پر اُس ملک کے قلعوں اور سرحد کی حفاظت کا معقول انتظام ہوسکے ' اس کام کے لئے وہ کابل میں انگریزی سفیر رکھنا چاہتے تھے اور ہرات وغیرہ سرحدی شہروں میں ایسے افسر چاہتے تھے جو اُس محکمہ کی خبروں سے حکومت ہند کو مطلع کرتے رہیں - لیکن لارنس کے زمانے میں اور اس کے بعد آنے والے دو وائسراؤں کے زمانۂ حکومت میں ان کی تجویزوں پر عملدرآمد ہونا ناممکن تھا کیونکہ وہ سب غیر جانبداری کے موید تھے -

انگلستان میں کنسرویٹو پارٹی کے برسراقتدار ہونے پر ڈزرائیلی وزیر اعظم ہوا اور ترکی میں روس کے مظالم کے باعث مشرق قریب

کے مسئلے کا آغاز ہوا ' وزیر اعظم نے روس کی دفع مخالفت کے
لئے ہندوستان سے فوج لانے کی دھمکی دی اور روس نے بھی
وسط ایشیا میں حکومت برطانیہ کو زک دینا چاہا اس پر حکومت
برطانیہ نے افغانستان کی جانب نئی حکمت عملی پر عملدر آمد کرنا
چاہا ' تاکہ امیر کابل پورے طور پر ہندوستان کے زیر اقتدار آجائے اور روس
کا فریب اُس پر نہ چل سکے ' ادھر اتنے دنوں میں وسط ایشیا میں روسی
مملکت بھی وسیع ہوگئی تھی ' سنہ ۱۸۷۳ع میں خیوا پر اُس کا قبضہ
ہوگیا تھا اور اب مرو پر وہ دانت لگائے ہوئے تھا ' تاشقند کا روسی گورنر
جنرل کاف مین امیر شیر علی سے خط و کتابت کر رہا تھا اور اُس کو
دوستی اور امداد کا یقین دلا رہا تھا ' ایسے زمانے میں فتح اور شاہنشاہیت
کے خیالات سے لبریز لارڈ لٹن وائسرائے ہوکر آیا ' چلتے وقت حکومت
برطانیہ نے اُس کو ہدایت کی تھی کہ وہ امیر سے کابل میں انگریزی سفیر
رکھنے پر زور دے اور روس کے خلاف امداد کرنے کا اُس سے وعدہ کرے - لٹن
خود بھی یہی چاہتا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ روس کو روکنے
کے لئے افغانستان کو پوری طرح برٹش حکومت کے قبضے میں رکھنا چاہتا
تھا ' اس نے سائنٹفک سرحد کی حکمت عملی کو از سر نو اُتھایا اور
اپنے خیالات اور عمل سے اس کو ایک نئی اور مکمل صورت دیدی جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ امیر کابل سے ایک بیکار سی جنگ ہوئی لیکن ہندوستان
کی سرحد کچھہ بڑھ گئی -

لٹن نے آتے ہی کویٹہ پر قبضہ کر لیا اور سڑک بنانے کی اجازت دی
اس طرح تقدیم کی پالیسی میں پہلا قدم بڑھایا گیا ' جب جنوب میں
حیثیت مضبوط ہوگئی تو اُس نے شیر علی سے کابل میں سفیر رکھنے پر
دباؤ ڈالا - لیکن امیر نے اسے قبول نہیں کیا - ادھر روس کا سفیر اسٹالٹیاف

کابل آیا اور شیر علی نے اس کا خیر مقدم بھی کیا ، اس واقعہ سے لٹن کے جسم میں آگ لگ گئی اور اُس نے یہ عہد کیا کہ یا تو وہ امیر کو اپنی خواهش کے مطابق دبا هی لوگا یا اس کو نیست و نابود کر ڈالے گا - اس لئے اس نے زبردستی ایک سفیر کو کابل بھیجنا چاها اور یہ تہیہ کیا کہ اگر اس کو امیر راستے میں روکے گا تو لڑائی چھیڑ دیجائیگی ، اس مضمون کا ایک خط ۳ اگست سنہ ۱۸۷۸ع کو اس نے وزیر هند کیمبرک کے نام لکھا جس کے شروع میں اس نے سائنٹفک سرحد اور اس کی حفاظت کے متعلق اپنے خیالات ظاهر کئے ، دوسری افغان جنگ (سنہ ۱۸۷۸-۸۰ع) انہیں مقاصد کی غرض سے هوئی تھی - اس لئے سائنٹفک سرحد کے مسئلہ کی تاریخ میں اس خط کی خاص اهمیت هے - اس نے لکھا کہ لوگوں کا یہ یقین کہ روس کی طاقت جلد هی زائل هوجائیگی اور یہ کہ ایشیا میں بہت دنوں تک اس کا غلبہ نہ رہ سکے گا ، غلط فہمی پر مبنی هے کیونکہ روس کی سرحد ایک سو پچیس میل اور بڑھ گئی هے ، اور روسی افسروں اور اس کی افواج کا کابل میں عزت کے ساتھہ خیر مقدم کیا گیا ، جو هماری سرحد کے ایک سو پچاس میل کے اندر هی هے پھر اس نے سائنٹفک سرحد کے بارے میں لکھا کہ جو خیالات میرے هندوستان میں آنے سے قبل تھے وہ اور زیادہ پختہ هوگئے هیں اور ان کی مزید توجیہ یہ هے :—

(۱) چھوٹی اور کمزور ایشیائی ریاستیں هر چند کہ وہ دوست هوں اگر کسی طاقتور یورپین سلطنت کی همسایہ هونگی تو بھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکینگی ، اس لئے یہ یقینی هے کہ ایک نہ ایک دن برطانیہ اور روس کی سرحدیں شمال مغرب میں ایک دوسرے سے مس کرینگی -

(۲) ابھی وقت ہے کہ ہم اس پر غور کرلیں کہ کس مقام پر ہم ان سرحدوں کا باہم ملنا پسند کرتے ہیں تاکہ ہمیں کوئی دقت اور نقصان نہ ہو -

(۳) ان سرحدوں کے ملنے کا مقام جنگی نقطۂ نظر سے طے ہونا چاہئے -

(۴) لیکن ہماری موجودہ سرحد ' جنگی نقطہ نظر سے نامناسب ہے ' کیونکہ اُن تمام دروں کے داخلی رخ جن سے ہوکر ہندوستان میں آنے کا راستہ ہے دشمن کے قبضے میں آجاتے ہیں ' ہندوستان کے شمال مغرب میں قدرتی سرحد ' ہندوکش کا سلسلۂ کوہ ہے اور وہ سلسلہ اور چوکیاں جو اُن دروں کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں انہیں کو ہماری سرحد ہونا چاہئے -

جو لوگ موجودہ فن حرب سے باخبر ہیں ان کی رائے ہے کہ پہاڑوں کی پشت پر حفاظت کے لئے کھڑے ہونے کا رواج نیپولین کے وقت میں تھا ' اور موجودہ زمانے میں جہاں کہیں اس کی تقلید کی گئی وہاں نقصان ہوا ' میری رائے میں ہندوستان کی حفاظت کے لئے ایک معقول سرحد بنائی جاسکتی ہے ' بائیں طرف ایک جانب خلیج فارس ہے اور مغربی بلوچستان کا ریگستان پھیلا ہوا ہے کویٹہ پر قبضہ ہو جانے سے ہماری حیثیت زیادہ مضبوط ہوجاتی ہے ' کیونکہ حملہ آور دشمن کے لئے پہلی روک وہی ہے اور درۂ بولن کے اِس پار ہمیں طیار ہونے کے لئے کافی وقت مل سکتا ہے اس لئے اِس حصے میں ملتان سے لیکر سمندر تک ہماری سرحد قابل اطمینان ہے - حربی نقطۂ خیال سے ہم قندھار پر قبضہ کرنا چاہیں گے لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے قندھار کو دشمن کے

قبضے میں پڑنے دینا نقصان دہ ہوگا اور شاید حفاظت کے لئے اُس مقام کو بھی قبضے میں کر لینا ضروری ہوگا جس سے قلات ' غلزئی ' غزنی اور وہاں سے دروں سے ہوکر ہماری سرحد تک آنے والے راستے کو روکا جا سکے ۔

'' داہنی طرف ہمالیہ کی اونچی دیوار اور صحرائے تبت سے ہماری حفاظت ہوتی ہے اور اُس طرف آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے ' لیکن وسط حصے کی (کوئٹہ سے چترال) حفاظت کا مسئلہ پیچیدہ ہے ' میں چاہتا تھا کہ ہرات تک ہندو کش اور اسکے سلسلے ہماری خاص سرحد ہوں - بلخ ' میمنہ اور ہرات میں چوکیاں رکھی جائیں : اور آمو ندی تک ہمارا پورا قبضہ سمجھا جائے - لیکن بدخشاں اور بلخ وغیرہ روس کے قبضے میں ہوجائینگے ' اسلئے ہم کو اُن کی فکر چھوڑ دینی چاہئے - اُس وقت ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ جلد ہی بامیان ایسے مقامات کو اپنے قبضے میں کرلیں - کیونکہ وہ ہندو کُش کے شمالی دروازوں کو بند کرسکینگے - ہمارے لئے دو سرحدی خطوط ایک خارجی آمو ندی تک اور دوسرا داخلی پہاڑیوں کے پاس ہونگے جنکی چوکیاں بامیان وغیرہ میں ہونگی - اگر ہم داخلی خط کو متعین کرلیں تو ہماری سرحد بامیان سے پچھم ہلمند ندی کے باہر گرشک تک آئگی - یہ تو جنگی نقطہ نظر سے موزوں ہوگا لیکن آخرکار ہم کو سیاسی اسباب کے مطابق کام کرنا ہوگا مرو کو ہم روس کے ہاتھہ میں جانے سے نہیں بچاسکتے ' ہرات ہی ہمارے اور روس کے درمیان جھگڑے کا مقام ہے اور سیاسی نقطہ نظر سے اس کو روس ' فارس یا کسی دوسرے مخالف کے ہاتھہ پڑ جانے دینا ہمارے لئے نا مناسب ہوگا '' -

اسی خط میں اُس نے لکھا کہ ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہئے کہ پہلے امیر کو دھمکی یا لالچ سے مجبور کریں کہ وہ روس کے اثر

کو ہمیشہ کے لئے دور کرے اور اگر وہ قبول نہ کرے تو دوسری غیر طاقتیں اس کو مدد نہ دیں اور افغان حکومت کو نیست و نابود کر کے ایک دوست حکمراں کو تخت پر بٹھائیں اور اُس ملک کا اتنا حصہ اپنے قبضے میں کرلیں کہ شمال مغربی سرحد کی حفاظت ہمیشہ کے لئے آسان ہوجائے - اس مضمون کا لٹن نے صرف ایک ہی خط نہیں لکھا - ۹ ستمبر سنہ ۱۸۷۸ع [۱] کے حکومت ہند کے ایک خط کا بھی یہی موضوع تھا - لٹن نے سائنٹفک سرحد کو شمال مغربی پہاڑیوں کے اُس پار تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اُسے ہندو کش تک بڑھانا چاہا اور قندھار ' ہرات ' بامیان وغیرہ مقامات میں اپنی فوج رکھنے کی تجویز کی - وہ افغانستان کو درمیانی ریاست کی حیثیت نہیں دینا چاہتا تھا - بلکہ اُس کو اور اسکی فوجی اور غیر ملکی پالیسی کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتا تھا - تاکہ روس کو اس ملک سے بہت دور پر روکا جاسکے - ہندو کش تک اپنی سرحد بڑھا کر وہ موریہ اور مغل سلطنتوں کی تقلید کرنا چاہتا تھا - اس کے لئے کابل کی آزادی کو سلب کرلینا ضروری تھا - اور اس لئے کہ امیر شیر علی اپنا گلا نہیں پھنسانا چاہتا تھا اعلان جنگ کردیا گیا - دوسری افغان جنگ کا یہی سبب تھا -

لٹن پہلے ہی سے افغانستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا اور ایک مغربی ریاست بنانا چاہتا تھا تا کہ ہرات کے حکمراں پر اسکا پورا اقتدار قائم رہ سکے اور اسکے ذریعہ سے سرحد کی حفاظت آسان ہو جائے اسلئے جب موقع آیا تو اس نے قندھار میں الگ ایک حکمراں مقرر کیا ' کابل کے لئے اس نے عبدالرحمان کا انتخاب کیا اور

---

[۱] Afghanistan Correspondence (1881) No. 2 pp. 4—21

اُس سے بات چیت شروع ہوئی ' لیکن اسی زمانے میں انگلستان میں حکومت تبدیل ہوئی اور لبرل جماعت کے لیڈر گلیڈ اسٹون وزیر اعظم ہوئے ' چونکہ اس جماعت نے لٹن کی حکمت عملی کی مخالفت کی تھی اسلئے لٹن نے استعفا دیدیا اور اسکی جگہہ پر رپن مقرر ہوا - نئی گورنمنٹ کے آنے سے پہلے ھی قندھار کے متعلق غور کیا گیا تھا - جنرل رابرٹ کی رائے تھی کہ قندھار میں برطانوی فوج کا رھنا ضروری ھے اسلئے اُس شہر پر قبضہ رکھا جائے اور بقیہ مفتوحہ حصے واپس کردئے جائیں - اگر کویٹہ اور قندھار میں فوجیں رھیں تو اُسے خیبر اور کرم کی زرا بھی پرواہ نہ تھی - رابرٹ کی تائید ' لٹن ' گرین میوبردو ' رالنسن اور نیپئر کر رھے تھے ' اور اسکی مخالفت میں والسلے ' اے ڈی لارنس اور پھري تھے - فیلڈ مارشل سر ڈو لینڈ اسٹورٹ اور نارمن اسکی موافقت میں نہ تھے ' لیکن کمانڈر انچیف ھینس کی تجویز کے مطابق قندھار پر قبضہ رکھنا مناسب تھا ' لیکن اس زمانے میں قندھار کے علاوہ افغانستان کے کسی حصے پر برطانوی اقتدار کوئی نہیں چاھتا تھا اور لٹن کی ھندو کش اور ھرات تک پھیلی ھوئی مجوزہ سائنٹفک سرحد کا کوئی حامی نہ تھا - رپن کے آنے پر برٹش کیبنٹ نے یہ طے کیا کہ قندھار بھی عبدالرحمان کو دیدیا جائے اور اس واقعہ کے بعد لٹن کے پالیسي کا ھر حیثیت سے خاتمہ ھوگیا - لیکن جنگ کے نتائج کی شکل میں پیشین ' سھبي اور وادی کرم برطانیہ کے قبضے میں آگئے اور پیچھے واپس آنے کی آرزو کے باوجود رپن یا ڈفرن کویٹہ کو نہ چھوڑ سکے بلکہ ریل کا تعلق چمن تک ھوگیا - آگے بڑھنے کی حکمت عملی کا یہ حصہ کم سے کم مستقل رھا -

رپن نے پھر افغانستان کو ایک درمیانی ریاست کی حیثیت دیدي اور اسکے کوشش کی کہ عبدالرحمان کی حیثیت کابل میں

مضبوط ہوجائے - نیا امیر بھی ہندوستانی حکومت کا دوست رہا اسلئے
جب تک وہ زندہ رہا جھگڑے کا کوئی خاص موقعہ نہیں آیا - اسکے بعد
حکومت برطانیہ نے یہ کوشش کی کہ افغانستان اور روس کی سرحد
طے پاجائے تا کہ روسی سلطنت ہمارے ملک کی طرف زیادہ نہ بڑہ سکے ؛
سرحدی کمیشن بیٹھا اور اسنے موقع پر جاکر سنہ ۱۸۸۶ع میں سرحد
مقرر کر دی - جب تک افغانستان درست اور طاقتور ہے اس وقت تک
روس کے حملے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے - اس خیال سے پھر کبھی ہرات
اور قندھار تک بڑھنے کی حکمت عملی کام میں نہیں لائی گئی -
لارڈ ڈیفنسڈاؤن اور جنرل رابرٹ بھی اقدام کی پالیسی کے حامی تھے
لیکن وہ محض شمال مغربی پہاڑیوں کے دوسری طرف مضبوط مقامات
کو اپنے زیر اثر لاکر وہاں تک ریل اور سڑک لیجانا چاہتے تھے ؛ اس سے امیر
خوف زدہ ہوا اور ممکن تھا کہ آپس میں آتش فساد مشتعل ہو جاتی
لیکن حکومت برطانیہ نے وایسرائے کی تائید نہیں کی اور آخر کار ڈوریںڈ
نے امیر سے مل کر ہندوستان اور افغانستان کے بیچ کی سرحد بھی طے
کر لی - یہ سرحد ڈوریںڈ لائین کے نام سے مشہور ہے - روس کا خوف
نہ رہجانے سے اس کے بعد حکومت ہند کی پالیسی ڈوریںڈ لائین تک
کی زمین اور پٹھان جرگوں کو اپنے زیر اثر رکھنے کی رہی - اور الگن اور
کرزن کے زمانے میں قلعے ؛ سڑکیں اور ریلیں اس حصے میں بنائی گئیں -
اور پٹھان جرگوں کے فتنہ و فساد کو فرو کیا گیا - اس زمانے میں جنوب کے
حصے چمن تک ؛ وسط میں وادی کرم میں اور درۂ خیبر میں ریل بن گئی
ہے جس سے شمال مغربی حصے کی حفاظت کا مناسب انتظام ہوگیا ہے -

سائنٹفک سرحد کا کیا مطلب ہے ؟ دوسری افغان جنگ کے
قریب بیس سال تک اس کا مطلب یہی سمجھا جاتا تھا کہ ضروریات

جنگ کے مطابق وہ کون حصۂ زمین ہے جس کی حفاظت کرنا ' وسط ایشیا سے حملہ ہونے پر ازحد ضروری ہے - ماہرین فن حرب اس سوال پر متفق نہ تھے - کچھہ لوگ ہرات تک کو شامل کر لیتے تھے - بعض لوگ بلخ کو بھی زیر اثر لانا چاہتے تھے ' لیکن کثرت رائے کابل ' غزنی اور قندھار کے قریب ایک خط کھینچنا چاہتی تھی جس کی حفاظت لازمی ہے - یہ حصہ کم بھی ہے اور کوئی دشمن اس کو بچاکر شمال یا جنوب میں نہیں جاسکتا ہے ' کیونکہ ایک طرف اونچے پہاڑ ہیں اور دوسری طرف ریگستان - انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر یہ مقامات ہندوستان کی چھاؤنیوں سے ریل کے ذریعہ باہم مل جائیں تو دونوں اطراف میں جلد اور آسانی سے فوج لائی جاسکتی ہے ' لیکن دوسری افغان جنگ کے بعد اس حصے سے بھی پلٹنا پڑا اور سائنٹفک سرحد کے مسئلہ کو چھوڑ دینا پڑا - تاہم اس کے لئے ایک جنگ کرنا پڑی اور یہ خیالات بہت عرصے تک قائم رہے جس سے حکومت ہند کی شمال مغربی حکمت عملی پر بہت بڑا اثر پڑا ہے -

حضرت خواجہ بندہ نواز کی
اردو شاعری

از مولوی نصیرالدین ہاشمی

حضرت سید محمد حسینی جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں حضرت نصیرالدین چراغ دھلی کے مرید اور خلیفہ تھے - بھمنی حکومت کے زمانےمیں دکن آئے (۸۰۱ھ) اور یہاں ھی ۸۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا - گلبرگہ میں آپ کا مزار ھے اور ھر سال ماہ ذیقعدہ میں بڑی دھوم سے آپ کا عرس ہوتا ھے -

آپ نہ صرف اپنے وقت کے ایک باکمال صوفی تھے بلکہ بڑے صاحب علم و فضل بھی تھے - آپ کی تصانیف بے شمار ھیں - مریدوں اور معتقدوں کی عمومی تربیت کے علاوہ نماز ظہر کے بعد آپ درس بھی دیا کرتے - حدیث ، تصوف ، سلوک ، فقہ اور کلام اس درس میں شامل تھا - آپ کے فیض علمی و روحانی کا سلسلہ دور تک پھونچتا ھے -

اب یہ امر متحقق ہو گیا ھے کہ دکن میں اُس وقت عام طور سے اُردو زبان مروج تھی ، ادنیٰ سے اعلیٰ تک اسی میں گفتگو کرتے تھے - حضرت گیسو دراز بھی فارسی اور عربی کے علاوہ اسی دکھنی میں درس دیا کرتے تھے - آپ کی ایک کتاب جو " معراج العاشقین " سے موسوم اور اُردو نثر میں ھے شائع ہوگئی ھے -

لیکن ہنوز اس کی تحقیق باقی ہے کہ آپ نے دکھنی نظم میں طبع آزمائی کی ہے یا نہیں -

راقم نے اپنی تالیف " دکن میں اُردو " میں حسب ذیل تین شعر کے متعلق صراحت کی ہے کہ یہ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں :—

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھتا وسے
جب گھل گیا نمک تر نمک بولنا کسے

یوں کھوئی خودی اپنی خدا ساتھ محمد
جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی وسے

آنتوں بلیلا آنتوں لون
پتین کے گھر جائے کون

یہ اشعار رسالۃالنساء (حیدرآباد) میں تمکین کاظمی صاحب نے شائع کئے تھے -

اب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے اپنی جدید تالیف " اُردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیا کرام کا کام " میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے ذکر میں حسب ذیل صراحت فرمائی ہے :

" مجھے ایک قدیم بیاض ملی ہے جس میں بیجا پور کے مشہور صوفی خاندان کے بزرگوں کے نظم و نثر کے رسالے اور اقوال جو زیادہ تر

ہندی یعنی قدیم اُردو میں ہیں ' اس خاندان کے کسی معتقد نے بڑے اہتمام و احتیاط سے جمع کئے ہیں اس کا سنہ کتابت ۱۰۶۸ ہجری ہے اس میں حضرت بندہ نواز کا بھی ایک آدہ رسالہ اور بعض اقوال وغیرہ پائے جاتے ہیں - منجملہ ان کے ایک مثالت بھی ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے -

او معشوق بے مثال نور نبی نہ پایا
اور نور نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا
اپیں اپیں دیکھاونے کیسی آرسي لایا "

اس تفصیل کے بعد مولانا نے معراج العاشقین کا ذکر کیا ہے اور اس کی عبارت کا نمونہ دینے کے بعد پھر صراحت کی ہے :

" بیاض مکتوبہ سنہ ۱۰۶۸ھ کے علاوہ دو اور بیاضوں میں ان کی ایک غزل قدیم طرز ریختہ میں ملی ہے - جس کی نسبت یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہی کی ہے البتہ مقطع میں تخلص انہی کا ہے - "

غزل کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں :

توں تو صحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ہوے نرم نہ تجہ اوچڑے پس کھائگا آزار توں
سختیچ گھوڑا زور ہے خود خیال اس کا ہورہے
تن لوتلے کا چور ہے نہ چھوڑ اس بد تہار توں

* * * * * *

تب فید گھوڑا آئے گا تجھہ لامکاں لے جائے گا
تب عشق جھگڑا پائے گا خد مارلے تروار توں
شہباز حسینی کہوے کر ہر دو جہاں دل دھویکر
اللہ اپے یک ہوے کر تب پاوے گا دیدار توں

اس کے پیشتر کہ آپ کے کلام کے متعلق مزید صراحت کی جائے دو امور کے متعلق کچھہ لکھنا ضروری ھے - اول تو یہ کہ کہا خواجہ صاحب کی غزل قدیم طرز ریختہ میں ھے ؟ دوسرا آپ کا تخلص -

شمالی ھند میں عام طور سے ایک زمانے میں اردو نظم کا نام ریختہ تھا مگر دکن میں ایسا کبھی نہیں ھوا - بلکہ یہاں ریختہ صرف اس خاص نظم کو کہتے تھے جس میں مصرعے فارسی سے مرکب ھوتے تھے چنانچہ کلیات شاھی میں جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کا دیوان ھے اور قدیم زمانے میں مرتب ھوا ھے ریختہ کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ھے اس کا مطلع یہ ھے : [۱]

دیدم نظر بہ ہر روپ جو اس شوخ چکہ مستانہ را
گفتم بیا مندر ملے روشن بکن کاشانہ را

ریختہ کے متعلق ھم نے تفصیل سے ایک دوسرے مضمون [۲] میں بحث کی ھے اس لئے یہاں مزید توضیح کی ضرورت نہیں معلوم ھوتی - بہرحال یہ کہنا کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی غزل ریختہ میں ھے صحیح نہیں ھوسکتا بلکہ اس کو قدیم اردو یا دکھنی کہنا چاھئے -

---

[۱]—تفصیل ملاحظہ ھو رسالہ معارف نمبر ۵ جلد ۳۱ -

[۲]—ملاحظہ ھو رسالہ انکشاف سالنامہ ۱۹۳۰ م -

خواجه صاحب کے تخلص کے متعلق یہه لکھا گیا ھے کہ ان کا تخلص یقینی طور پر شہباز تھا - مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا ھے کہ دراصل آپ شہباز تخلص کرتے تھے - کیونکہ ھم کو جو کلام ملا ھے اس میں پورا نام سید محمد حسینی اور " بندہ " بھی تخلص لایا گیا ھے - اس طرح یہه امر ھنوز تحقیق طلب ھے کہ آپ کا دراصل تخلص کیا تھا -

اس وقت تک ھم کو خواجه بندہ نواز کا جو کلام دستیاب ھوا ھے وہ تین علیحدہ جگہوں کا ھے -

(۱) آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج کے پاس ایک مجموعہ ھے جس کے جامع ابوالقاسم نصیرالدین ھیں - یہ عالمگیر کے ساتھہ ان کی فوج میں شامل تھے - اور جہاں جہاں سے ان کو تصوف کا ذخیرہ ملتا گیا ھے اس کو اس کتاب میں جمع کرتے گئے ھیں اس طرح یہ رسالہ سنہ ۱۱۱۳ ھجری میں لکھا گیا ھے - اس میں خواجه صاحب کی تین نظمیں ھیں ایک میں سید محمد اور دو میں شہباز تخلص ھے -

مولانا عبدالحق نے اپنی کتاب میں جس مثلث کا ذکر کیا ھے وہ دراصل مثلث نہیں ھے کیونکہ اس کی پوری نظم دستیاب ھوئی ھے -

زمانۂ قدیم میں تصوف کی نظموں کو " حقیقت " کے نام سے موسوم کرتے تھے خواجه صاحب کی تینوں نظمیں بھی حقیقت کے نام سے لکھی گئی ھیں اور موسیقی کے راگنیوں میں ھیں - ذیل میں ان کو درج کیا جاتا ھے -

حقیقت رام کلی

میں [۱] عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے

او پیو میرے جیو کا برقالیا ہے

او معشوق بے مثـال ہے نـور نبی نپایا

نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بھایا

ایکوں اپے دیکنـے کیسـی آرسـی لایا

کھڑکھڑے پیو جیو میں اپسیں آپ دکھاوے

ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکنے پاوے

جنھہ دیکھے اوسی کـوں اُسے اور نہ بھـاوے

کل شئی محیط ہے اسی کـوں پچھـانے

جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے

اسی دیکھت کم ہـورہے جیسی ہیں دیـوانے

خواجہ نصیـرالدین جنے سـائیاں پیو بتائی

جیو کا کھوں کتھہ کھول کر پیا مـکہ آپ دکھائی

اکھی سید محمد حسینی پیوسنکہ کہیا نہ جائی

حقیقت

اے محمد ہجلو جم جم جلوا تہرا * ذاتَ تجلی ہویگی سیس سہور نہ سہرا

واحد اپلی آپ تھا آپیں آپ نجھایا

پرکٹہ جلوے کارنے الف میم ہو آیا

عشقوں جلوا دئے کر کاف نوں بسایا

---

[۱]—چونکہ کسی دوسری جگہ آپ کا کلام نہیں ہے اس لئے بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے - صحت نہیں کی گئی ہے -

لــولاک لما خلقت الافلاک خــالق پالائے
فاضل افضل جیتی مرسل ساجد سجود ہو آئے
امت رحمت بخش ہدایت تشریف پائے

مخفی نانوں معشوق رکہ ظاہر شہباز کہ لائے
عشق کے جیلی چند بلند اپلی آپ دکہائے
الان کماکان پہــر اپسمیں آپ ســمائے

حقیقت

مشکل بازی عشق کے چھوتے جیو کوا نا * مو تو قبل ان تمو تو شاہد ہے معنا
اونچا مندر ہر عشق کا کوئی کیونکر پاوے
چاروں سیریاں چڈھہ کر توپے ہار تا اوے
جی سیس دیوے پانوں تل تو بھی ناپاوے

دوئی دوئی تائی دور کریکت واحد ہونا
چاروں کپڑے کپڑے جال کر مجنون ہو رہنا
پورا مناس ہوے تو اسے کھیل چت لانا

سوہے عاشق شہباز ہے دوہوں جگ کہلارا
خواجہ نصیرالدین سائیاں نپت راکھے ہمارا
نسنکہ کہیل توں پندر عشق کے تہارا

(۲) دوسری بیاض ہمارے عزیز محمد غوث صاحب ایم - اے عثمانیہ) کی توسط سے دستیاب ہوئی ہے - اس میں ایک طویل مخمس ہے جس کو خواجہ صاحب سے موسوم کیا گیا ہے - اس میں " بندہ " تخلص ہے مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے -

مخمس

کہاں لگ کھیلنچھیا رهیگا توں دنیا کی پریشانی
جتے لگ فکر هی دیلکی دنیا دیکھے تو هے فانی
دنیا میں یوں همیں آئے که چوں آئے هیں مهمانی
توں ست غفلت آپس تن کی که هوشیار اے گیانی

سمجھه کر دیکھه هے تجھه میں نبی کا نور نورانی

عدو هے پے ملی تیری بسر توں اوس رهے نا کی
یہاں کی فکر دے ست کر توں کرنا فکر اوس جاکی
خدا سو پاک هے آپی لگے خوش اس کینتی پاکی
بھتر تن هے تیرا نوری اوپر کا تن تیرا خاکی

ملا حکمت سوں کیتا خاک آتش باد هور پانی

شریعت بات واجب کا چلی اوس ذکر سوں مل هے
کیتے اوس روح نامیه سو مضغه اوس کا دل هے
قیاس عقل اوس کا هور میکائیل سو کل هے
سومبدا اوس شهادت جان ناسوت اس کا منزل هے

دهری او نفس اماره مقام هے اس کا شیطانی

جو کوئی حق سوں ملے هیں چلے نا ان سوں عیاری
کہتے باتاں کوں سهک ظاهر کریں هرکس سوں مکاری

کیتے و اصل ہوے حق سوں کتے سوسی ہیں بی خواری
ملے تو کیا ہوا حق سوں نہ ستنا فعل مختاری

کیتے عاجز کوں اون میں کئے ہیں آپ کو قربانی

بندہ دو جگ میں او دل سوں شہنشا مہبلی کا ہے
نہیں کل آج سرن یاران صحیح او اول ہی کا ہے
غزل کیوں نا کہی نادر کرم ایسے ولی کا ہے
ثنا یو سب کیا سو میں دیکھو حضرت علی کا ہے

فکر کرنے میں دیکھوں تو نہیں کوئی اس کا ہے ثانی

---

(۳) تیسری نظم ہم کو مولوی سید مصباح الدین صاحب تمکین کے توسط سے ملی ہے جو کسی سید اکبر علی کے مملوکہ مخطوطہ سے ماخوذ ہے -

---

نسخہ منجن

سن تو سہانے میری بات * بولوں دارو میں کس دھات
جسکے منہ میں آوے باس * اسکی دارو سن مجھہ پاس
جسکے منہ میں دکھے دات * ہلتے جلتے کئے کے بات
وزن برابر سب کو تول * دارو ہوے یوں انمول
دانوں کارن مسی کر * خوبی کن تو دل میں دھر
زیرہ مرچیاں سنوا سلوت * کتھا اجلا لیکر گھونت

نیلا طوطہ دھنیا بھون * اس میں ملا تو سیندا لون
پان پلاس کے کانٹھیاں آن * ما پھل لوجن اور لوبان
جوں جوں لگاوے پاوے سکھہ * تجہ دانتوں کا جاوے دکھہ

دیگر

آنکھہ کو ھلیلہ دانت کو لون * حکیم کے گھر جاوے کون

دیگر

جتلا کاجل اتلا بول * اوس سے دونا گوند گھول

ذرا سی پھٹکری نمک لا تھوڑا * قلم چلے جوں ترکی گھوڑا

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا موسومہ جسقدر کلام دستیاب ہوا وہ درج کردیا گیا ھے - اب یہ امر تصفیہ طلب ھے کہ کیا دراصل یہ کلام جو آپ سے منسوب کیا جاتا ھے آپ ھی کا ھے یا نہیں ؟ ھم کو دکن کا جو قدیم سے قدیم کلام ملا ھے وہ نظامی کا ھے -

نظامی کا زمانہ سنہ ۸۶۳ھ کا ھے اس کی مثنوی کدم [۱] راؤ پدم راؤ ھے جس کے بعض شعر یہ ھیں :

کہوں سد ساجی نظامی دھرم * پدم سب سنے بات بانجی کدم

---

[۱]—اس کے متعلق ھمارا تفصیلی مضمون ''معارف'' جلد ۳۰ نمبر ۴ میں شایع ہوا ھے -

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار * پرت بال سینا کر تارا دھار

عطارد مسخر ہوالے قلم * مسخر کیا سور دے ھت علم

اس کے کلام سے خواجہ صاحب کا کلام زیادہ صاف ھے حالانکہ بلحاظ زمانۂ تدریجی ایسا نہ ہونا چاہئیے تھا - اس کے قطع نظر ایسا کوئی قطعی ثبوت نہیں ھے کہ کلام مندرجۂ بالا کو خواجہ صاحب کا ھی قرار دیا جائے - بہت ممکن ھے کہ یہ کلام یا اس میں سے بعض آپ ھی کا ھو اور یہ بھی ممکن ھے کہ زمانۂ بعد میں لوگوں نے آپ سے منسوب کردیا ھو - چونکہ سر دست قطعی ثبوت نہیں ملا ھے اس لئے ھم اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن خیال ظاھر نہیں کرسکتے -

---

تبصرے

نغمۂ الہام ' کلام ربانی

مترجمۂ پنڈت نظر سوهانوي مطبوعه محبوب المطابع دهلی '
قیمت دو روپیه -

یه بهگوت گیتا کا اُردو نظم میں ترجمه هے - بهگوت گیتا قدیم هندوستان کے ذهنی و روحانی ترقی کی ایک قابل فخر یاد گار هے جس کے ترجمے تقریباً تمام متمدن ممالک کی زبانوں میں هوچکے هیں - فیضی نے اکبر کے زمانے میں اس کا فارسی میں ترجمه کیا تها - هندی ' مرهٹی ' بنگاله اور دوسري هندستانی زبانوں میں بهی اس کے ترجمے هوچکے هیں اور شرحیں بهی لکهی جاچکی هیں - ان میں مسٹر تلک کی شرح موجوده زمانے میں خاص اهمیت رکهتی هے - اُردو زبان میں بهی گیتا کے ترجمے هوئے هیں ' لیکن پنڈت نظر سوهانوي نے اِس کا ترجمه اُردو نظم میں کیا هے جو اپنی نوعیت میں ایک نئی چیز هے - مترجم کی یقیناً یه ایک جدت هے که سنسکرت نظم کا براہ راست اُردو نظم میں ترجمه کیا هے -

غور کیجئے تو ترجمه ایک طرح سے تفسیر بهی هے ' کیونکه ترجمے کے لئے الفاظ کی تلاش اور انتخاب میں مترجم کا ذهن غیر ارادی طور سے تفسیر و شرح بهی کرتا جاتا هے - کیوں که مطالب کیجانب رهنمائی تفسیر و شرح نهیں تو اور کیا هے ؟ بهگوت گیتا کي جیسا که ابهی عرض کیا گیا متعدد شرحیں کی جاچکی هیں - بعض شارحین نے بهگوت گیتا کی بنیاد میں گیان (عرفان) ' بعضوں نے بهگتی (محبت و نیاز مندی) '

اور بعضوں نے کرم مارگ (طریق عمل) کا تصور قائم کیا ہے - مسٹر تلک کا خیال ہے کہ بھگوت گیتا از سرتا پا عمل ہے اور عمل ہی کی تعلیم دیتی ہے - ویدانتیوں کے نزدیک یہ صرف گیان مارگ (راہ عرفان) بتاتی ہے اور ویشنوں اور بھگتوں کے نزدیک یہ بھگتی اور نیاز مندی کا راستہ بتاتی ہے - لیکن یہ سب تعبیر کا اختلاف ہے ورنہ گیان ' بھگتی اور کرم مارگ معناً ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں - بہر حال پلڈت نظر کا نقطہ نظر بھگوت گیتا کی جانب بھگتی کا معلوم ہوتا ہے -

تاریخ دانوں کی رائے ہے کہ کرشن جی ' بھاگوت دھرم کے پرچار کرنے والے ہوئے ہیں ' انہوں نے ایک ایشور کی عبادت کی تعلیم دی ہے اور بھگتی ہی کو موکش کا راستہ بتایا ہے - بھگوت گیتا کا یہی پرانا اور اصلی حصہ ہے - بعد میں لوگوں نے اس میں بہت کچھ ردوبدل کردیا - یہی وہ دھرم تھا جسکی طرف مہابھارت کے شانتی پرب میں اشارہ کیا گیا ہے - غرضکہ تاریخی نقطہ نظر سے کرشن جی ایک مذہبی رہنما تھے جنہوں نے کرم کانڈ کی دردسری اور اسکی پیچیدگیوں سے تنگ آکر انسانوں کو خدائے واحد و یکتا کی محبت و عبادت کا پیغام سنایا -

بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ سری کرشن نے ارجن کو کرک شیتر کے میدان میں جنگ کرنے کے لئے اُبھارا ہی نہیں ' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سری کرشن ' لڑائی کا میدان اور ارجن وغیرہ سب کے سب ایک تمثیلی حیثیت رکھتے ہیں اور بس - انکے نزدیک لڑائی کا اصل میدان کرک شیتر نہیں بلکہ انسانی ذہن و دماغ ہے جس میں ہر وقت اور ہر لحظہ نیکی و بدی اور خیر و شر کی جنگ ہوتی رہتی ہے - سری کرشن کی حیثیت عقل و ضمیر کی ہے جس سے انسان ہدایت

پاتا ہے ارجن کی حیثیت قوت عمل کی ہے جو عقل و شعور کی رہنمائی بغیر صحیح اور صالح عمل انجام نہیں دے سکتی اور جسے دنیاوی خواہشیں دوسری وادیوں میں بھٹکا کر لیجا سکتی ہیں - لیکن عام طور پر ہندوؤں کا عقیدہ کرشن جی کے بارے میں ایشور کا اوتار یا خدا کا مظہر ہوتا ہے - مگر پنڈت نظر نے شاید غائت عقیدت اور افراط محبت کے باعث سری کرشن کو سیدھے سیدھے لفظ '' ایشور '' سے یاد کیا ہے ' اور آپ کے لئے علیم کل ' خدائے ذوالجلال ' خدائے پاک ' ذات سرمدی اور خلاق جہاں وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں - ممکن ہے کہ عقیدت و محبت کی زبان کچھہ اسی طرز بیان سے لطف اُٹھاتی ہو ' لیکن واقعہ یہ ہے کہ مظہر خدا یا انسان کامل کا مرتبہ بجائے خود بہت ارفع و اعلیٰ ہے - بقول اقبال

قدم در جستجوے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے ہست

بھگوت گیتا اور اسکے فلسفے کے بارے میں کچھہ کہنے کا یہ موقع نہیں ہے البتہ ترجمہ کے بارے میں کچھہ اظہار خیال نہایت ضروری ہے - وہ یہ کہ ترجمہ بالکل لفظی نہیں ہے اور شاید یہ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ سنسکرت کے ایک اشلوک کا ایک شعر میں ترجمہ یا تو ناممکن ہے یا بالکل اتفاقی - لیکن مترجم نے یہ کوشش کی ہے کہ اشلوک کے پورے معنی ترجمے میں آجائیں ' اس لئے جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے ایک اشلوک کو کئی کئی شعروں میں ادا کیا ہے ' اور اس طرح سنسکرت اشلوک کا شاید ہی کوئی خیال یا لفظ چھوٹنے پایا ہو - بعض اشلوک کا ترجمہ بہت ہی کم اشعار میں بھی ہوگیا ہے -

نویں باب کا یہ چھٹا اشلوک ملاحظہ ہو جس کا ترجمہ ایک ہی شعر میں ہوگیا ہے :—

यथाऽकाशस्थितो नित्यं वायुः सर्वत्रगो महान्।
तथा सर्वाणि भूतानि मत्स्थानीत्युपधारय ॥

ہے خلا میں ہر جگہہ جیسے ہوا
یونہیں مجھہ میں ہے قیام اس دہر کا

اسی باب کے چند اور اشلوک ملاحظہ ہوں ' مثلاً ساتواں اشلوک ہے :

सर्वभूतानि कौंतेय प्रकृतिं यान्ति मामिकाम्।
कल्पक्षये पुनस्तानि कल्पादौ विसृजाम्यहम् ॥

اس کا ترجمہ ہے :—

این جہان و زندگی در ہر ابد　　واصل نور خداوندی شود
آشکارا می کنم در ہر ازل　　بے تکلف بے تمنا بے خلل

آٹھواں اشلوک ہے :—

प्रकृतिं स्वामवष्टभ्य विसृजामि पुनः पुनः ।
भूतग्राममिमं कृत्स्नमवशं प्रकृतेर्वशात् ॥

اس کا ترجمہ دو شعروں میں اس طرح کیا گیا ہے :—

بس میں لاکر اپنی اس قدرت کو میں
ان جہانوں کے جو اس کے بس میں ہیں
دیتا ہوں صد آفرینش کا وجود
زندگی ' تا بندگی ' نام و نمود

اِسی باب کے اٹھارویں اِشلوک کا ترجمہ کسقدر اچھا ہے :—

اِشلوک یہ ہے—

गतिर्भर्ता प्रभु: साक्षी निवास: शरणं सुहृत् ।
प्रभव: प्रलय: स्थानं निधानं बीजमव्ययम् ॥

ترجمہ :—

میں ہی اِس عالم کی ہوں جائے پناہ
سب کا رازق سب جہاں کا خیر خواہ
دیکھنے والا ہوں نیک و بد کا میں
پاسباں ہوں عالم بے حد کا میں
ہے مجھی میں سب کے رہنے کا مقام
میرے ہی دم سے ہے عالم کا نظام
بے غرض ' مہر و کرم کرتا ہوں میں
لطف سب پر دم بہ دم کرتا ہوں میں
اِس جہاں کا اول و آخر ہوں میں
بے فنا و مخفی و ظاہر ہوں میں
میں ہی اِس عالم کا ہوں وجہ وجود
باعث ہنگامۂ بود و نبود

دوسرے باب کا اُنہترواں اِشلوک ہے :—

या निशा सर्वभूतानां तस्यां जागर्ति संयमी ।
यस्यां जाग्रति भूतानि सा निशा पश्यतो मुने: ॥

اِس کا ترجمہ ہے :—

جاگتے ہیں رات جس کو سب بشر
نیک اِنسانوں کو ہے مثل سحر

اور جب بیدار ہو سارا جہاں
جانتے ہیں شب اُسے عارف یہاں

چوتھے باب کا بیسواں اور اِکیسواں اِشلوک ہے -

त्यक्त्वा कर्मफलासंगं नित्यतृप्तो निराश्रय: ।
कर्मण्यभिप्रवृत्तोऽपि नैव किञ्चित्करोति स: ।।
निराशीर्यतचित्तात्मा त्यक्तसर्वपरिग्रह: ।
शारीरं केवलं कर्म कुर्वन्नाप्नोति किल्बिषम् ।।

ترجمہ ملاحظہ ہو:—

دل ہے جس کا فعل کے حاصل سے دور
اور تمنا میں ہیں جس کے دل سے دور
ذات برحق کے سوا جو پاک دیں
آسرا اغیار کا لیتا نہیں
فعل کی فطرت کا دم بھرتا ہوا
کچھ نہیں کرتا ہے وہ کرتا ہوا
نفس پر قابو ہے جسکو سر بسر
خواہش لذت سے ہے وہ دور تر
عشرت فانی سے بے پروا جو ہے
بے نیاز لذت دنیا جو ہے
وہ اگرچہ فعل کا فاعل بھی ہو
اِس جہان فعل میں شامل بھی ہو
مورد عصیاں نہیں ہوتا کبھی
فعل در داماں نہیں ہوتا کبھی

ساتویں باب کا چوتھا اِشلوک ہے :—

भूमिरापोनलो वायुः खं मनो बुद्धिरेव च।
अहंकार इतीयं मे भिन्ना प्रकृतिरष्टधा ॥

اِس کا ترجمہ اِسطرح کیا گیا ہے :—

آب و خاک و آتش و باد و خلا
کبر و عقل و ذوق و نفس پر بلا
هشت جز هیں میرے مایا کے یہی
جسم هیں خلق و برایا کے یہی

گیارهویں باب کا بتیسواں اِشلوک ہے :—

कालोऽस्मि लोकक्षयकृत्प्रवृद्धो ।
लोकान्समाहर्तुमिह प्रवृत्तः ॥
ऋतेऽपि त्वां न भविष्यन्ति सर्वे।
येऽवस्थिताः प्रत्यनीकेषु योधाः ॥

اِس کا ترجمہ کیا گیا ہے :—

اِس جہان زندگی کے واسطے
ظلمت و تا بندگی کے واسطے
سر سے لیکر پاؤں تک هوں میں اجل
خلقتوں کی ہے فنا میرا عمل
نیست کرنے کے لئے سب هستیاں
اور بسانے کو قضا کی بستیاں
موت بنکر اِس جگہہ موجود هوں
تاکہ یہ غل ختم هو ' هاں هو نہ هوں

جناب نظر نے حرکت کو بجائے متحرک کے ساکن نظم کیا ہے :
اسی طرح لفظ حمل جو ساکن ہے نسیم لکھنوی کی طرح " آثار حمل ہوئے نمودار " متحرک نظم کیا ہے ' لیکن ایک لمبی اور مسلسل نظم میں اس قسم کی فرو گذاشتوں سے بڑے بڑے اساتذہ کا کلام خالی نہیں ہے -

آخیر میں گیتا کے یہ مشہور اشلوک ملاحظہ ہوں جن کا ترجمہ واقعی قابل تحسین ہے -

नैनं छिन्दन्ति शस्त्राणि नैनं दहति पावकः।
न चैनं क्लेदयन्त्यापो न शोषयति मारुतः॥
अच्छेद्योऽयमदाह्योयमक्लेद्योऽशोष्य एव च।
नित्यः सर्वगतः स्थाणुरचलोऽयं सनातनः॥
अव्यक्तोऽयमचिन्त्योऽयमविकार्योऽयमुच्यते।
तस्मादेवं विदित्वैनं नानुशोचितुमर्हसि॥
अथ चैनं नित्यजातं नित्यं वा मन्यसे मृतम्।
तथापि त्वं महाबाहो नैनं शोचितुमर्हसि॥

تیغ سے زنہار یہ کٹتی نہیں
باد طوفان خیز سے گھٹتی نہیں
آتش شعلہ فشان و شعلہ ریز
کرتی ہے خود اسکے شعلوں سے گریز
پانیوں میں گل نہیں سکتی ہے یہ
آتشوں میں جل نہیں سکتی ہے یہ
آگ میں جلنا ہوا سے سوکھنا
آب میں گلنا تبر سے ٹوٹنا

اِس کا دم ان سب کی زد سے دور ھے

اس کی ھستی سر بسر پر نور ھے

بے فنا و ساکن و قائم ھے یہ

بے شروع والطف و دائم ھے یہ

اس کے دامن کا ھے ھر رشتہ قدیم

ھے اسی گل سے یہ دنیا پر شمیم

سر بسر تاریکیوں سے دور تر

عقل کی باریکیوں سے دور تر

ھیر پھیر اِس میں نہیں ھوتا کبھی

اس کا ایک ذرہ نہیں کھوتا کبھی

پاک تر عصیاں سے ھے اور دور از حواس

نفس و دل کی افترا سے بے ھراس

اس لئے اے ارجن عالی وقار

فکر چھوڑو بھر تسکین و قرار

آھیں بھرنے سے تو حاصل کچھ نہیں

روح ھے یہ مقتول و قاتل کچھ نہیں

اور اگر مانند قالب جا بجا

مانتے ھو اس کی تم خلق و فنا

پھر بھی اس کا رنج کرنا ھے عبث

لب کو نالہ سنج کرنا ھے عبث

مذکورہ اشعار میں اگرچہ ''پانیوں'' اور ''آتشوں'' پر ذرا نگاہ رک جائیگی لیکن ترجمے کی خوبی اور نظم کی دلکشی سے کسی کو انکار نہیں ھوسکتا -

سنسکرت کے الفاظ خواہ وہ فلسفیانہ ہوں یا مذہبی ان کے لئے ٹھیک ٹھیک اُردو یا فارسی الفاظ کا اِنتخاب آسان نہیں ہے ' مگر پنڈت نظر اس میں ایک بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں - مندرجۂ ذیل الفاظ کو دیکھئے ' اُن کے لئے کتنے عمدہ اور خوبصورت الفاظ تلاش کئے گئے ہیں :—

گیانی کے لئے عارف ' لین کے لئے واصل ' گن کے لئے ایک جگہہ جوہر دوسرے موقع پر صفات ' کرم کے لئے افعال ' راگ کے لئے شوق ' دویش کے لئے نفرت ' رشی کے لئے نفس ' کرودہ کے لئے طیش ' کام کے لئے جوش ' من کے لئے دل ' سکھا کے لئے حبیب ' بھگت کے لئے خدا کار ' بدھی کے لئے عقل ' اندری کے لئے حواس اور موہ کے لئے ہوس وغیرہ وغیرہ -

اصل بھگوت گیتا میں موقع و حالات اور کیفیت معنوی کے اعتبار سے بحریں مختلف رکھی گئی ہیں ' مگر مترجم نے اپنی نظم میں ایک ہی بحر رکھی ہے - شاید اُردو میں ایسا نہ ہوسکتا اور ہوتا تو کتاب میں مثنوی کا تسلسل نہ پیدا ہوسکتا - لیکن کم از کم یہ ضرور ہونا چاہئے تھا کہ ترجمے کے ساتھہ اِشلوکوں کا نمبر دیدیا جاتا تاکہ اصل سے مقابلہ کرنے والے کو زحمت نہ ہوسکتی -

ترجمے کا کام ایک تو یونہی بہت مشکل ہے ' اِس پر نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا ایک بڑی ہی غیر محتاط جسارت ہے ' تاہم پنڈت نظر کو ہم مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں حیرت انگیز حد تک کامیاب نظر آتے ہیں -

تارا چند

تاریخ سلطنت خداداد میسور

مرتبہ محمود خان بنگلوری

زیر نظر کتاب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زمانے کي میسور کی تاریخ ہے - ہر چند کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرتب نے یہ کتاب اس زمانے کی تاریخ کے تمامی ماخذوں کو پیش نظر رکھہ کر ترتیب دی ہے تاہم اس مبحث کی فارسی ' اُردو اور انگریزی کی مشہور کتابیں ' مرتب کے زیر مطالعہ ضرور رہیں ہیں - ہمارے نزدیک حیدر علی اور ٹیپو سلطان کي سیرتوں ' کارناموں اور اُن کی رسائیوں پر ایک مستند فیصلہ صرف اُسی وقت ممکن ہے ' جب کہ مرہٹی ' فرانسیسي اور انگریزي ماخذوں کے مواد و معلومات پوری طرح کام میں لائے جائیں اور فارسي کے مستند دستاویزات و بیانات بہم پہونچائے جائیں - لیکن کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کے ذریعہ سے مرتب نے ایک کار آمد اور دلچسپ مقالہ پیش کیا ہے جس سے اُن بعض بڑی بڑی غلط فہمیوں کا جو تاریخ ہند میں جگہہ پاگئی ہیں ازالہ ہو جاتا ہے - مرتب کا یہ کار نامہ کچھہ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ اسلیے اُس زمانے کی جس میں یہ دونوں شخصیتیں موجود تھیں ایک زندہ تصویر کھینچ کر رکھہ دی ہے اور ان دونوں کی شجاعت اور سیاست کے اُن کارناموں کا جو انہوں نے اپنے زمانے میں انجام دئے خوبی سے ذکر کیا ہے - اِس کتاب کے مطالعہ سے اُن حالات کا ایک نقشہ ہمارے ذہن کے سامنے آجاتا ہے جو اٹھارھویں صدي میں ' ہندوستان ' دکھن اور اقصائے جنوب میں پیش آرہے تھے - اِس میں دکھایا گیا ہے کہ ریاست

میسور کے هندو حکمراں ' اپنے وزرا کی نااهلیوں ' اُن کی سازشوں اور چالاکیوں میں کیسے گھرے ہوئے تھے اور کیونکر ریاست روز بروز روبہ تنزل ہو رہی تھی - اِس حالت میں حیدر علی نے ' اپنی قوت بازو اور اپنے حسن انتظام سے ریاست کے اقتدار کو اندرون ملک کیونکر دو بارہ قائم کیا اور اپنے اثر و قوت کو بیرون ملک کیونکر وسعت دی - اِس کی کامیابیوں اور رسائیوں سے یہ ظاهر ہوتا ھے کہ وہ نہ صرف ایک بہت بڑا سیاست داں بلکہ ایک باجبروت اور لائق جنرل بھی تھا -

حیدر علی کا زمانۂ وفات سنہ ۱۷۸۲ع ھے اور یہی وہ زمانہ ھے جب انگریزوں اور مرهٹوں کے درمیان عهد نامہ بسین پر دستخط ہوئے جو مرهٹوں کے زوال کی قطعی علامت تھی - اس زمانہ میں دکھن کی تین هندوستانی حکومتیں جن کے لئے ایک مشترک دشمن جنگ کے لئے موجود تھا مقاصد اور قوتوں کے اتحاد کا جس سے اِن کی آزادی قائم رہ سکتی تھی اندازہ نہ کر سکیں - اِن کی باهمی لڑائیوں نے کمپنی کو یہ موقع دیدیا کہ وہ اِن کو شکست دیکر اِن کے مقبوضات کا اپنی سلطنت میں الحاق کر لے - یہ سب جو کچھہ ہوا وہ سر برآوردہ لوگوں کی خود غرضیوں ' اِن کے باهمی مناقشات اور غداریوں ' کے باعث ہوا - ٹیپو سلطان کو اِن لوگوں کی بدنیتی ' کا کفارہ بنا پڑا اور وہ کمپنی کی حکمت عملی اور اُس کی جنگی قوتوں کا اتنا شکار نہیں ہوا جتنا خود اپنے اُمرا اور وزرا کی چالاکیوں کا -

مرتب نے اِن حالات کی پوری تفصیل دی ھے اور ٹیپو سلطان کی شرافت طبع کو واضح کیا ھے ' جس نے باوجود ناپاک مقاصد میں گھرے

ہوئے ہوئے کے اپنی سلطنت کی عزت اور آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی -

کتاب کی دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک خاص اور قابل لحاظ خوبی یہ ہے کہ مرتب نے ٹیپو سلطان کی سیرت کے ایک بہت بڑے دھبہ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے - بعض جانبدار مورخین نے اُسے متعصب اور مجنون مسلمان کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی ہندو رعایا پر مظالم کیا کرتا تھا - مرتب نے یہ دکھایا ہے کہ یہ غلط ہے کیونکہ ٹیپو سلطان ایک منصف مزاج حکمراں تھا جو اپنی رعایا کے فلاح و بہبود کا فکرمند رہتا تھا -

کسی کتاب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ غلطیوں سے بالکل پاک ہے غیر ممکن ہے - اس میں بھی کچھ غلطیاں اور خامیاں موجود ہیں ' مثلاً تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور یہ خواہش کہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے معائب کو کم کر کے دکھلایا جائے صاف نمایاں ہے ' گو اس سے زائد متوازن فیصلہ تاریخ کو بہتر بنا سکتا تھا - لیکن باوجود ان خامیوں کے یہ کتاب اٹھارھویں صدی عیسوی کی دو مخصوص شخصیتوں کی شہرت کو قائم کرنے میں ایک قابل تحسین کوشش ہے -

تارا چند

" طریقہ تعلیم مطالعہ قدرت "—جناب جگ موہن لال چترویدی ' بی - اِس - سي - ' اِل - تی ' کی تصنیف ہے - اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ اجوکیشنل پرنٹر ' چارمینار ' حیدرآباد سے شایع ہوتی ہے - ملنے کا پتہ - منیجر ہندستانی بک‌ڈپو لٹوش روڈ چار باغ ' لکھنؤ -

مصنف نے زبان اردو میں اس قسم کی کتابوں کي کمی محسوس کرتے ہوے مدرسین مطالعہ قدرت کي رہبری کے لئے یہ کتاب تیار کی ہے - اور اس سلسلے میں جس تحقیق اور تلاش سے کام لیا ہے وہ حقیقت میں قابل ستائش ہے - کتاب مذکور تین فصلوں پر مشتمل ہے - فصل اول میں مطالعہ قدرت کے معنی ' اس کي ابتدا اور ارتقائی مدارج ' بچوں کی خصوصیات اور اس کے مقاصد تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے - دوسری فصل میں مطالعہ قدرت کے طریقۂ درس اور نصاب پر بحث کی گئی ہے - نقشوں اور تصویروں سے اشارات کا کام لیا ہے - تیسري فصل میں اُن جانوروں کی پرورش اور تعمیر مسکن کا طریقہ بتایا گیا ہے جو نصاب مطالعہ قدرت کے لئے کارآمد اور ضروری ہیں - کتاب مفید اور دلچسپ ہے -

---

" روح سیاست "—مولنہ نور الهي و محمد عمر—یہ ۱۰۳ صفحوں کي کتاب ہے جس میں امریکہ کے مشہور عالم پریذیڈنٹ ابرام لنکن کے پر عمل زندگی کے چند واقعات کو (کچھہ ردو بدل کے ساتھہ) ڈراما کی صورت میں پیش کیا گیا ہے - ہر باب کي ابتدا میں نظم کي زحمت گوارا کی گئی ہے جو پست اور بے کیف ہے - الفاظ اور محاورے کہیں کہیں غلط اور بے محل ہیں -

---

'' شاهد معنی ''—مرتبہ قاضی ظہیرالدین ظہیر بسوانی—ملنے کا پتہ - مصنف ماسٹر باسط بسوانی - بسواں ضلع سیتاپور (۲) اسکوٹ برادرس مسٹن روڈ ' دھلی -

'' شاھد معنی '' ماسٹر باسط بسوانی کے منظومات کا مجموعہ ھے - علاوہ تمہید انتساب کے شروع میں ایک مختصر سا مقدمہ ھے - نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ھیں (۱) حمد و نعت - دینیات - اخلاق ' مشاھدات فطرت اور حسن و عشق - جناب باسط کسی تعارف کے محتاج نہیں - آپ کا کلام ملک کے اکثر ادبی رسائل میں شائع ھوتا رھا ھے - اس مجموعہ میں جدید طرز کی نظمیں بھی شامل ھیں اور لطف یہ ھے کہ زمانے کی ھوا کے خلاف خاص مشرقی رنگ میں لکھی گئی ھیں - حضرت باسط کے محسوسات داخلی ان کے ماحول خارجی سے بہت کم ھم آھنگ ھوتے ھیں اس لئے ان کی نظموں کا بیشتر حصہ کیفیت شعری ' جدت بیان اور شاعرانہ الفاظ سے خالی ھے - کتاب میں بہت سی غلطیاں باقی رہ گئی ھیں -

---

'' فانوس خیال ''—مصنفۂ امین الدین احمد لوھارو—ملنے کا پتہ - مکتبہ جامعہ - قرول باغ ' دھلی - قیمت ۱۲ آنہ -

'' فانوس خیال '' ایک عاشقانہ ناول ھے جس کی تصویریں تہذیب مغرب کی شمع سے متحرک ھیں - اس افسانے میں واقعات کا تسلسل وقت اور عمل کا ساتھہ نہیں دیتا شاید اس لئے مصنف نے اسکو فانوس خیال سے موسوم کیا ھے - عبارت صاف ھے لیکن کہیں کہیں ایسا معلوم ھوتا ھے کہ انگریزی کا لفظی ترجمہ ھے -

" کانٹ "— پروفیسر اے - تی لنڈزے کی تصنیف ھے — جناب معتضد ولی الرحمان ' ام - اے ' نے انگریزی سے اردو میں اسکا ترجمہ کیا ھے - مشن پریس ' الہ آباد سے شائع ہوئی - ملنے کا پتہ - کتابستان ' الہ آباد - مترجم نے جس استقلال اور محنت پژوهی سے کام لیا ھے اسکی داد دینی مشکل ھے - کانٹ کے دقیق اور نازک فلسفہ کو سمجھنے کے لئے اس کتاب سے بہت بڑی امداد لی جاسکتی ھے - کانٹ کا انداز فکر بلند ھے وہ اشیا کی ماهیت دریافت کرنے سے پیشتر ان قوتوں اور صلاحیتوں کو معلوم کرنا چاهتا ھے جو همارے علم کا ذریعہ هیں - اصطلاحی الفاظ بہت کثرت سے استعمال ہوئے هیں جس کی وجہ سے اُن اصحاب کے لئے جو فلسفہ سے ناآشنا هیں دقت پیدا ہو گئی هیں - کتاب میں بہت سی غلطیاں باقی رہ گئی هیں -

---

" انوس برطانیہ "— علامہ سید نجم الدین احمد جعفری کی تصنیف ھے — ارمی پریس شملہ بہ اهتمام محمود مظفر منیجر طبع ہوتی ھے - مصنف نے هندستان کی سیاسی ضرورتوں کو محسوس کر کے اس کتاب کو تصنیف فرمایا ھے - کتاب حکومت برطانیہ کے آهنی اصولوں پر مشتمل ھے - زبان عام فہم ھے حتی الوسع قانونی پیچیدگیوں سے اجتناب کیا گیا ھے -

---

" موتی "— سید یوسف صاحب بخاری دهلوی نے متعدد عنوانوں پر دنیا کے مختلف زبانوں اور مختلف ملکوں کے حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کو اس میں جمع کر دیا ھے - نوجوان مصنف امام صاحب جامع مسجد دهلی کے صاحبزادہ هیں -

خاندانی خصائص کی بنا پر عربی و فارسی زبانوں سے بھی واقف ھیں اور انگریزی تعلیم یافتہ بھی ھیں اس اعتبار سے ان کو انگریزی اور عربی ذخیروں سے اقوال کے اخذ و جمع کرنے میں نسبتاً سہولت و آسانی تھی -

یہ کتاب ۱۴۴ صفحات کی ھے جس میں ابتدا میں ۳ صفحات کا تعارف نامہ ھے اختر انصاری کا لکھا ھوا - پھر ۲ صفحات میں راشدالخیری کا اور ۳ صفحات میں حسن نظامی کا لکھا ھوا تبصرہ ھے ان دونوں میں یوسف صاحب کا تعارف ھی ھے اور بس - البتہ خود مصنف کا مقدمہ جو صفحہ ۱۴ سے صفحہ ۳۱ تک ھے کچھہ مفید چیز ھے - جس میں مقولوں کا فلسفہ - ان کی حد و تعریف - ان کا آغاز - مقبولیت خصائص و لوازم وغیرہ کی بحثیں آگئی ھیں - پھر مختلف اقوام کے مقولوں کا موازنہ ھے اور ان کے خصائص بتائے ھیں اور چند مقولوں کی تشریح بھی نموتاً درج کردی ھے - اِس کے بعد صفحہ ۳۷ سے اصل کتاب شروع ھوتی ھے -

اقوال کے چند عنوانات یہ ھیں : اللہ تعالیٰ - تصوف - گناہ - آنکھہ - دوست دشمن - آفت - آرٹ - از دواج - سفر وغیرہ اقوال کا نمونہ ملاحظہ ھو :

آنکھہ : (۱) آنکھہ کو دیکھنے سے کبھی سیری نہیں ھوتی - (۲) اندھے در اصل وہ ھیں جو اپنی انجام و عاقبت سے غافل ھیں - (۳) اگر آنکھیں روشن ھوں تو ھر روز روز حشر ھے -

از دواج : (۱) خوبصورت لڑکی پیٹ ھی سے منسوبہ ھوکر پیدا ھوتی ھے - (۲) بیوہ عورت اس کشتی کے مانند ھے جس کا چپو نہو -

آرٹ : (۱) آرٹ سے حظ اندوز ھونا بذات خود آرٹ ھے - تحسین میں تخلیق کا عنصر شامل رھتا ھے - (۲) آرٹ کا مطالعہ آرٹسٹ کے نقطۂ

نظر سے کرنا چاہئے - (۳) آرٹ آرٹسٹ کی ملکیت نہیں ارباب ذوق کا مشترک سرمایہ ہے -

غرض کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں بالکل نئی چیز ہے - اسکولی کتابوں کی تقطیع ہے - قیمت ۱۲ آنہ - پتہ : سید محمد بخاری پبلشر گلی امام جامع مسجد دہلی -

---

نیرنگ خیال

ھندوستان کا مقبول تریں علمي اور ادبي
ماھوار مجلہ - دس سال سے برابر شائع
ھو رھا ھے - سال بھر میں قریباً
--- ایک ھزار (۱۰۰۰) صفحات ---
اور
کئي درجن رنگین تصاویر
--- شائع ھوتي ھیں ---

ملک کي کئی ھزار تعلیم یافتہ خواتین اسے پڑھتی ھیں - نیرنگ خیال کي اشاعت ھندوستان بھر کے تمام علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ ھے ھر ماہ تقریباً ایک لاکھ تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ میں رھتا ھے - نیرنگ خیال کي مقبولیت کا راز صرف یہ ھے کہ اس میں تمام بڑے بڑے اھل قلم مضامین لکھتے ھیں اور اس کا چندہ بے حد قلیل ھے -

چندہ سالانہ : تین روپئے چار آنے - سالانہ سمیت چار روپئے بارہ آنے - سالانہ دسمبر کے پرچے کے علاوہ بطور زائد خاص نمبر علحدہ شائع ھوتے ھیں ' جس کی جدا گانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ھوتي ھے -

نیرنگ خیال میں اشتہار دینا ھندوستان کي تمام متمول پبلک تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ ھے -

منیجر
نیرنگ خیال
شاھی محلہ ' لاھور -

اُردو

انجمن ترقی اُردو ' اورنگ آباد (دکن) کا خالص

ادبی سہ ماہی رسالہ

جو

جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

جس میں

ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے -

اُردو مطبوعات اور رسالوں پر تبصرے بھی کئے جاتے ہیں -

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی عبدالحق صاحب' بی - اے -
سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ '
حیدر آباد (دکن) -

سالانہ چندہ : سات روپئے - ایک نسخے کی قیمت ایک روپیہ ۱۲ آنے -

انجمن ترقی اُردو' اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - ستی روڈ ' الہ آباد -

سائینس

انجمن ترقی اُردو ، اورنگ آباد (دکن)

کا خالص

سائینس کا سہ ماھی رسالہ

جو

جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شائع ھوتا ھے

جس میں

سائینس کی جدید ترین ایجادات ،

انکشافات اور اختراعات پر بحث ھوتی ھے

زیر ادارت

جناب پروفیسر مولوی محمد نصیرالدین احمد عثمانی صاحب ،

ایم - اے ، بی ایس سی - معلم طبیعات ، کلیہ جامعہ عثمانیہ -

سالانہ چندہ : آٹھ روپیہ - ایک نسخہ کی قیمت دو روپیہ -

انجمن ترقی اُردو ، اورنگ آباد (دکن)

یا

کتابستان

۱۷ - سٹی روڈ ، الہ آباد سے

طلب کیجئے

سال نو کا غیر فانی

تحفہ

رسالہ "جہانگیر" لاہور کا

سالنامہ سنہ ۱۹۳۴ع

اپنی تمام دلاویزیوں کے ساتھہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکا ہے - اس میں تقریباً ہر موضوع پر ملک کے بلند پایہ ادباء اور سحر طراز شعرا نے اپنے شاہکار پیش کئے ہیں - بہترین آرٹ کی سہ رنگی و یکرنگی تصاویر اُس کی دلفریبیوں میں اضافہ کر رہی ہیں - صفحات تقریباً پونے دو سو صفحات اور قیمت فی پرچہ صرف ایک روپیہ -

لیکن

جو صاحب مبلغ تین روپے چھہ آنے سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر سال بھر کی خریداری منظور فرمائیں گے ان کی خدمت میں سالنامہ مذکور کے علاوہ اگست سنہ ۱۹۳۴ع میں شائع ہونے والا مہتمم بالشان نظام نمبر جو گذشتہ نظام نمبر سے ہر طرح بڑھہ چڑھہ کر ہوگا قیمتی ۲ روپیہ بلا قیمت پیش ہوگا -

عام پرچے ماہ بماہ پوری پابندی سے حاضر خدمت ہوتے رہیں گے -

نیاز مند

منیجر رسالہ جہانگیر ' ریلوے روڈ ' لاہور

کانپور

رسالہ

اُردو کا بہترین رسالہ

جو سنہ ۱۹۰۳ع سے اب تک برابر ہر روز ترقی کے ساتھہ جاری ہے -

ایڈیٹر — **منشی دیا نراین نگم - بی - اے -**

زمانہ بقول اخبار بھارت متر کلکتہ اُردو کے رسالوں میں چوٹی کا رسالہ ہے -

زمانہ نے ملک کے تمام مشہور تریں انشا پردازوں کی علمی امداد حاصل کر لی ہے -

زمانہ میں بہترین اُردو شاعروں کی بہترین نظمیں شایع ہوتی ہے -

زمانہ میں ہر مبحث پر اعلیٰ تریں مضامین درج ہوتے ہیں -

زمانہ میں مطبوعات جدید پر بے لوث تنقیدیں لکھی جاتی ہیں -

اودھ اخبار، لکھنؤ اُردو رسائل میں اپنے قابل قدر مضامین کے لحاظ کے زمانہ نے بہت ترقی کی ہے -

زمیندار، لاہور - زمانہ کے ساتھہ زمانہ بھی روز افزوں ترقی کر رہا ہے -

---

قیمت فی پرچہ ۸ آنے - سالانہ پانچ روپئے -

کسی ماہ کا پرچہ ملاحظہ فرماکر خریداری جاری فرمائیے -

کتابستان

ماہر کتابیات — ۱۷ - سٹی روڈ، الہ آباد

یا

زمانہ، زمانہ کانپور

۵۔۳۰ ۲۴۹۱۸

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس تعلیمی، مجلس انتظامی ...

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ ...

۳۔ طلباء ...

۴۔ ...

۵۔ ...

۶۔ ...

۷۔ ...

۸۔ ...